بانی
سہام مرزا

ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی

مدیرِ اعلیٰ ______ منزہ سہام
مدیر ______ زین شمسی
قانونی مشیر ______ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ______ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

نومبر 2016ء
جلد: 44 ☆ شمارہ: 11
قیمت: 60 روپے

خط و کتابت کا پتا
88-C II - فرسٹ فلور - خیابانِ
جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7 کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا امجد یاسر

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

ناولٹ

منی ناول

مکمل ناول

ناولٹ نمبر

ناولٹ

افسانے

دوشیزہ میگزین

ناولٹ

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی OB-7 تالپور روڈ، کراچی

Phone: 021-35893121 - 35893122

Email: pearlpublications@hotmail.com

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

بچھڑے دوست

وہ سب باتیں جو کبھی مزہ دیتی تھیں بور کرنے لگیں، دوستوں کی محفلیں بے ہنگم شور میں تبدیل ہوگئیں۔ خوبصورت لباس اور ہر ہفتے اچھے سے ریسٹورنٹ میں ڈنر کی چاہ صرف پیسے کا زیاں لگنے لگی۔ معمولات زندگی پورے کرتے ہوئے گاڑی کے سرد ماحول اور بند شیشوں سے باہر میری نگاہیں پتہ نہیں کیا تلاشتی رہتی تھیں۔ لمحوں میں زمین سے آسمان کی وسعتوں کو چھو کر جیسے ناکام و نامراد لوٹ آتی تھیں۔ میں اپنی اس کیفیت سے خود ناواقف تھی کہ میں کیوں ایسا محسوس کرتی ہوں۔ کس کی جستجو ہے جو مجھے بے چین رکھتی ہے۔ جس شہر میں پلی بڑھی وہ اب انجان انجان سا کیوں لگتا ہے۔ چوڑی ہوتی ہوئی سڑکیں، بلند ہوتی ہوئی عمارتیں، فرش پر بچھے اور سر پر تنے پل...... جیسے سب کچھ بدلتے چلے گئے۔ قدِ آدم بورڈز اور ان پر سجی دل لبھاتی رنگینیاں بھی مرعوب نہیں کر رہی تھیں۔ پھر ایک دن تمام اشتہاری بورڈز عدالت کے حکم پر ہٹا دیے گئے اور اچانک بالکل اچانک میری نگاہوں نے اُس بوڑھے نیم کے درخت کو پہچان لیا جس کی چھاؤں میں اسکول کے بستے رکھ کر ہم کھیلنے جاتے تھے۔ دل مچل اٹھا کہ ابھی گاڑی رکواؤں اور جا کر اُس تنے پر پیار سے ہاتھ پھیروں۔ مجھے یقین ہے اس کے سائے میں بیٹھ کر بے ہنگم رش کو دیکھنا بھی برا نہیں لگے گا۔ موسم کی شدتیں بھی مزاج میں تندی پیدا کرنے میں ناکام رہیں گی۔ اب میں بہت خوش ہوں اور پرانے درخت ڈھونڈنے کے کھیل کو بہت انجوائے کر رہی ہوں، جب کسی پرانے درخت پر نظر پڑتی ہے تو جیسے وقت تھم سا جاتا ہے۔ بیتے خوبصورت دن آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی اپنا بچھڑا ہوا دوست مل گیا۔

منزہ سہام

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

منزہ علی

دل بہت اُداس ہے' بہت سمجھایا، بہت منایا مگر سب بے سود...... خزاں کا موسم آنے سے قبل ہی آنکھوں میں خزاں اتر آئی...... کوئٹہ سانحے نے ایک بار پھر ہلا کر رکھ دیا...... اب تو کوئٹہ کا نام آتے ہی انجانے سے خوف دل ودماغ پر مسلط ہوجاتے ہیں۔ ساری دعائیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ جوان لاشے دیکھ کر ماؤں کا تو دل پھٹ گیا ہوگا...... کس کس کو روئیں...... اور آخر کب تک روئیں۔ کوئی یہ بتانے والا نہیں...... کوئی جواب دہ نہیں، کوئی ذمہ دار نہیں...... دکھوں کی یہ سیاہ رات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ ہم سب پر اپنا رحم فرمائے...... اپنے پہلے خط کی طرف بڑھتے ہیں۔

⋈: دریائے راوی کی جانب سے چلنے والی معطر ہواؤں کے دوش پر اڑتا یہ خط بھیجا ہے زمر نعیم نے، لکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی اور ادارے کے تمام اراکین ووابستگین کی خیریت وعافیت کے لیے ہمیشہ دعاگو رہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین۔ منزہ جی! دل تو چاہتا ہے کہ ہر ماہ دوشیزہ کی پُر رونق اور خوبصورت محفل میں شریک رہوں مگر کیا کروں، دل کی چاہت ارادوں کی کمزوری کے سامنے بے بس ومجبور ہوجاتی ہے۔ کبھی مصروفیات زندگی گھیر لیتی ہے اور کبھی طبیعت کی ناسازی ضبط آزمانے لگتی ہے۔ گزشتہ ماہ سے میری طبیعت بھی اچھی نہیں تھی۔ تھائی رائیڈ کے شدید حملے سے خون کی کمی اچانک واقع ہوجاتی ہے۔ بس پھر زندگی اپنی ڈگری پر ٹھہر جاتی ہے۔ سمٹ جاتی ہے یہ سلسلہ بہر حال پھر سے رواں دواں ہونے کی امنگ نہیں مٹا سکتا۔ اللہ کا فضل وکرم اور آپ سب کی محبتیں مجھے آگے بڑھنے اور محبتیں سمیٹنے کی طرف کھینچ رہی لاتی ہیں۔ الحمدللہ...... اب ذرا بات ہوجائے اکتوبر کے شمارے کی، کافی عرصے بعد فیئر اینڈ لولی کے مصنوعی نکھار کے بجائے سانولی سلونی سی زندگی سے بھرپور دوشیزہ کا عکس بہت اچھا لگا۔ آپ کے اداریہ کی تو بات ہی کیا ہے۔ اتنے مختصر مگر جامع انداز میں آپ نے زندگی جینے کا ہنر سکھادیا۔ ایک رخ وطن عزیز سے ہر حال میں محبت کا بھی نظر آتا ہے۔ ہر محب وطن آپ کی طرح اپنے وطن کے مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔ اللہ سبھی کو عقل سلیم عطا کرے آمین۔ محفل دوشیزہ کی رونق دوبالا کرنے آخر غزالہ رشید آ ہی گئیں۔ بہت اچھا لگا باقی گمشدہ سکھی سہیلیاں بھی محفلیں آباد کرنے

لوٹ آئیں تو سوچیں کیا عالم ہوگا نئے ساتھیوں کو دل سے خوش آمدید ہے۔ اُن کی تحریریں اور تبصرے ہم سبھی کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس بار رضوانہ آپی (کوثر) کا بھرپور تبصرہ دل شاد کر گیا۔ یقین کریں اُن کے لفظ میرے لیے کسی سند یا ایوارڈ سے کم نہیں ہیں۔ میں تو ابھی طفل مکتب ہوں۔ مجھ پر اتنا یقین دل لرز سا گیا اور آنکھیں نم اب بھی ہیں۔ رضوانہ آپی میں اس درجہ توقعات کی اہل تو نہیں ہوں۔ یہ تو آپ سبھی کی محبتیں ہیں حسن نظر ہے جو مجھے اس مقام پر رکھے ہوئے ہیں ورنہ میں کیا؟ میری اوقات کیا؟ اللہ آپ کو سکون، صحت اور سلامتی عطا کرے آمین۔ خولہ عرفان کا بھی شکریہ کہ انہیں میرا ناول پسند آ رہا ہے۔ دعا کیجیے کہ میں آپ سبھی کی امیدوں پر پورا اتر سکوں۔ انٹرویو دونوں ہی دلچسپ تھے اور لائف بوائے سے وابستہ سلسلہ اور کہانیاں بھی اچھی جا رہی ہیں۔ دام دل ناول کی یہ قسط بھی زبردست اور دلچسپ رہی۔ رفعت سراج کے اندازِ تحریر کے لیے تعریف کے لفظ بے معنی سے محسوس ہوتے ہیں۔ سنبل کا نام ہی بہترین تحریر کا ضامن ہے۔ بیٹیوں کے احساسات وجذبات کو سنبل نے بہت سچائی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے افسانوں میں سبھی افسانے اچھے ہیں۔ خصوصاً فرح انیس کا آگہی، اور آسیہ مظہر چوہدری کا کرچیاں قابل ذکر ہیں۔ دردانہ کا رنگ تو ہمیشہ سے پختہ اور گہرا اثر رکھتا ہے۔ نسرین اختر نینا کے سپنے سہانے کی قسط بھی اچھی رہی۔ دوشیزہ کے تمام سلسلے پڑھتی ضرور ہوں شاعری والا حصہ بڑھا دیں تو اچھا ہوگا۔ گزشتہ ماہ کی ایوارڈ ونر نفیسہ سعید کو ایوارڈ مبارک ہو۔ بیگم محمود کے انتقال کی خبر پر دل رنجیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے آمین ثم آمین۔

✉: سوئٹ سی زمر اللہ آپ کو مکمل شفا عطا فرمائے یہ کیا روگ لگا لیے ابھی تو ہنسنے کھیلنے کے دن تھے...... اپنی ساری تکلیفوں کو لفافے میں بند کر کے مجھے ارسال کریں میں ان کو سمندر برد کر دوں گی بس پھر راوی چین ہی چین لکھے گا۔ زمر ذاتی طور پر مجھے آپ کی تحریر بہت پسند ہے اور انتظار کرتی ہوں کہ اگلی قسطیں پڑھ ڈالوں مزہ آتا ہے اللہ آپ کے قلم کو اور طاقت عطا فرمائے...... غزالہ کو پکڑ کر لے ہی آتی ہوں مگر پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ ادارہ یہ پسند کرنے کا شکریہ مصنفین تک آپ کی تعریف یقیناً پہنچ گئی ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉: کراچی سے تشریف لائی ہیں، سکینہ فرخ لکھتی ہیں۔ ماہ اکتوبر کا دوشیزہ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ سرورق پر دوشیزہ براجمان تھی یہ تبدیلی خوش آئند ہے۔ خواب اور امید دل کو لگنے والا اداریہ تھا۔ حقیقت کی ہر اذیت کا مرہم امید کے سوا اور ہے بھی کیا، دوشیزہ کی محفل خوب رنگ جمائے ہوئے ملی۔ ماشاء اللہ رونق لگی ہوئی تھی۔ ناول، ناولٹ اور افسانے اچھے تھے مگر نگہت کی تحریر اَن کہا دکھ بہت خوبصورت تھی ایک عورت کے لیے اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کیا ہو سکتی ہے مگر کیا کیا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ کہیں......

اے مری عمر رواں اور ذرا آہستہ

لیکن جناب یہ کہاں ممکن ہے رنگ کائنات میں ایک کہانی بہت پرانی ڈاکٹر صاحب کی خوبصورت تحریر تھی۔ باتوں باتوں میں بڑی بات کہہ گئے۔ پیاری منزہ کہانیاں ڈھونڈنا، اُن کو احاطہ تحریر میں لانا اور پھر اُن تحریروں کو یکجا کر کے پیش کرنا سب اپنی جگہ ایک فن ہے۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے انداز بھی

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

اکتوبر 2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

آپ کی نظر میں اس ماہ "دوشیزہ" کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ

نومبر 2016

عنوان: ____________________

قلم کار: ____________________

نام: ____________________

پتا: ____________________

اسی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ میں یہ بات اکثر کہتی ہوں کہ ہماری نسل خوش نصیب ہے جس نے اپنے عہد میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھیں ہیں ہمارا بچپن تاروں، جگنوؤں' پریوں کی کہانیوں اور دیسی قسم کے کھیلوں سے سجا ہوا تھا تو ہماری جوانی (فی الحال میں اس دور کو جوانی ہی کا نام دوں گی) ٹیکنالوجی کے حیرت انگیز کرشموں سے مستفید ہوتے ہوئے گزر رہی ہے اور میں توقع کروں گی کہ بڑھاپا بھی کچھ حیرت کدوں سے ضرور گزرے گا۔ تو کہنا بس یہی ہے کہ کوئی جدت ہونی چاہیے کوئی تبدیلی، کوئی نیا پن دوشیزہ کی دوشیزگی کو اور خوبصورت ضرور بنائے گا۔ ہماری پیاری مصنفات اور قاری بہنوں بھائیوں سے اچھے اچھے مفید مشورے لے کر دوشیزہ کے سولہ سنگھار میں سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں سنگھار کی گنجائش نکالنے میں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

ﷺ: بہت ہی اچھی سکینہ! تمہارا خط پڑھ کر دل خوش ہو گیا ہر سطر چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ یہ ایک حساس دل رکھنے والی مصنفہ کے خیالات ہیں خیالات کو خوبصورت الفاظ کا لباس پہنانا ایک رائٹر ہی کر سکتا ہے ادارہ یہ پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ نگہت نے تو تقریباً سب خواتین کے دکھ کو چھیڑ دیا ہے۔ آپ نے درست کہا ہم لوگ بہت اچھے دور سے بہت تیز دور میں آ گئے مجھے تو تبدیلیاں دیکھ کر کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن چاند پر گزارا تھا۔ لباس' انداز سب انجانے انجانے سے لگتے ہیں خیر یہ بھی حقیقت ہے اور حقیقت سے انحراف برتنا ذرا مشکل ہوتا ہے حالانکہ اُسے قبول کرنا اس سے بھی زیادہ اعصاب شکن ہے۔ ڈیئر بالکل آپ لوگوں کے مشورے ہمیشہ چاہئیں ہم سب مل کر ہی دوشیزہ کو مزید سنوار سکتے ہیں۔

✉: کراچی سے طویل غیر حاضری کے بعد تشریف لائی ہیں روحیلہ خان، لکھتی ہیں۔ سدا خوش رہیں۔ آپ سے فون پر بات ہوئی بہت اچھا لگا سوچا خط خالی خولی اچھا نہیں لگتا اس لیے 'سہیلی' فٹافٹ لکھ ڈالا ویسے یہ آپ کی محبت ہے ورنہ اس قدر کی ایمرجنسی اکتوبر کا دوشیزہ کچھ دیر سے ملا لیکن خدا کا شکر ہے کہ مل گیا۔ شکریہ آپ کا...... جلدی جلدی میں دیکھا تو پہلے تو میں خطوط فوری طور پر پڑھتی ہوں چاہے سرسری ہی...... اس کے بعد انٹرویوز' دیپک پروانی کو دیکھ کر اچھا لگا۔ بہت سالوں پیچھے چلی گئی۔ جب میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ٹین ایج کا زمانہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ منہ پھٹ تو نہیں البتہ بولڈ پہلے بھی تھی اور اب بھی ہوں...... دیپک بڑے اعتماد سے اپنی تخلیقات دکھا رہے تھے اور میں...... بہرحال مزے کی ملاقات تھی وہ اس کے بعد نے بزم طلباء میں اس پر ایک خاکہ بھی لکھا تھا وہ ابھی تک سنگل ہیں شاید اس لیے کہ دیپک اندر سے بہت مشرقی ہے اور جس ماحول میں رہتے ہیں وہ...... نیلم کا انٹرویو اچھا تھا براہ کرم انٹرویو ذرا تفصیل سے نہ سہی لیکن پھر بھی کچھ رہ جاتا ہے لیکن کوشش اچھی ہے مونی کی...... پہلے جب آپ کی محفل میں حاضر ہوئی تھی تو کچھ ناراضی تو نہیں البتہ ارادہ نہ تھا کہ کیا فائدہ تبصرہ لکھنے کا...... ترک کر چکی تھی لیکن اس کے فوراً بعد ہی لکھنا پڑا...... پہلے انکار کر چکی تھی لیکن دوسری بار سوچا کہ یہ ناشکری ہے اور میں کون سی بہت بڑی رائٹر ہوں شکر ہے خدا کا کہ لوگ پہچان لیتے ہیں، پوچھ لیتے ہیں۔ 'دسیلن' جب چھپے گا تو میں خود ڈھیر سارے خطوط لکھوں گی کہ ریئلی زبردست ہے...... بیسٹ ہے...... واہ واہ روحیلہ

خان کیا ٹاپ کی لکھاری ہیں تا کہ اس طرح کچھ تو کشش پیدا ہو...... ویسے شکریہ ان سب اچھے قارئین کا جو پڑھ لیتے ہیں اور ایوارڈ کے مستحق بھی قرار دلا دیتے ہیں۔ میں ذرا پیچھے رہ جاتی ہوں کیوں...... سوچوں گی...... نگہت اعظمٰی کا ان کہا دکھ اچھا لگا۔ اس میں حقیقت ہے سنبل کو دیکھ کر مزہ آیا دبلی پتلی سوئٹ سی سنبل اب کیسی ہے۔ اور ڈاکٹر اقبال ہاشانی مجھے ابھی تک یاد ہیں زمر کا نام لکھتے سیالکوٹ کی زمر یاد آ گئی۔ جو مجھے ملی تھی زمر کی کاوش اچھی ہے۔ وہ تو ویسے ہی زبردست لکھتی ہیں۔ نسرین صاحبہ کا 'سپنے سہانے' پورا نہ پڑھ پائی کیونکہ وقت کم مقابلہ سخت...... بہر حال تمام لکھنے والوں اور آپ سب کے لیے بہت پیار اور دعائیں...... نام بہت سے باقی ہیں لیکن کام ہیں کہ نمٹنے ہی نہیں آتے۔ بہر حال شکریہ آپ کا کہ بہت چاہتیں دیں آپ سب جیسے سوئٹ اچھے لوگ دیے۔

✿: سوئٹ سی روحیلہ! محفل میں تمہارا خط پا کر بہت اچھا لگا۔ ماضی کی خوبصورت یادیں تازہ ہو گئیں۔ صحیح کہا تم نے یہ فرصت ہے ہی بڑی ظالم شے جب ہم اسے چاہتے ہیں تو ملتی نہیں اور جب اسی فرصت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو پنجے گاڑھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ تمہاری یہ لائن بہت اچھی لگی 'خالی خولی خط' میں تو خالی خولی افسانوں کو بھی الٹ پلٹ کر ضرور دیکھتی ہوں کہ شاید اس میں سے خط نکلے مگر......

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھے تو......

روحیلہ وقت نکالا کرو اور محفل میں ضرور شرکت کیا کرو ہو سکتا ہے تمہاری دیکھا دیکھی بہت سارے بچھڑے پرندے لوٹ آئیں۔

✉: ساہیوال سے تشریف لائی ہیں عائشہ شفقت، لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ سہام، السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ دوشیزہ کے لیے ایک افسانہ اور چند نظمیں ارسال کر رہی ہوں۔ اگر معیاری ہوں تو دوشیزہ میں شائع ہونے کا اعزاز بخش دیں۔ افسانہ دیر سے اس لیے ارسال کیا کہ مما نے بھی افسانہ شروع کیا ہوا تھا۔ خیال تھا کہ دونوں اکٹھے ہی بھیج دیں گے مگر پاپا عید کی چھٹیوں میں ساہیوال آئے اور مما کہیں رکھ کر بھول گئیں۔ مجھے کہنے لگیں کہ تم تو بھیجو، میرا افسانہ مکمل ہو گا تو میں بھی بھیج دوں گی۔ سو میں جلدی اپنا افسانہ بھیج رہی ہوں۔ مما تو کہہ رہی تھیں کہ رسالہ پڑھ کر تبصرہ بھی بھیجو۔ مگر مجھے ابھی تبصرہ کرنا نہیں آتا۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ سب کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ اور مستقل سلسلے تو بہت ہی مزے کے ہوتے ہیں۔ مجھے تو خط لکھنا بھی نہیں آتا۔ مما کہتی ہیں کہ آج کی نسل خط لکھنا کیا جانے...... اب ہم کیا کریں کہ آج کی نسل کو میڈیا نے بہت ہی سہل پسند بنا دیا ہے۔ اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے نا...... اور کوئی بات سمجھ ہی نہیں آ رہی ہے۔ اب جب مما اپنا افسانہ بھیجیں گی تو میں بھی انشاء اللہ اپنا دوسرا افسانہ بھیج دوں گی۔

✿: چھوٹی سی لڑکی اور بڑے بڑے کام بھئی افسانہ لکھنا کوئی معمولی کام نہیں، مما کو بتا دو کہ میں آپ کے نقشِ قدم پر ہوں۔ لہٰذا مجھے تنقید کا نشانہ نہ بنائیں۔ تمہارا افسانہ مل گیا ہے اور مما کا بھی ڈھونڈ کر بھیج دو اور افسانہ ڈھونے پر ان سے میری طرف سے انعام لینا مت بھولنا۔ محفل میں آتی رہا کرو اچھا لگتا ہے۔

✉: گجرات سے تشریف لائی ہیں عائشہ نور عاشا، لکھتی ہیں منزہ سہام صاحبہ آپ کا ماہنامہ دوشیزہ کسی تعارف کا محتاج نہیں جس قدر بھی تعریفی کلمات نچھاور کیے جائیں تشنگی باقی رہے گی تمام سلسلے اپنی مثال

آپ ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنی دو ادبی کاوشیں آپ کو بذریعہ ڈاک ارسال کی تھیں۔ اُن کی اشاعتی صف میں شامل ہونا میرے لیے باعث خوشی ہوگا ان کی بابت دریافت کرنا خط کا نصب العین ہے برائے مہربانی اگر میری کاوشیں قابلِ اشاعت ہیں تو مجھے مطلع کیجیے تاکہ میرے قلم کی منجمد ہوتی سیاہی میں امنگ کی ایک نئی کرن جاگ اٹھے۔

ﷺ: اچھی سی عائشہ! دوشیزہ پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی ایک تحریر اسی شمارے میں موجود ہے۔ لہٰذا قلم کو منجمد ہونے مت دیجیے اور فٹافٹ زبردست سی تحریر مجھے ارسال کر دیجیے، اگلے ماہ میں آپ کے تبصرے کا انتظار کروں گی۔

✉: کراچی سے آمد ہوئی ہے نٹ کھٹ سی ماریہ یاسر کی، لکھتی ہیں پیاری منزہ آپی امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے اکتوبر کا شمارہ آٹھ تاریخ کو ملا، کافی مہینوں بعد ٹائٹل پر ماڈل اپنی جانب ہی متوجہ نظر آئی ورنہ تو سرورق پر فیئر اینڈ لولی کا قبضہ رہتا تھا۔ خیر اس بار سرورق اچھا رہا۔ ماڈل کیوٹ اور معصوم سی لگی، شاید یہ بھی فیئر اینڈ لولی استعمال کرتی ہے اس لیے...... (ہی ہی ہی) آپی آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح کمال کا تھا۔ اداریہ پڑھنے کے بعد میں نے دوڑ لگا دی محفل کی جانب کیونکہ یہی تو پورے رسالے کی جان ہے اور اس میں ہماری جان ہے۔ اپنا خط پا کے خوشی ہوئی اور اُس خوشی کی انتہا تب ہوئی جب آپ کا پیار بھرا جواب پڑھا۔ سچ میں آپ اتنے پیار اور اپنائیت سے جواب دیتی ہیں کہ بندہ خوامخواہ ہی پھولے نہیں سماتا۔ اس کے بعد نیلم منیر اور دیپک پروائی سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے آگے بڑھی تو سنبل کی تحریر نے ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ کافی مہینوں بعد سنبل آئیں اور آتے ہی چھا گئیں ٹھاہ کر کے...... زمر نعیم اپنے ناول کو کمال خوبصورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ رفعت آپی کے تو کیا ہی کہنے زبردست...... نئے لہجے نئی آوازیں میں اپنی غزل سب سے کمال کی لگی پڑھ کر مزہ ہی آ گیا۔ (ہی ہی ہی) یہ تو خیر مذاق کیا ہے۔ سب کی شاعری بہت اچھی تھی لیکن فریدہ فری کی سب سے اچھی لگی۔ ابھی تک بس یہی پڑھ پائی ہوں، اس لیے باقی پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں لیکن پورا یقین ہے کہ باقی رسالہ بھی خوب جاندار اور شاندار ہوگا۔ اچھا آپی میں اِس خط کے ساتھ دوشیزہ کے لیے 2 افسانے 'بچے ہمارے عہد کے چالاک' اور 'جنت بی بی' بھیج رہی ہوں اور سچی کہانیاں کے لیے ایک افسانہ 'زندگی کے غم' بھیج رہی ہوں۔ نومبر کے شمارے میں ضرور بتایئے گا کہ میرے تینوں افسانے کیسے لگے۔ ساتھ شاعری بھی ہے امید جلد شائع کریں گی۔

ﷺ: ڈیئر ماریہ! تمہارا خود سے ہی سوال آنا اور پھر خود ہی جواب دے کر بریکٹ میں 'ہی ہی ہی' لکھنا مجھے بہت دیر تک ہنساتا ہے شاید اپنا لڑکپن یاد آ جاتا ہے۔ بے فکری کا حسین دور جب چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت بڑی بڑی لگتی ہیں اور بڑے بڑے دکھ بہت چھوٹے...... اللہ تمہیں اس طرح خوش رکھے ہمیشہ اپنے پیاروں کے سنگ رہو...... کہانی اور شاعری کاشی چوہان کے حوالے کر دی ہے دیکھو کیا انجام ہوتا ہے...... افسانے ابھی پڑھے نہیں جلد مطلع کروں گی۔

✉: عروس البلاد سے تشریف لائی ہیں خولہ عرفان، لکھتی ہیں۔ نیک امیدوں اور پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ پھر پھر...... حاضرِ محفل ہوں، اس دفعہ سوچ رہی تھی کہ محفل میں اپنی غیر حاضری لگوالوں۔ مزاج میں پتا

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

"بس تھوڑا سا انتظار......"

نہیں کیوں مزہ نہیں تھا۔ عجب اُداس مضمحل طبیعت ہو رہی تھی۔ شاید تغیر موسم کے اثرات تھے یا کام کی زیادتی تھی۔ رسالہ تو دس تاریخ کو ہی ہاتھوں کو رونق بخش چکا تھا اس لیے اطمینان سے سارے افسانوں اور ناولوں سے انصاف کیا اور جب آپ کا اداریہ زیرِ مطالعہ آیا تو ایسا محسوس ہوا شاید مجھے ہی لکھا ہے۔ امیدوں کو نیا ایدھن اور اداسیوں کو خوش ہونے کا جیسے نسخہ مل گیا۔ حسبِ معمول آپ کا خوبصورت جواب بھی دل کو طمانیت عطا کر گیا تو اٹھالیا قلم اور دل نے کہا لگ جا نیچے اپنے پر...... اور منزہ آپ جو میری حاضری سے متاثر ہیں اس میں میرا کوئی کمال نہیں جب آپ جیسے مدیر ہوں تو وقت خود ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہمیں بھی منزہ سے ہمکلام ہونا ہے۔ باقی جب تک حکمِ ربی ہے ہماری حاضری محفل میں لگتی رہے گی۔ اب تبصرہ کی طرف آتی ہوں رضوانہ کوثر جیسے مبصرین کو میرا سلام کہ وہ اتنی محبت سے خطوط کا مطالعہ کرتی ہیں شاید نورِ بصیرت انہیں لوگوں کو عطا کرتا ہے رب...... اس دفعہ ٹائٹل پیج پر فیئر اینڈ لولی کے اشتہار کی جگہ اس کے اثرات سے متاثر خوبصورت دوشیزہ کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اب کی دفعہ کے افسانے اور ناولوں نے بھی دل جیت لیا۔ منزہ جبیبہ عمر کا اعتبار کرنے...... دردانہ نوشین خان کا خوش رنگ ہوا...... مریم سمیہ کا یہ شام سے...... اور سید عبادت کاظمی کا گگن کے پار اسلوبِ نگارش اور موضوع کے اعتبار سے بہترین تھے دل کو چھو لینے والے بہت بہت بہت...... عمدہ ویسے بھی محبت کا ہر رنگ حسین اور دلکش ہوتا ہے۔ شانی خان کا کڑی دھوپ اور نگہت اعظمیٰ کا آن کہا دکھ خوبصورت کہانی کی گود سے جنم لیتے انسانی احساسات کی موثر ترجمانی کے ساتھ بہت پیارے افسانے لگے۔ فرح انیس کا آگہی اور آسیہ مظہر چوہدری کا کرچیاں بھی معاشرتی مسائل کو اجاگر کرتے اچھے سبق آموز افسانے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان تمام افسانوں میں جملوں میں تسلسل اور ربط تھا۔ ذہن بغیر کہیں اُلجھے سارے لفظوں کو اپنے اندر ایسا سموتا گیا جیسے وہ پہلے سے اپنی جگہ بنائے ہوئے تھے۔ بہت مزہ آیا مزہ واقعی، سنبل نے اپنے ناول آنگن کی چڑیاں میں ہمیشہ کی طرح مختلف اندازِ بیان اور خوبصورت کہانی کے پس منظر میں ہمارے معاشرے کے سب سے حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور موثر الفاظ و بیاں سے جذبات کی بھرپور عکاسی کی لیکن...... کاش وہ انسان مجھے مل جائے جس نے یہ لفظ باقی آئندہ سب سے پہلا لکھا میں اُن کو ایک کی جگہ دو دفعہ سلام کروں گی۔ ایک دفعہ تکلیف میں مبتلا کرنے کے لیے دوسری دفعہ اس تکلیف سے لطف اندوز ہونے کے لیے کہ انتظار کی لذت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ویسے بھی رفعت سراج صاحبہ دامِ دل میں اور زمرا بھی امکان باقی ہے میں ہر ماہ ہی اس لذت سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتی رہتی ہیں لیکن یہ کام غلط ہے منزہ یہ ساری مصنفین تو بہت معصوم اور پیاری ہیں۔ آپ کی طرح اور آپ بھی منزہ جی باقی آئندہ تو دوشیزہ لکھتا ہے مل گیا نا سراغ، ہاہاہا...... میری بات سمجھ گئی ہوں گی آپ یقیناً ضرور مسکرائیں گی۔ جزاک اللہ...... مجھے یقین ہے کہ آپ اور باقی مصنفین سے کبھی بھی بالمشافہ ملاقات ہوئی تو شاید مارے خوشی کے میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گی لیکن دعا ہے کہ جب بھی ملوں تو آپ لوگوں کو وہ محبت و احترام دے سکوں جو میرے دل میں آپ لوگوں کے لیے ہے اور جس کے آپ لوگ واقعی حقدار ہیں آمین۔ ارے ڈاکٹر صاحب رہ گئے ایک کہانی بہت پرانی ہمیشہ کی طرح منفرد اندازِ بیاں اور خوبصورت جملوں سے مزین دل میں گھر کر گئی۔ بس ایک جملہ دل میں کھٹک رہا ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ عبادت اور ریاضت کے پردے میں ابوالہواسی چھپی ہوتی ہے۔ بصد احترام ڈاکٹر صاحب میں

پراسرار کہانی نمبر 3

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 اور پراسرار نمبر 2 کے بعد پراسرار نمبر 3

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ دسمبر کا شمارہ، پراسرار نمبر 3 ہوگا۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرما لیں۔

صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کررہی ہوں کہ عبادت اور ریاضت بندے اور اللہ کا معاملہ ہے۔ انسان کی بدکرداری کواس سے مربوط نہ کریں ورنہ ایسے جملوں سے لوگوں کے دلوں میں اپنے دین سے بدگمانی پیدا ہوگی۔ دنیا بہت سے سچے عابدوں اور زاہدوں ہی کی وجہ سے چل رہی ہے کہ اللہ کا فرمان ہے کہ کمی بیشی اللہ معاف کرے ''میں کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کروں گا اس وقت تک کہ جب تک اُس میں ایک بھی استغفار کرنے والا موجود ہوگا'' ورنہ اس وقت جس زبوں حالی کا معاشرہ شکار ہے وہ ہماری تباہی کے لیے کافی ہے۔ سوری منزہ کوشش کرتی ہوں کہ خط مختصر ہوجائے لیکن ایک چھوٹے افسانے کی برابر جگہ لے ہی لیتا ہے اور آپ کی محبت کہ آپ ایک ایک لفظ آگے پیچھے کیے بنا بے کم وکاست شائع کردیتی ہیں۔ حسبِ عادت ایک غزل کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔

☜: پیاری سی خولہ! مجھے یقین ہے کہ تم جیسے باادب لوگ ہمیشہ دوسروں کو وہ احترام اور محبت دیتے ہوں گے جس کے وہ حقدار ہوں ہمیشہ کی طرح مفصل خط لکھنے کا شکریہ تمہارا شکوہ ڈاکٹر اقبال ہاشمانی صاحب تک پہنچ گیا ہوگا۔ خولہ میرا ماننا ہے انسان کو وہ کام ضرور کرنا چاہیے جو اُسے خوشی دیتا ہو اور وہ کام تو ہر صورت میں کرنا چاہیے جو دوسروں کو خوشی دیتا ہو تو جناب اسی طرح اپنے قلم کا جادو جگاتی رہو۔ دوسروں کو خوشیاں دینا بھی عین عبادت ہے۔

✉: ملتان سے تشریف لائی ہیں فصیحہ آصف خان، لکھتی ہیں۔ امید ہے مزاج اچھے اور خوشگوار ہوں گے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عافیت میں ہوں پچھلے ماہ بے حد مصروفیت کے سبب شاملِ بزم نہ ہوسکی۔ جس کا افسوس رہا، پھر دوشیزہ بہت دیر سے ملا تھا۔ سو مطالعہ نہ کرسکی۔ یوں تبصرہ بھی نہ ہوسکا۔ اس ماہ یعنی نواکتوبر کو ملا سو جلدی جلدی پڑھا۔ ویسے بھی میرے پڑھنے کی رفتار خاصی تیز ہے۔ یوں تبصرہ لکھنے کے لائق ہوسکی۔ محرم الحرام کے احترام میں سادہ وسیاہ سرورق ٹھیک لگا۔ خواب اور امید پر آپ کا بھرپور اداریہ بوسیدہ ذہنوں میں تازہ اثرات چھوڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی گہرائی سے اِس کا مطالعہ کرے۔ دوشیزہ کی مسکراتی محفل میں سبھی چہرے بارونق و مسکراتے دکھائی دیے۔ سینئر رائٹرز کے تجربات ومشاہدات ہمارے لیے قابلِ تحسین ہیں۔ غزالہ رشید صاحبہ کا خط اچھا لگا۔ سکینہ فرخ میری پسندیدہ مصنفات میں شامل ہیں۔ اُن کی اثر انگیز باتیں دل میں اتر گئیں۔ سعدیہ سیٹھی کو بھی کافی عرصہ سے جانتی ہوں۔ وہ وطن کی محبت میں سرشار دکھائی دیتی ہیں۔ ڈیئر خولہ عرفان آپ کا جامع تبصرہ خطوط کی محفل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے میرے بارے میں جن خلوص بھرے الفاظ کا تذکرہ کیا۔ وہ آپ کی محبت ہے آپ سے بات کرنے کو جی کرتا ہے کوئی راہ نکالیں۔ مقتل پر ایوارڈ کا انتظار مجھے بھی تھا۔ مگر کیا کہتی اب...... حبیبہ عمیر اور ماریہ یاسر کی آمد بھی بہار کے جھونکے کی مانند رہی۔ آپی رضوانہ کوثر نے بھی تفصیلی تبصرہ لکھ کر کمال کردیا۔ اُن کی محبتوں پر شکرگزار ہوں۔ اللہ اُن کو کلی صحت عطا فرمائے آمین۔ فریدہ جاوید فری، نسیم نیازی اور شگفتہ شفیق کی کمی محسوس ہوئی۔ اس بار اسماء اعوان نے میرا نام شامل کرکے مجھے خوشی سے نوازا۔ دامِ دل کی قسط دل میں اتر گئی۔ ثمر نے جس جلد بازی کا مظاہرہ کیا اب اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ جس ساس کی وجہ سے چمن بے دخل ہوئی اب اسی ساس کی بدولت وہ شاہانہ انداز میں گھر پر راج کرے گی۔ کاش وہ ثمر کے دل پر راجدھانی قائم کرسکے۔ خوش رنگ ہوا منظر خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ آنگن کی

پہلا سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم!

منی پاکستان سے نکل کر......

پاکستان کے دل میں......

زندہ دلانِ لاہور کے درمیان

ماہِ دسمبر میں

پہلے سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی تقریب

اپنی روایتی شان وشوکت کے ساتھ منعقد کی جارہی ہے

کیا **لاہور**...... **کراچی** سے سبقت لے جائے گا؟

اس سوال کا جواب...... سچی کہانیاں کے چاہنے والوں کے ہاتھ میں ہے

اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے......

آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں ناں؟

آپ کے جواب کا منتظر......

آپ کا اپنا......

کاشی چوہان

نوٹ: تقریب کی تاریخ اور مقام کا اعلان اگلے ماہ کے شمارے میں کر دیا جائے گا۔

چڑیا‘ کے اگلے حصے کا انتظار ہے۔ نگہت اعظمی کا ’اَن کہا دکھ‘ بہت کچھ کہہ گیا۔ اور لفظ کے تیر اندر تک گھائل کر گئے۔ کڑی دھوپ آج کل ہر دوسرے کی کہانی ہے۔ حبیبہ عمر کی تحریریں تو اچھی تھی مگر جاذب جیسے ظرف وسیع رکھنے والے خال خال ہی ہیں۔ بہرحال افسانوں میں کیا کچھ نہیں ہوسکتا؟ کرچیاں اور آ گہی اچھے افسانے رہے۔ یہ شام سے اداس لوگ‘ دلکش عنوان سے بجی مریم سمیعہ کی دلفریب اور رنجیدہ تحریر پسند آ گئی۔ مگر اس میں ایک خرابی جو واضح تھی اور وہی اُس کا موضوع تھی۔ ایک ناجائز اولاد‘ مسلمان گھرانوں میں اخلاقی اقدار پس پشت ڈال کر اپنی محبت کا علم بلند کرنا کہاں کی شرافت و پاکیزگی ہے۔ کب ہمارے معاشرے میں ان باتوں بلکہ (زانیوں) کو قبول کیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام میں اس کی سخت وعید آئی ہے اور سنگساری کی سزا سنائی گئی ہے۔ سو کوشش کریں اچھائی کو پھیلائیں اور برائی سے روکنے والی تحاریر کو شامل کریں۔ یہ نہ ہو کہ ہر محبت کرنے والے ایسے تجربات سے گزریں۔ سخت الفاظ کے لیے معذرت، سپنے سہانے بھی اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ دو پیار بھرے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی سید عبادت کاظمی کی تحریر گنگن کے پار‘ روح میں درد کے شگاف ڈال گئی، حسن اور موراں کی جواں مرگی پر چاند بھی شاید رویا ہوگا ’ابھی امکان باقی ہے‘ منزہ جی پہلے تو یہ کہوں گی کہ سرورق پر ضرور لکھیں اس کے بارے میں، کیونکہ یہ ناول دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے۔ میرے مشاہدے میں ہے کہ ایسے گھریلو اور معاشرتی ناول بے حد مقبول ہوتے ہیں زمر نعیم بہت خوبصورتی سے ہر کردار کے ساتھ انصاف کر کے آگے بڑھا رہی ہیں۔ اروئی کے کیسے امتحانات کا طویل سلسلہ شروع ہوگا دیکھنا یہ ہے کہ وہ ان مصائب کے امتحانات میں کیسے سرخرو ہوتی ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکتوبر کا شمارہ اپنے اندر رعنائی کے تمام رنگ سموئے ہوئے تھے۔ یہ سب آپ کی کاوشوں اور محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میرا افسانہ ’شکاری‘ جلد لگا دیں۔ ایک ناولٹ نئے سال کے حوالے سے زیر قلم ہے۔ کوشش ہے کہ جلد آپ کو بھجوا دوں۔ اس کے علاوہ مقتل اور خوشیوں بھری عید‘ کا اعزازیہ بھی روانہ کر دیں۔

✉: اچھی سی فصیحہ! آپ کی پڑھنے کی رفتار تیز ہے۔ میں تو آپ کی بولنے کی رفتار کی بھی قائل ہوں چند لمحوں کی کال میں ساری باتیں کر لیتی ہیں۔ شمارہ پسند کرنے کا شکریہ...... آپ کا افسانہ جلد شائع کروں گی اور ہاں امید ہے کہ اعزازیہ مل گیا ہوگا...... ایسے ہی جاندار تبصرے کے ساتھ محفل میں آتی رہا کریں اچھا لگتا ہے۔

✉: اور یہ آمد ہے لاہور سے نزہت حسین کی، لکھتی ہیں۔ محترمہ منزہ سہام! دوشیزہ سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ جب اسکول میں پڑھتی تھی تب سے پڑھ رہی ہوں درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے یہ تعلق ٹوٹ سا گیا تھا۔ شادی کے بعد بچے اور دیگر ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے اتنے سال گزر گئے۔ 5 سال قبل سعودیہ سے واپسی پر پھر سے یہ تعلق جڑ گیا ہے۔ میں نے دیگر رسالوں کو بھی پڑھا ہے مگر جو اپنائیت دوشیزہ میں ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں...... افسانوں کے کردار آس پاس ہی نظر آتے ہیں۔ میں آپ کی محفل کے توسط سے رفعت سراج صاحبہ کو بہترین تخلیق پر مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے دوشیزہ کے لیے وہ بھی بہت محبت سے لکھتی ہیں۔ دوسرے رسالے کے مقابلے میں تحریر میں واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ زمر نعیم کا انداز بھی بہت اچھا ہے اس کے علاوہ اس ماہ سنبل کی تحریر لاجواب تھی، مریم سمیہ صاحبہ نے بھی بہت خوب لکھا۔ آسیہ مظہر کا ’کرچیاں‘ فرح انیس کا ’آ گہی‘ اور سید عبادت کاظمی کا ’گنگن کے پار‘ بہت اچھے افسانے تھے۔ منزہ شاعری کے صفحات اگر بڑھا دیں تو دل خوش

ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پرانے لکھنے والوں جیسے 'نسیم آمنہ' روبینہ اخلاق' عابدہ رؤف' سیما غزل ان لوگوں کے افسانے بھی ضرور شائع کریں۔ مجھے ثمینہ عرفان بہت پسند تھیں مگر وہ اب بالکل نہیں لکھتیں...... اس کے علاوہ دیپک پروانی اور نیلم منیر کے بارے میں جان کر بھی اچھا لگا۔ اگر میں دوشیزہ گلستان میں شرکت کرنا چاہوں تو کیا یہ ممکن ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا لکھ دیا اچھا اب اجازت دیجیے، اللہ حافظ۔

ﷺ: پیاری سی نزہت! میں دل سے آپ کو دوشیزہ کی محفل میں خوش آمدید کہتی ہوں، کیا ہوا جو محفل میں شرکت پہلی بار کی ہے۔ تعلق تو آپ سے بہت پرانا ہے۔ بڑے سچ کہہ گئے ہیں کہ کتاب آپ کو تنہا نہیں ہونے دیتی۔ دوشیزہ کے حوالے سے کتنے محبت کرنے والے میرے آس پاس ہیں، میں یقیناً خوش نصیب ہوں۔ محفل میں شرکت کرتی رہیں، اچھا لگے گا۔

✉ یہ خط آیا ہے لندن سے آپ کی اور ہماری جانی پہچانی شاعرہ اور مصنفہ سعدیہ سیٹھی کا، لکھتی ہیں۔ منزہ جی اسلام علیکم! سنائیں کیا حال چال ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی محفل میں شرکت نہیں کرپاتی۔ لندن کی سردیاں مت پوچھیں حالت خراب کردی۔ طبیعت کافی خراب رہی مگر اب بہتر ہے سوچا جلدی سے حاضری لگوالوں...... بستر پر لیٹے لیٹے 2 دن میں سارا رسالہ پڑھ ڈالا۔ اس بار واقعی میں مزہ آگیا۔ دیپک پروانی سے شروع کرکے کچن کارنر تک شمارہ آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میری جانب سے آپ کو اور تمام مصنفین کو اتنی شاندار تحریریں لکھنے پر مبارکباد۔ منزہ جی مزے دار بات تو یہ ہے کہ نئے لکھنے والے بھی زبردست لکھ رہے ہیں۔ ایسا پختہ قلم ہے کہ میں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ ہمارے بچے تو نہ اردو بولتے ہیں نہ سمجھتے ہیں پھر آپ لوگ جو محنت کرتے ہیں وہ بھی قابل تعریف ہے۔ شاید ابھی تو نہیں لیکن آنے والا وقت ثابت کرے گا کہ اردو زبان کو بچانے میں ڈائجسٹوں کا بہت ہاتھ ہے۔ ورنہ انڈین فلموں نے تو ہماری زبان کو برباد کردیا ہے۔ ادبی رسائل عام آدمی کے ہاتھ میں نہیں پہنچتے۔ عام لوگ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں اور سچی بات ہے کہ بہت سے الفاظ جو میں غلط بولتی تھی پڑھ پڑھ کر ہی ٹھیک کیے۔ رفعت جی کے لیے تو کچھ کہنے کی میری اوقات نہیں مگر جس تحریر نے دل جکڑ لیا وہ آنگن کی چڑیاں ہے۔ کیا بات ہے سنبل جی کی، وہ جتنی نازک ہیں اس کے الٹ، بھاری بھرکم تحریر کا جادو جگاتی ہیں۔ اللہ ان کے قلم کو اور طاقت عطا فرمائے' دردانہ نوشین صاحبہ کا افسانہ' خوش رنگ منظر ایک بے انتہا خوبصورت تحریر تھی۔ وہ ایک منجھی ہوئی مصنفہ ہیں اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں رکھتی ہیں۔ لگتا ہے افسانہ نہیں نظروں کے سامنے منظر ہوں۔ ان کے کردار چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ منزہ جی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کب کررہی ہیں، ہوسکتا ہے اس بار میں بھی آجاؤں اور تمام لکھنے والوں سے مل بھی لوں۔ کتنا اچھا دن ہوگا وہ...... اچھا منزہ جی اپنا بہت خیال رکھیے گا اور اب مجھے اجازت دیں انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔

ﷺ: کیوٹ سی سعدیہ! آپ کا فون کچھ دن خاموش رہا تو میں گھبرا گئی تھی۔ بہرحال آپ کی صحت بہتر ہے جان کر اطمینان ہوا۔ دوشیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ اور اس خوبصورت تحفے کا بھی...... میری بھی خواہش ہے کہ جلد از جلد دوشیزہ ایوارڈ کروالوں مگر آپ کو ملک اور خصوصاً ہمارے شہر کے حالات تو پتہ ہی ہیں۔ بس دعا کریں سب ٹھیک رہے تاکہ فنکشن کی تیاری شروع کی جاسکے۔

''اس آخری خط کے ساتھ مجھے اجازت دیجیے۔ خوش رہیے اور خوش رکھیے۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

☆☆......☆☆......☆☆

مدیحہ زہرہ نقوی

حسین اینکر اور ہوسٹ

مونی خان

مدیحہ زہرہ نقوی جو آج کل سماء ٹی وی سے مارننگ شو کی میزبانی کر رہی ہیں ایک بہت ذہین اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ 4 ستمبر کو لاہور میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم لاہور سے ہی حاصل کی۔ ابتداء لاہور کے مقامی کنیرڈ کالج سے بیچلرز کیا اور پھر ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز۔ فلم میکنگ کی بھی تعلیم حاصل کی۔ بطور فلم میکر ہی کام کرنا چاہتی تھیں مگر اتفاقیہ طور پر میڈیا انڈسٹری میں آ گئیں۔

چینل سے کی اور بھرپور انداز میں ملکی اور غیر ملکی خبروں کو کور کیا۔ اس کے بعد دنیا ٹی وی پر بطور اینکر فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد جیو گروپ جوائن کیا جہاں سے کئی شوز ہوسٹ کیے۔ فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کم عمر ترین صحافی جس نے امریکہ کے صدارتی انتخابات کو کور کیا اعزاز رکھتی ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے بول ٹی وی جوائن کیا مگر پھر مستعفی ہوگئیں۔ 2013 میں مدیحہ کی شادی ہوئی اور وہ بہت خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔ آج کل سماء ٹی وی پر انہیں مارننگ شو کی میزبانی کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذہانت اور خوبصورتی سے اس شو کو بہت آگے لے کر جائیں گی اور اُن کا شمار صنم بلوچ، موہل شیخ، ساحر لودھی سعدیہ امام جیسے چھوڑ جانے والے میزبانوں کی فہرست میں نہیں ہوگا۔

☆☆

نعمان اعجاز

ایک بہت بڑا فنکار اور شاندار کمپیئر

ذیشان فراز

کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو آپ کو بہت اپنے اپنے سے محسوس ہوتے ہیں۔ نعمان اعجاز بھی ایک ایسا ہی چہرہ ہیں۔ جب صرف پی ٹی وی سے ڈرامے دکھائے جاتے تھے، ایسے ڈرامے جو دیکھنے والوں کو آج بھی یاد ہیں، ایسے ڈرامے جن کے شروع ہونے سے قبل سڑکیں سنسان ہو جایا کرتی تھیں، ایسے ہی ڈراموں نے نعمان اعجاز جیسے باصلاحیت فنکار سے دیکھنے والوں کو روشناس کرایا۔ قصہ 80 کی دہائی کا ہے جب ایک خوبرو نوجوان اداکار کو ٹی وی اسکرین پر دیکھایا گیا۔ پی ٹی وی نے کئی باصلاحیت فنکار پیدا کیے جن میں نعمان اعجاز کا نام سرفہرست ہے۔ آئیے آج آپ کی ملاقات اس بڑے فنکار سے کرواتے ہیں۔

س: نعمان کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟

ج: ویسے ایسا کچھ خاص نہیں بتانے کو (مسکراتے ہوئے) میں نے 1988ء میں پہلی بار ٹی وی سے ڈرامہ کیا اس سے قبل میں وکالت کیا کرتا تھا۔ بس وکالت سے دل بھر گیا تو شوبز کا رخ کیا۔

> کسی بھی اداکار کے لیے لوگوں کے دل میں اُس کی محبت اصل ایوارڈ ہوتا ہے۔ جو خوشی لوگوں کے پہچاننے اور پھر سراہنے پر ہوتی ہے اُس کا تو کوئی مقابلہ نہیں

س: اِس کا مطلب ہے کہ آپ موڈی ہیں؟

ج: جی بالکل! میں بہت موڈی انسان ہوں جو دل چاہتا ہے وہ کرتا ہوں۔

س: آپ کا اسٹار کیا ہے؟

ج: میں 14 فروری 1965ء کو لاہور میں پیدا ہوا اس حساب سے میرا اسٹار دلو ہے۔

س: آپ نے اپنے کئی ڈراموں میں منفی کردار بھی نبھائے جو یادگار ہیں ڈر نہیں لگا منفی کردار کرتے ہوئے؟

ج: ڈر تو نہیں لگا ہاں یہ بہت بڑا فیصلہ تھا کیونکہ اُس زمانے میں لوگ آپ کو آپ کے کرداروں سے ہی پہچانتے تھے۔ ٹی وی شوز فیس بک وغیرہ یہ تو سب تھا نہیں...... مجھے کچھ چیلنجنگ کرنے کا ہمیشہ سے ہی شوق تھا اداکاری کی طرف آنا تو اتفاق تھا دراصل مجھے کمپیئرنگ کا شوق تھا اور میں بغیر اسکرپٹ کے کمپیئرنگ کرتا تھا۔

س: نعمان آپ کو کئی ایوارڈز ملے کیسا محسوس کرتے ہیں؟

ج: دیکھیے کسی بھی اداکار کے لیے لوگوں کے دل میں اُس کی محبت اصل ایوارڈ ہوتا ہے۔ جو خوشی لوگوں کے پہچاننے اور پھر سراہنے پر ہوتی ہے اُس کا تو کوئی مقابلہ نہیں مجھے بیسٹ ٹی وی ایکٹر، لکس اسٹائل ایوارڈ، ہم ایوارڈ سے نوازہ گیا مگر مجھے سب سے زیادہ خوشی پرائڈ آف پرفارمنس ملنے پر ہوئی تھی۔

س: گھر والوں نے آپ کا بطور اداکار کیریئر منتخب کرنا آسانی سے قبول کرلیا تھا؟

ج: میرے والد بطور میجر تھیٹر جاب کرتے تھے تو اُن کی خواہش تو یہی تھی کہ اُن کے بچے پہلے پڑھائی پوری کرلیں پھر جو چاہے کریں تو الحمدللہ میں نے L.L.B مکمل کیا کچھ عرصہ وکالت بھی کی لہٰذا کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

س: ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج: میں نے کیتھڈرل ہائی اسکول سے تعلیم حاصل کی پھر پنجاب یونیورسٹی سے L.L.B کیا۔

س: آپ نے پہلا ڈرامہ کس اسٹیشن سے کیا تھا اور اب تک کتنے ڈرامے کر چکے ہیں تعداد یاد ہے؟

ج: میں نے پہلا ڈرامہ لاہور سے کیا تھا جو نصرت ٹھاکر صاحب نے لکھا تھا اور صحیح تعداد تو یاد نہیں مگر 100 سے زائد سیریز ہیں اور 300 کے لگ بھگ انفرادی ڈرامے اور ٹیلی پلے ہیں۔ 26 سالوں کا ریکارڈ ہے۔

س: تقریباً ہر آرٹسٹ اسٹیج ضرور کرتا ہے مگر آپ نے نہیں کیا کوئی خاص وجہ؟

ج: اوہ بھئی میں اسٹیج سے دور ہی بھلا میں کمپیئرنگ کی حد تک تو اسٹیج کا حامی ہوں مگر اداکاری کے حوالے سے مس فٹ محسوس کرتا ہوں۔

س: آپ انٹرویو نہیں دیتے کیوں؟

ج: نہیں ایسا نہیں ہے یہ تو میڈیا کا ہی دور ہے بس بہت کوشش نہیں کرتا خبروں میں رہنے کی

لوگ ہمیں ہمارے کام سے جانیں یہی بہت ہے۔

میں نے پہلا ڈرامہ لاہور سے کیا تھا
جو نصرت ٹھاکر صاحب نے لکھا تھا اور
صحیح تعداد تو یاد نہیں مگر 100 سے زائد
سیریز ہیں اور 300 کے لگ بھگ
انفرادی ڈرامے اور ٹیلی پلے ہیں۔
26 سالوں کا ریکارڈ ہے۔

س: مگر پھر بھی میڈیا کے تعاون کے بغیر ترقی مشکل ہے؟

ج: آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں متفق ہوں اس بات سے...... اصل میں ایک بار ریکارڈنگ کے دوران بازار سے پکوڑے منگوائے رمضان تھے اس لیے سیٹ پر ہی سب روزہ کھول رہے تھے تو جس اخبار میں پکوڑے لائے گئے اس پر میری بڑی بڑی تصاویر موجود تھیں بس یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا شاید اسی لیے ذرا دور دور ہی رہتا ہوں۔

س: محبت پر یقین رکھتے ہیں؟

ج: جس محبت کی آپ بات کر رہے ہیں اس پر بالکل یقین نہیں رکھتا یہ مادی دور ہے اس میں کوئی محبت کا دعویٰ کرے تو وہ سب سے بڑا جھوٹا ہے۔

س: تبدیلی کے قائل ہیں؟

ج: (ہنستے ہوئے کون سی تبدیلی) دیکھو یار انسان کو عمر اور وقت کے ساتھ ساتھ ضرور تبدیل ہونا چاہیے یہ اس کے اپنے لیے بہت اچھا ہوتا ہے اور تبدیلی مثبت انداز میں آئے تو بہتر ہے۔ انسان کو در اصل وقت اور حالات ہی سکھاتے ہیں۔

س: آپ غصہ ور انسان لگتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟

ج: میرے خیال میں تو بالکل نہیں میں خود بھی بہت دھیمے انداز میں بات کرتا ہوں اور تحمل کے ساتھ دوسروں کی بات سنتا بھی ہوں اصل میں میں بہت حساس انسان ہوں (یہ آپ میری بیگم سے بھی پوچھ سکتے ہیں)

س: زندگی میں کب بے انتہا خوشی محسوس کی تھی؟

ج: جب میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا یقیناً اولاد دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ میں اپنے بچوں کی ہر بات مانتا ہوں بقول بیگم خراب کرنے کی حد تک، اللہ نے مجھے دو بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازہ ہے اور یہ میرا شکر کرنے کا انداز ہے۔

س: اچھا یہ بتائیں کس کام میں بہت سکون محسوس کرتے ہیں؟

ج: میں نماز پڑھ کر بہت اطمینان اور سکون محسوس کرتا ہوں رات میں سونے سے قبل دینی کتب کا بھی مطالعہ مجھے بہت پسند ہے اور یہ میری عادت بھی ہے۔

س: موجودہ دور کی شخصیت جو آپ کو بہت پسند ہے؟

ج: مجھے جنید جمشید بہت پسند ہیں اور میں اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں۔

س: اپنی سالگرہ کیسے مناتے ہیں؟

ج: پہلے مناتا تھا اب نہیں۔

س: کوئی ایسا یادگار کردار جو آپ کو بہت پسند ہے؟

ج: مجھے 'کسے آواز دوں' میں اپنا نبھایا ہوا منفی کردار بہت پسند ہے۔

چل رہے ہوتے ہیں اور لوگوں کو پچھلی قسط میں کیا ہوا دیکھنے کے باوجود بھی یاد نہیں رہتا ماضی میں ڈرامے کا معیار بہت بلند تھا۔ نہ پبلسٹی ہوتی تھی نہ کسی اور چیز پر فوکس ہوتا تھا بس مکمل توجہ اسکرپٹ پر ہوتی تھی تبھی تو یادگار ڈرامے بنے، ہاں موجودہ دور میں ٹیکنیکل شعبے نے بہت ترقی کرلی ہے۔

س: آپ کا ہم ٹی وی سے نشر ہونے والا ڈرامہ 'سنگ مرمر' عوام میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اس کی کوئی کاص وجہ؟

ج: بات پھر وہی آجاتی ہے مضبوط اسکرپٹ کی، جو لوگ سرحد کے کلچر سے واقف ہیں وہ مانیں گے کہ اس ڈرامہ میں کس قدر باریکی سے یہ پہلو پر نظر رکھی گئی ہے۔ نہ سجے ہوئے سیٹ ہیں نا خاص لباس پھر بھی ڈرامہ جاندار ہے ہر کردار اپنی فٹ ہے۔ کہانی ہے، رسم و رواج دکھائے گئے ہیں

لوگ بھی اچھی چیز دیکھنا چاہتے ہیں۔

س: بیگم آپ کی اداکاری کے شوق سے

س: اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

ج: مطمئن تو انسان زندگی بھر نہیں ہوتا اور ابھی تو میں اپنے آپ کو فقط طالب علم ہی سمجھتا ہوں۔

س: ایسا کوئی کردار جو لوگ نہ بھولے ہوں اور آج بھی آپ سے مل کر اس ڈرامے یا کردار کا ذکر کرتے ہوں؟

ج: پی ٹی وی سے پیش کیا جانے والا ڈرامہ 'دشت' جسے تحریر منو بھائی نے کیا تھا اور ڈرامائی تشکیل عابد علی صاحب کی تھی اس میں میرا کردار لوگوں نے بہت پسند کیا تھا اور انہیں آج تک یاد بھی ہے اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو واقعی میں رباب بجانا آتا ہے تب بہت اچھا لگتا تھا۔

س: نعمان آج کل جو ڈرامے بن رہے ہیں آپ مطمئن ہیں؟

ج: آج کل جو ڈرامے بن رہے ہیں وہ اسکرپٹ کے لحاظ سے بہت کمزور ہیں تبھی تو دیکھنے والوں کو یاد نہیں رہتے حد تو یہ ہے کہ اکثر ڈرامے

نالاں ہیں یا خوش؟
ج: بھئی ہمارا تو گھر اس سے چلتا ہے پھر کیسی ناراضگی ہاں وہ میری سگریٹ نوشی کی عادت سے بہت تنگ ہیں۔

نماز پڑھ کر بہت اطمینان اور سکون محسوس
کرتا ہوں رات میں سونے سے قبل دینی
کتب کا بھی مطالعہ مجھے بہت پسند ہے
اور یہ میری عادت بھی ہے۔

س: آپ کی بیگم نے کچھ کمرشلز اور ڈرامے بھی کیے کیا شادی کے بعد آپ نے منع کر دیا۔
ج: بالکل نہیں، اس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ گھر اور پھر بچے زیادہ اہم ہیں لہٰذا پورا وقت انہی کو دینا چاہیے۔
س: زندگی میں کوئی کمی؟
ج: الحمدللہ پاک پروردگار نے بہت نوازا ہے کوئی کمی نہیں بس والدہ کی بہت یاد آتی ہے۔
س: پیار کا نام کیا ہے؟
ج: گھر والے مجھے نومی کہہ کر پکارتے ہیں۔
س: ایسے کون سے رویے ہیں جو دکھ دیتے ہیں؟
ج: دکھ تو نہیں ہاں مجھے ان لوگوں پر رحم ضرور آتا ہے جو مذہب سے دور ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔
س: خواتین کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟
ج: یہ تو آپ رابعہ سے پوچھیں ویسے میں اس حد تک قائل ہوں جس حد تک مذہب نے آزادی دی ہے۔

س: یہ سوال میں نے اس لیے بھی پوچھا کہ آپ کا یہ انٹرویو میں کراچی سے شائع ہونے والے ڈائجسٹ 'دوشیزہ' کے لیے لے رہا ہوں؟ جو خواتین کا بہت ہی مقبول ڈائجسٹ ہے۔
ج: 'دوشیزہ' میں میرا انٹرویو ایک بار پہلے بھی چھپا تھا غالباً 2002ء میں تب میں نے مدیرہ سے شکوہ بھی کیا تھا کہ آپ نے انٹرویو بھی چھاپا اور پرچہ بھی نہیں بھجوایا مگر کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی پتے کے حوالے سے میں لاہور میں تھا شاید اس لیے......
س: اگر کوئی آپ سے اُدھار لے اور پھر واپس نہ کرے تو آپ کیا کرتے ہیں؟
ج: یار میں تقاضہ نہیں کرتا معاف کر دیتا ہوں کیونکہ تقاضہ کر کے شرمندہ کرنا مجھے بہت برا لگتا ہے۔
س: نعمان ہر انسان کے Ideals ہوتے ہیں آپ کا کون ہے؟
ج: مجھے حضور ﷺ کی ہستی سے عشق ہے اور وہی میرے All Time Ideal ہیں۔
س: اپنے پڑھنے والوں کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟
ج: دیکھو بھائی پیغام تو نہیں دوں گا ہاں اکیاون سالہ زندگی میں یہی سیکھا کہ دین سے دوری نقصان دہ ہے لہٰذا اگر نقصان اور دکھ سے بچنا ہے تو نماز کی پابندی کرنی بہت ضروری ہے بس یہی میرا تجربہ ہے۔
تو قارئین یوں یہ یادگار انٹرویو تمام ہوا چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، روشن چہرہ اور دھیما انداز رکھنے والے اس بہت بڑے فنکار اور انسان سے یہ ملاقات میرے لیے بھی قابل فخر اور یادگار ہے۔

☆☆......☆☆

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جولائی 2014 سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا

☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص

☆ پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں

☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی اوز کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مداروں کو خصوصی رعایت

☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے...... ماہنامہ 'اطراف' میں ہے

سوئیٹ نمبر 508، لینڈ مارک پلازا، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

Ph: 0092 21 32274661
Mob:0300-8210636

Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.atraafmagazine.com

نمونے کی مفت کاپی کے لیے خط لکھیے

لائف بوائے... اعتماد دلائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''سیف فیوچر'' کے لیے ہم جتنے بھی جتن کریں، ہتھکنڈے اپنائیں کم ہیں۔ ظاہر ہے 'اپنے' مستقبل کا سوال آتا ہے تو پھر بندہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو جاتا ہے۔ مگر اس احتیاط میں کچھ واقعات ایسے بھی سرزد ہو جاتے ہیں جب پیچھے مڑ کر دیکھو تو اعمال نامے خساروں کے بجائے مفاد کے ستاروں سے چمک رہے ہوتے ہیں۔ اسی سیف فیوچر نے مجھے ایک آرگنائزیشن سے جوڑ دیا تھا کہ زندگی کے 60 برس گو ہم یکسو ہو کر حکومتی غلام بنے رہے اور جب حکومت نے ہمیں فارغ البال کیا تو اس غلامی کے عوض مفاد کے ستارے گریجویٹی کی صورت چمک رہے تھے۔

لیجیے جی بینک میں متاع ڈپازٹ کرادی اور معقول پنشن کے بعد آزادی ہی آزادی تھی۔ اب اعمال ناموں کو مزید وزنی کرنے کی خاطر میں نے ایک آرگنائزیشن میں اپنی خدمات فراہم کرنے کی ٹھانی تھی۔

چونکہ میرا تعلق ایجوکیشن فیلڈ سے رہا ہے اس لیے مجھے ایک پسماندہ علاقے کے ووکیشنل اسکول میں خواتین کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں تعینات کر دیا گیا۔ اس اسکول میں مڈل تک تعلیم کے بعد بچیوں کو سلائی کڑھائی اور اسی سے متعلق دیگر کاموں کی تربیت دی جاتی تھی اور پھر وومن امپاورمنٹ کے تحت ہی ہماری آرگنائزیشن نے اس اسکول کو منتخب کیا تھا۔

آج میرا پہلا دن تھا۔ انٹروڈکٹری کلاس تھی۔ میں نے ہال میں ہی اپنے ادارے کے مقاصد بتانے کی غرض سے تمام طالبات کو اکٹھا کر لیا۔ ٹیچرز بھی ان کے ساتھ ہی آ گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ جب ہمارے درمیان ایک دوسرے کو جاننے کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں بس ان سب کو ایک گائیڈ لائن کی ضرورت ہے۔ اس اسکول میں شام میں تعلیم بالغان کی کلاسز بھی لگتی تھیں۔ طالبات کی زیادہ تر تعداد بھی کوئی بارہ سے سترہ سال کے درمیان تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کا اُن میں جنون تھا۔ دورانِ میٹنگ ایک بچی بہت غور سے مجھے سن رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میٹنگ کے بعد میں اسکول کے ویٹنگ روم میں بیٹھی مزید پوائنٹس لکھ ہی رہی تھی کہ ایک باریک سی آواز نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔

''میڈم آئی کم!''

''یس...... شیور بیٹا۔'' میں نے اُسے اندر آنے کی اجازت دی۔

''مس میں بھی بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میری امی مجھے ہر چیز سے روک دیتی ہیں۔''

''کیا مطلب' میں سمجھی نہیں۔''

''وہ مس......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

''بولو بیٹا...... میں سن رہی ہوں، جو بات ہے بولو۔''

''وہ مس...... میری امی کہتی ہیں کہ تم کچھ نہیں کرسکتی ہو۔ تم گھر میں رہنے والی بچی ہو۔ اس اسکول میں پڑھ کر بھی تم نے کچھ نہیں کرنا۔ ہمارے خاندان میں کوئی لڑکی نہیں پڑھی۔ تم کس طرح پڑھ سکتی ہو۔'' وہ جیسے سب کچھ ایک دم ہی بول گئی۔

''تم ایسا کرو Monday کو اپنی امی کو میرے پاس لے کر آنا میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم فکر مت کرو۔''

بات کرتے ہوئے اُس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

''مگر تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے یہ بات کس لیے کررہی ہو۔''

''مس آپ نے ابھی بتایا تھا نا کہ لڑکیاں آج سب کچھ اپنی ہمت سے کرسکتی ہیں۔ مس میں بھی بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ میں اسکول میں پڑھانا چاہتی ہوں۔ میں مس بننا چاہتی ہوں مس...... مجھے مس بنادیں۔'' اُس کی خواہش لبوں سے ادا ہوئی تھی۔

''ہم......م تو تم 'مس' بننا چاہتی ہو اور اپنی امی سے ڈرتی ہو۔''

''نہیں مس...... میں امی سے نہیں ڈرتی۔ وہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ مگر وہ ہر بار مجھ سے یہی کہتی ہیں کہ میں زندگی میں کچھ نہیں کرسکتی۔ غریب لوگ صرف غلامی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔''

میں اُس پندرہ سالہ بچی کے منہ سے ایسی جہاندیدہ باتیں سن کر، اُس کی ماں سے ملنے کو واقعی میں بے قرار ہوگئی تھی۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری امی کو سمجھاؤں گی بیٹا...... تم جاؤ، تم انشاءاللہ مس ضرور بنو گی۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کام میں جُت گئی۔

☆......☆......☆

''امی! آج اسکول میں ایک بہت اچھی نئی مس آئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آج کے زمانے میں لڑکیاں ہر کام کرسکتی ہیں۔ بس ان میں ہمت پیدا کرنے کی دیر ہوتی ہے اور جب ہمت جاگ جاتی ہے تو پھر لڑکیوں کو ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

حور العین نے خوش ہوکر آج کی اسکول کی روداد ستارہ کے گوش گزار کی۔

ابھی ستارہ نے کھانا بنانے کے لیے پیاز کاٹنا شروع کی تھی کہ دروازہ کھول کر اُس کی حور گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اور آتے ساتھ ہی اسکول کی روئیداد بتانے لگی تھی۔

''ہاں تو کرسکتی ہیں لڑکیاں سب کچھ مگر غریب لڑکیاں بس گھر کی چاندنی ہی بن سکتی ہیں۔ سب کچھ پیسے سے ہوتا ہے۔''

''امی میں مس بننا چاہتی ہوں۔ مس بننے میں کون سے پیسے لگتے ہیں۔''

''حور تم چھوٹی ہو بیٹا تم یہ سب نہیں سمجھ سکتی ہو۔'' ستارہ ہانڈی میں پیاز ڈال کر فرائی کرنے لگی۔ حور اندر کمرے میں جاکر یونیفارم تبدیل کرنے چلی گئی۔

گھر کیا تھا ایک کمرہ تھا اندھیرا تاریک سا اور کمرے کے باہر مٹی کا چولہا دھرا تھا۔ ایک مچان پر کچے پکے برتنوں کی ڈھیریاں تھیں۔ اُسی کے سامنے دیوار پر ایک گول شیشہ لٹکا تھا۔ کمرے کی تاریکی میں حور العین مستقبل کے چمکیلے سپنے دیکھا کرتی تھی۔

غربت کا یہ عالم تھا کہ صبح کھایا تو شام کی خبر نہیں

کہ نصیب میں ہوگا یا نہیں...... اسکول بھی ستارہ نے اسی لیے اُسے داخل کرادیا تھا کہ گورنمنٹ کے اسکولوں میں بچیوں کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مگر حورالعین بہت الگ سوچ رکھنے والی بچی تھی۔

اس کباڑ خانے گھر میں بھی اُس کی مس بننے والے سپنے کا دیا پوری طرح روشن تھا۔

ستارہ اُس کے لیے چنگیر میں کھانا لیے چارپائی پر بیٹھی تھی۔

''آجاؤ حور! کھانا کھاؤ بیٹی۔ روٹی ٹھنڈی ہورہی ہے۔ستارہ کی پکار پر وہ چارپائی پر آکر بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگی۔

ستارہ نے بھی اپنے بچپن کے دن اسی کسمپرسی میں گزارے تھے۔وہ جانتی تھی کہ خواب ٹوٹنے سے جو کرچیاں روح کے آرپار ہوتی ہیں وہ بہت جلد انسان کو چاٹ جاتی ہیں۔ ناسور بن جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی بچی کے دل کو اونچے خوابوں کے گگن سے دور رکھنا چاہتی تھی۔

اُس کی ہر بات پر وہ اُسے یہی کہتی تھی کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ غریب کے پاس عزت کے ساتھ دو وقت کی روٹی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

''میری بیٹی مس بننا چاہتی ہے۔''

''بالکل! میں مس بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔''

''ارے یہ تُو کتنی بڑی بڑی باتیں کررہی ہے آج۔''

''امی ہمارے اسکول میں آج جو بڑی مس آئی تھیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم سب کو وہ ہنرمند بنائیں گی۔ اور لڑکیاں ہر کام میں لڑکوں سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ ترقی پر مرد اور عورت سب کا حق ہے۔''

''ارے واہ...... یہ تو سچ کہا انہوں نے مگر بیٹی...... یہ باتیں صرف کہنے کی حد تک ہوتی ہیں۔ ہم غریب لوگ یہ سب نہیں کرسکتے ہیں۔''

''امی میں نے مس سے کہا تھا کہ مجھے بھی مس بننا ہے۔''

''تم کو کیا ضرورت پڑی تھی اُن سے کہنے کی۔''

''امی وہ ہم سب کو حوصلہ دے رہی تھیں۔ میں نے اپنے دل کی بات بتادی اُن کو...... اور ہاں امی...... وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''ہائیں! مجھ سے...... کیوں بھئی خیریت ہے۔''

''پتا نہیں...... آپ مل لیجیے گا اُن سے۔''

''میرے پاس فضول وقت نہیں...... تم اپنا کھانا ختم کرو اور چلو مرغیاں ڈربے میں بند کرو۔ کب سے گلی میں نکلی ہوئی ہیں۔''

''امی میں مرغیاں بند نہیں کروں گی۔ میرے ہاتھوں سے بدبو آتی ہے پھر...... اور یہ دیکھیں میرے بال کیسے گندے ہوگئے ہیں اُن کے ڈربے کی صفائی کرکرکے۔''

ڈربہ اتنا تھا کہ آسانی سے کوئی اندر جاکر ڈربے کی صفائی کرلے۔

غریب لوگ تھے، مرغی کے دیسی انڈوں سے بھی کچھ آمدنی ہوجاتی تھی ورنہ اس مختصر کنبے کا کفیل شکیل احمد تو مزدوری کرکر کے اَدھ موا ہی ہوچکا تھا۔

''ہاں جاکر دھولو کپڑے دھونے والے صابن سے، اور ہاں بال دھوکر سرسوں کا تیل ڈال لو، ٹھیک ہوجائیں گے۔'' ستارہ نے لاپروائی سے کہا۔

''امی میرے سر پر جگہ جگہ سے بال اُڑ کر ٹکیا ٹکیا بنا رہے ہیں۔ میرا سر تو بالکل قمیض پہ ٹنکے شیشے والے گلے کی طرح ہوجائے گا۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

یعنی اُس کی اُداسی میں اضافے کی ایک نئی وجہ بھی ظہور پذیر ہوگئی تھی۔

''ارے بیٹی تم نے مس سے مس بننے کے بارے میں پوچھا، تم اپنی اس سر کی حالت کا بھی بتادیتیں۔''

''آپ کہہ تو ٹھیک رہی ہیں مگر...... خیر امی میں کل ضرور پوچھوں گی۔'' یہ کہہ کر ماں بیٹی گھر کے دیگر کام نپٹانے لگیں۔

☆......☆......☆

مِس آج جب اسکول میں داخل ہوئی تو مجھے حور العین سب سے پہلے اپنی جانب آتی دکھائی دی۔

''کیسی ہو بیٹی!'' میں نے اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مس کلاس کے بعد میں آپ سے بہت اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''اہم بات!'' اُس کی اہم بات کے انکشاف نے مجھے پتنگے لگا دیے۔ بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔ اسی چکر پھیر میں جب ہاف ٹائم ہو گیا تو میں حور کی منتظر تھی۔ وہ میری سوچ کے عین مطابق میرے پاس آ گئی۔

''کیا ہوا مس حور العین...... کیا اہم بات ہے۔'' میں نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے اُس سے سوال کیا تھا۔

''مس میں نے امی کو بتایا تھا آپ کے بارے میں مگر وہ اب بھی یہی کہتی ہیں کہ غریب لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔''

''تم انہیں مجھ سے ملواؤ میں سمجھاؤں گی۔'' میں نے اُسے تسلی دی۔

''مس میرے ساتھ ایک بہت بڑا مسئلہ چل رہا ہے۔ مس اِس مسئلے کے لیے امی نے کہا ہے آپ سے کہوں۔''

''ہاں بتاؤ بیٹی!'' میں دل سے اُس کا مسئلہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئی۔

اُس نے دوپٹہ اپنے سر سے ہٹایا اور......

''اوہ! بیٹی کب سے یہ پرابلم ہے بالوں میں۔'' اُس کا سر جگہ جگہ سے پانچ کے سکے جیسے نشانوں سے بالوں سے محروم تھا اور کچھ شک نہ تھا کہ کچھ دنوں میں بال ہی غائب ہو جائیں۔

''مس پچھلے سال سے جب سے پانی کا مسئلہ ہوا تو ہم لوگ ٹینکر والوں سے کوٹھی سے جو پانی بچتا ہے بالٹی دو بالٹی لے لیتے ہیں۔ اور کبھی بورنگ والا پانی استعمال کرتے ہیں۔ بس اُسی کے استعمال سے یہ ہوا ہے۔''

''اوہ بیٹی تم نے تو مجھے بھی پریشان کر دیا ہے۔'' میں اُس کی پریشانی دل سے محسوس کر رہی تھی۔

''تم کوئی شیمپو استعمال کرتی ہو۔'' میں نے کریدا۔

''مس امی کہتی ہیں شیمپو استعمال کرنے سے بال جھڑ جاتے ہیں۔ ہم نہیں استعمال کرتے شیمپو۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''ارے میری بیٹی! شیمپو تو بالوں کے لیے ہی بنا ہوتا ہے۔ یہ دیکھو میرے بال۔'' اس عمر میں بھی میرے بال خوب صحت مند اور گھنے تھے۔ گو کہ چاندی کے تار تھے لیکن تھے قابلِ رشک......

''ارے بیٹی! میں جو شیمپو استعمال کرتی ہوں وہ تم کو بھی استعمال کو دیتی ہوں۔ ابھی کوئی آتا ہے تو میں منگوا دوں گی۔ تم پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اسے استعمال کرو۔ بالوں کی حفاظت کرو بیٹی...... تم لڑکی ذات ہو۔ لڑکیوں کے لیے بالوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔''

''مس میں کیا کروں! امی کہتی ہیں۔''

''ارے تم امی کو مجھ سے ملوانا۔'' یہ کہہ کر میں نے Peon کو بلوایا اور پیسے دے کر شیمپو منگوایا۔ کچھ دیر بعد Peon لائف بوائے شیمپو لیے میرے سامنے تھا۔

''یہ لو بیٹی...... تم یہ شیمپو پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کرو۔ لائف بوائے شیمپو اپنے بہترین فارمولے کے ساتھ بالوں کے ہر مسئلے کا حل ہے۔ بالوں کی ہر بیماری اس شیمپو سے دور ہو سکتی ہے۔ تم بس فوراً آج اسکول کے بعد خود بھی استعمال کرو اور اپنی امی کو بھی استعمال کو دو۔ انشاء اللہ لائف بوائے شیمپو کے رزلٹ کے بعد تم جہاں اپنے بالوں کی بیماری کو بھول جاؤ گی وہاں لائف بوائے شیمپو ہی کے گن گاؤ گی۔''

''اور بیٹی مزے کی بات یہ ہے کہ لائف بوائے شیمپو پاکستان میں ہر جگہ عام دستیاب ہے۔ گاؤں ہو یا شہر ہو پہاڑ ہو یا وادی ہر جگہ لائف بوائے شیمپو، اپنے بھرپور اعتماد اور نمبر ون کوالٹی لیے ہر کان پر موجود ہے۔'' میں نے مزید اُسے معلومات دی تھیں۔

شیمپو حور العین کے حوالے کر کے میں مطمئن تھی۔

مجھے لائف بوائے شیمپو پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ 'سیف فیوچر' کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یاد آیا۔ بالوں کے ساتھ فیوچر ہوتا ہے بغیر بالوں کے بھلا کیسا فیوچر؟ اگر لائف بوائے شیمپو میرے بالوں کا محافظ نہ ہوتا تو شاید میرا فیوچر بھی اتنا سیف نہ ہوتا۔ بال ایک عورت کو با اعتماد بناتے ہیں۔ بال ہیں تو حسن ہے ورنہ کچھ نہیں۔

☆......☆......☆

''بیٹی جیسے بھی بال ہیں تمہارے ٹھیک ہیں۔ اور تم نے کون سا فلم کی ہیروئن بننا ہے جو اتنا پریشان ہو۔ ٹھیک ہو جائیں گے بال بھی۔''

''امی میں تو کسی کے سامنے اپنا سر تک نہیں کھول سکتی۔ دوپٹہ ہٹا نہیں سکتی۔ اتنی گرمی میں لڑکیاں دوپٹے گلوں میں ڈال کر بیٹھی ہوتی ہیں اور میں مارے شرم کے سر پر دوپٹہ جمائے بیٹھی ہوتی ہوں۔ مس نے کہا ہے کہ یہ اعتماد والا شیمپو ہے۔ بھروسے کے ساتھ استعمال کرو۔''

''دیکھو بیٹی...... کوئی رسک لینا بالوں کے لیے ہمیشہ بالوں سے ہاتھ دھونے کے برابر نہ ہو جائے۔'' ستارہ پریشانی سے حور کو چومتی ہوئی بولی۔

''امی اللہ مالک ہے میں اسے ایک بار استعمال ضرور کروں گی۔'' ستارہ کو حور کے آگے ہار ماننا ہی پڑی تھی۔

''اللہ تمہارے بال بہت اچھے کردے۔''

''آمین...... امی اور ہاں امی مس نے کہا ہے کہ تم مس ضرور بنو گی۔ میں تم کو مس بناؤں گی۔'' حور نے ستارہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

کچھ دیر بعد ستارہ خود اُس کا سر لائف بوائے شیمپو سے دھو رہی تھی۔ اُس کے دل میں خوف بھی سرسرا رہا تھا مگر...... زندگی میں کچھ رسک تو لینا ہی پڑتے ہیں۔

آہستہ آہستہ حور کے بال بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ لائف بوائے شیمپو نے اُس کے بالوں کی نگہداشت شروع کر دی تھی۔ بال بہتر انداز میں نشوونما پانے لگے اور پھر پانچ چھ ماہ میں اُس کے سر پر ایک اچھی بھلی چوٹی ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

مستقبل سیف ہونے کے لیے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ وہ ہے آپ کی یادوں کا ذخیرہ...... یہ ذخیرہ جتنا یادگار ہو مستقبل اتنا ہی روشن ہوتا ہے اور یہ یاد کے چراغ ہر پل آپ کو جینے کی امنگ دیتے ہیں۔ آج بھی مجھے وہ پل یاد ہیں جب حور العین اپنی والدہ ستارہ کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔

''باجی آپ نے میرے احساسِ کمتری کو ختم کر دیا۔ اعتماد کو میری زندگی کا ساتھی بنا کر آپ نے ہم غریبوں کو تسخیر کر لیا ہے۔'' ستارہ میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میں رب کی مشکور ہوئی اُسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اتنی محبت بھلا کب چاہی تھی۔

''مس امی کہتی ہیں کہ تم سب کچھ کر سکتی ہو اور غریب آدمی بھی آسمان چھو سکتا ہے۔'' حور العین کی خوشی دیدنی تھی۔

''باجی جس طرح میری بیٹی کے بال آپ کے اعتماد اور یقین نے لائف بوائے شیمپو کے ذریعے اے ون کر دیے۔ بالوں کی ساری بیماریاں بھگا دیں اسی طرح اللہ تعالیٰ میری بیٹی کو اس کی ہر خواہش پوری کرنے میں مدد دے گا۔''

''ارے ستارہ! بہن تو پھر سارا کریڈٹ تو لائف بوائے شیمپو کا ہوا نا...... جو ناامیدی میں امید کے چراغ جلائے۔ تم میرا نہیں لائف بوائے شیمپو کا شکریہ ادا کرو۔'' آنکھوں میں محبت کے دیپ جلاتے ہوئے میں بولی تھی۔ وہ دونوں ماں بیٹی مسرور مسرور حور العین کی کلاس میں فرسٹ پوزیشن والی ٹرافی لیے جھوم رہی تھیں اور آج...... مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے اور میں بھی مسرور ہوں۔ آج حور العین کا فون آیا تھا اور وہ یہ خبر سنا رہی تھی کہ اُسے انٹربیس ٹیچر کی گورنمنٹ جاب کا اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا ہے۔ میں حور العین کی کامیابیوں پر دل سے مسرور ہو کر لائف بوائے شیمپو کو یہ کریڈٹ دینے میں فخر محسوس کر رہی ہوں کہ اس شیمپو نے احساسِ کمتری کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔

☆☆......☆☆

قسط 22

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کر دیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

ارسلان اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔
پہلے تو ندا کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا کرے پھر وہ کہنے لگی۔
''وہ اصل میں تھکے ہوئے تھے ناں تو بس آپ کو تو پتہ ہے کہ جب بندے کی نیند پوری نہ ہو تو آپ

اُس سے کوئی لطیفہ سننے کی امید نہیں کر سکتے۔''

ارسلان نے یہ سن کر بہت زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ وہ بہت بے باکی سے ندا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''I Am Sorry Mam میں نے تو سنا تھا کہ American بہت Cool ہوتے ہیں بس Sorry اور Thanks کہنے ہی کی Practice ہے اُن کے پاس لیکن پاکستانی بہت بااخلاق ہوتے ہیں اور مہمان کی تو بہت عزت کی جاتی ہے۔''

''بڑا عجیب شخص ہے تمہارا شوہر...... تم نے اُسے بتایا کے میرا Cousin امریکہ سے آیا ہے اور اُس نے تکلفاً بھی چند منٹ بیٹھ کر...... نا میرا انتظار کیا نا مجھ سے ملنے کی کوشش کی اور چلتے بنے۔''

''نہیں ارسلان بھائی آپ Really یقین کیجیے اُن کی امی کی بہت زیادہ طبیعت خراب ہے یوں سمجھیے کہ بہت Serious Conditon میں ہیں ورنہ وہ ایسے نہیں ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے ندا صوفے پر بیٹھ گئی۔ شرمندگی کے تاثرات اُس کے چہرے سے صاف نظر آ رہے تھے۔

یوں لگ رہا ہے جیسے ارسلان نے اُس کے دل کی بات کی ہے۔ مگر وہ ارسلان سے اپنے پیارے شوہر کی برائی تو نہیں کر سکتی تھی یا اُس پر تنقید تو نہیں کر سکتی تھی۔

ارسلان اُس کے بالکل برابر میں بیٹھ گیا۔ ندا کھسک کر ذرا پرے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا بھئی میں سیدھا سادہ سا بندہ ہوں بہت اچھا بچہ ہوں یوں سمجھ لو کہ Good Boy ہوں۔''

ندا نے اُس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا پھر جانے کیا سوچ کر رُک گئی۔

ارسلان پلکیں جھپکائے بغیر اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

چلو ہٹاؤ کوئی Debate نہیں کرتے اب یہ بتاؤ کے موصوف کا موڈ کیسے ٹھیک ہوگا۔ تمہاری شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے ابھی تو تمہیں شوہر کو منانے کی ٹپس بھی معلوم نہیں ہوں گی۔''

''کہو تو میں بتاؤں؟''

''No Thank You Very Much مجھے پتہ ہے اُن کا تھوڑی دیر میں خود ہی Set ہو جائیں گے۔'' ندا نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''بہت خوب...... تمہیں اُن کا موڈ ٹھیک ہونے کی اطلاع کیسے ملے گی؟''

''Sure اُن کے موڈ ٹھیک ہوتے ہی اُن کی Call آ جائے گی اور وہ تم سے Sorry کہیں گے۔ یار تھوڑا سا غصہ تو دکھانا تمہارے کزن کی Insult ہوئی ہے۔''

''اب بس بھی کریں ارسلان بھائی آپ تو میرا دماغ ہی کھا گئے۔ میں آپ کے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ندا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ارسلان اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا یوں جیسے Situation کو بہت Enjoy کر رہا ہو۔

''نہیں نہیں، ناشتہ بنانے کی ضرورت نہیں میں اپنا ناشتہ خود بھی بنا سکتا ہوں۔ تمہارے شوہر نے مجھے جو عزت دی ہے دل نہیں چاہتا کہ اُس کی بیوی سے خدمتیں کرواؤں۔''

ارسلان بھی یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''توبہ ہے ارسلان بھائی آپ تو بات ہی پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔''

''بتایا نا میں نے کہ Routine والی باتیں نہیں ہو رہی آج کل...... اُن کی Mother Hospitalzed ہیں آپ خود اِس چیز کو Feel کریں اگر کسی کی ماں Hospital میں داخل ہو تو اُس کی Condition بھی Serious ہو تو کیا وہ Normal Atitude دے گا Kindly Realise کریں۔'' یہ کہتے ہوئے ندا آگے بڑھ گئی۔

''چلو ٹھیک ہے اس دفعہ تو معاف کر دیا لیکن اپنے Dear Husband کو بتا دینا میں مہمان نہیں ہوں یہ میرا اپنا گھر ہے۔ بہت دور سے ضرور آئے ہیں لیکن اپنے گھر آئے ہیں۔ البتہ وہ ضرور مہمان ہیں میرے گھر میں......'' ندا نے جاتے جاتے پلٹ کر ارسلان کی طرف غصے سے دیکھنے لگی۔

''بہت جلدی یاد آ گیا آپ کو اپنا گھر......'' ارسلان بھی ایک طرح سے بہت ڈھیٹ ہی تھا۔ زوردار قہقہہ لگا کر ندا کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

''بھئی وہ آپ اُردو بولنے والے ایک بات بولتے ہو ناں......کبھی کبھی پاپا کے منہ سے بھی سنتا ہوں 'لوٹ کر بدھو گھر کو آئے' تو بھئی میں بدھو تو ہرگز نہیں بہت عقلمند ہوں لیکن لوٹ کر اپنے گھر آیا ہوں۔''

ندا Kitchen کی طرف جاتے جاتے پھر بولی تھی۔

''ہاں اپنے گھر آئے ہی گھر کو بیچنے ہیں۔ اصل گھر تو امریکہ میں بنایا ہوا ہے اِس گھر کو بیچ کر کوئی Shipping Company چلائیں گے۔''

ارسلان اس کے پیچھے پیچھے کچن میں پہنچ گیا تھا اس نے کچن کا ایک طائرانہ جائزہ لیا۔

''اُف خدایا...... یہ کچن ہے اسے تو Dirty Kitchen بھی نہیں کہہ سکتے۔''

ندا اب اُس کی باتوں پر توجہ دینے کی بجائے Frypan اُٹھا کر دھمکی دینے والے انداز میں بولی۔

''یہاں سے جائیں ورنہ ناشتے کا انتظام کرتے کرتے لنچ ٹائم ہو جائے گا۔ جایئے جا کر کوئی اچھا سا کام کیجیے اور مجھے اپنا کام کرنے دیجیے۔''

''چلو ٹھیک ہے اب تو سچ مچ بھوک لگنے لگی ہے۔ تم بریک فاسٹ تیار کرو اگر تھوڑی دیر ناشتہ نا ملا تو مجھے یوں لگے گا I Am Fasting۔''

یہ کہتا ہوا کچن سے باہر چلا گیا۔

''اُف خدایا کتنا بولتے ہیں۔ ثمر کے سامنے بولے تو وہ پہلے سے زیادہ ناراض ہو جائیں گے اور جب تک یہ رہیں گے شاید پھر وہ اس گھر میں ہی نہیں آئیں گے۔'' وہ بڑبڑانے والے انداز میں خود کلامی کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

اچھا افشاں اب میں چلوں گی تم ہو ناں یہاں؟ میں رات کو آ جاؤں گی پھر تم Rest کرنے گھر چلی جانا۔''

چمن نے لاؤنج میں آ کر افشاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی سے اُس سے کہا۔

''بھابی کون سے گھر جانے کی بات کر رہی ہیں؟'' افشاں ذرا تذبذب کی کیفیت میں نظر آئی۔ چمن نے پہلے تو چونک کر دیکھا پھر سر جھکا کر کچھ سوچا پھر آہستگی سے نظریں اٹھائیں۔

''افشاں دیکھو تم سے سالوں کا تعلق ہے تم میری چھوٹی بہن ہی کی طرح ہو۔ تم مجھے لینے گھر آئیں میں نے سب کچھ بھلا دیا لیکن اب گھر تو میرا یہی ہے جہاں میرے باپ رہتے ہیں۔''

''تم مجھے لینے آئیں تھیں ثمر مجھے نا لینے آئے نا ابھی تک مجھ سے کوئی بات کی اور یہ اِس بات کا واضح اشارہ ہے کہ مجبوری کی وجہ سے انہوں نے میرا ہاسپٹل آنا برداشت تو کر لیا ہے لیکن اِس سے زیادہ...... وہ کچھ اور نہیں چاہتے بات جہاں ختم ہوئی تھی وہاں آ کر رُک گئی ہے۔ اس لیے تم پلیز بار بار اس بات کا ذکر نہ کرو جس بات کی اب نا کوئی حیثیت ہے اور نا اہمیت۔ میری قسمت میں جو لکھا ہے وہی پیش آیا ہے۔''

''Please۔'' چمن نے اب اپنے دونوں ہاتھ افشاں کے کندھے پر رکھ کر اُس کے کندھے آہستگی سے دبائے افشاں بہت دکھ کی کیفیت میں چمن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بھابی...... عورت کا دل بہت جلدی نرم ہو جاتا ہے...... اور آپ کو مرد کا پتہ ہی ہے نا اب اتنے دنوں بعد ملے ہیں ایک طرح سے دیکھا جائے تو بات ختم ہو گئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر ایک راستہ اور وسیلہ بنا دیا۔ شاید اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ دونوں کبھی جدا نہ ہوں اور آپ کو ایک دوسرے سے ملانے کا قدرت نے یہ بہانہ بنا دیا ہو۔''

افشاں اب بھی بہت امید کے ساتھ بات کر رہی تھی۔

''نہیں...... نہیں افشاں بس بہت ہو چکا اتنا زیادہ ہو چکا کہ اب ہم ایک دوسرے کو نہیں آزمائیں گے۔ کیونکہ دونوں طرف کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

چمن نے بالآخر وہ جملہ کہہ ہی دیا جو فی الحال وہ رو کے رکھنا چاہتی تھی۔

''بھابی ایسا نہ کریں دیکھیں آپ کی طرف سے تھوڑی سی نرمی کی گنجائش ہو گی تو دوسری طرف گنجائش خود بخود نکل آئے گی۔''

''آپ اتنی جلدی نا کریں ابھی تو امی Hospital میں ہیں اور آپ Hospital آ رہی ہیں۔ آپ دیکھیے گا ثمر بھائی آپ سے خود بخود بات کریں گے۔''

وہ اتنے بے حس بے ضمیر تو نہیں ہو سکتے آپ اُن کی ماں کا اتنا خیال کریں اور اُن پر کوئی اثر نہ ہو...... نہیں بھابی ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے سگے بھائی ہیں میں اُن کو اچھی طرح جانتی ہوں۔'' افشاں کا انداز اب منت کرنے جیسا تھا۔

چمن کے اندر پھر بے بسی کی کیفیت نے کسی بلا کی طرح پنجے گاڑھنا شروع کر دیے۔

افشاں اُس کی طرف بہت امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

چمن اپنی فطرت کے برخلاف اب بہت کچھ کہہ چکی تھی مزید کچھ کہنا اُس کے اپنے دل پر بوجھ بن جاتا۔ اس لیے دانش مندی کے ساتھ خاموشی اختیار کر لی گویا وہ اس لاحاصل بحث کو آگے بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

''بھابی قسم ہے آپ کو جب تک امی جان Hospital سے گھر نہیں جائیں گی آپ اُسی گھر میں رہیں

گی جو دنیا کی نظر میں ہی نہیں سچ مچ ابھی تک آپ ہی کا گھر ہے۔''
افشاں کی بات نے جیسے نئے سرے سے دل پر قیامت ڈھا دی تھی۔
اُسے اُس گھر میں گزاری ہوئی گزشتہ رات کا ایک ایک پل یاد آنے لگا۔ اُس نے رات کو جو اُس گھر میں دیکھا تھا محبت کی رسوائی کو بہت تھا۔
''وہ افشاں کو کیسے بتاتی کہ افشاں اُس گھر میں محبتیں اب دفن ہو چکی ہیں۔ روحوں کے تعلق اُس کی حد تک ہیں اور جس طرح سے میں نے اُس گھر میں رات کاٹی ہے یہ میں ہی جانتی ہوں......'' لیکن وہ کہہ نہ سکی۔
ماں کی شدید بیماری سے پریشان حال بیٹی کے ساتھ وہ اتنی بے رحم باتیں نہیں کرسکتی تھی۔
جو اُس کی طرف بڑی آس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ اُس کا دل کچھ چاہ رہا تھا۔
''افشاں خدا کے لیے مجھے اُس گھر میں جانے کا مت کہو وہ اب میرا گھر نہیں۔ محبتوں کا مدفن ہے جو شاید اُس کے اُس گھر سے نکلتے ہی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دفن کردی گئی تھیں۔''
''بھابی آپ ابھی یہاں بیٹھیں ڈرائیور فارغ ہو چکا ہوگا وہ آپ کو گھر چھوڑ دے گا اور ہاں میں ڈرائیور کو کہہ دوں گی وہ کچھ کھانے کے لیے بھی لیتا جائے گا۔''
''آپ اب' رات تک آرام کیجیے آپ کو پھر رات آٹھ بجے ڈرائیور لینے پہنچ جائے گا۔ تو آپ آجائیے گا پھر آپ یہاں رات کو رُک جائیے گا میں گھر چلی جاؤں گی۔ جب تک امی جان کی حالت نہیں سنبھلتی بس اسی طرح سے اِس کو Maintain کریں گے۔''
''ثمر بھائی کا بہت ہرج ہو رہا ہوگا۔ وہ کئی دن سے Office نہیں گئے یقیناً اُن کے ذہن پر بہت بوجھ ہوگا۔ ظاہر ہے اُن کی ذمہ دارانہ Job ہے۔ اُن کو تو وہ ٹینشن بھی بہت ہوگی...... سمجھ رہی ہیں نا آپ میری بات......''
چمن نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
''آپ بیٹھیں بھابی میں Driver کو فون کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے آتے آتے آدھا گھنٹہ تو لگ جائے گا۔''
یہ کہہ کر اُس نے اپنے شولڈر بیگ سے اپنا سیل فون نکالا اور ڈرائیور کو فون کرنے لگی۔
چمن اب بالکل خاموش تھی۔ یوں جیسے کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔
اقرار، انکار زندگی شاید انکار اور اقرار سے بہت بلند ہو چکی تھی۔ وہ ایک تعلق جو رگ جاں سے قریب تر تھا۔ قصہ پارینہ بننے جا رہا تھا۔
امید ٹوٹنے کا بھرپور اور مکمل یقین ہونے کے بعد...... انسان کی جان چھوٹ جاتی ہے۔
لاحاصل مشقت کا سلسلہ تمام ہو جاتا ہے...... پھر زندگی
''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں''
کی تفسیر بن جاتی ہے۔
امید سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ سرگرمی زندگی کو متحرک رکھتی ہے۔ جذبہ جگاتی ہے کل کا انتظار کراتی ہے۔

اپنی ذات سے پیار کرنا سکھاتی ہے۔ ایسے میں موت کا ذکر ڈراتا ہے۔ زندگی کا فسانہ لبھاتا ہے۔

اور جب دامنِ امید جھاڑ کر خالی ہاتھوں کو تکنے کا موسم آتا ہے تو موت پر غور وفکر کرنا بھی سب ضروری کاموں کی طرح کا ایک ضروری کام لگتا ہے۔

''اگر تم نے رُکنا تھا تو پہلے بتادیتیں میں گھر جا کر بچیوں سے مل لیتی...... امی کو بہت تنگ کر رہی ہوں گی...... انہیں اصل میں میری عادت پڑ گئی ہے۔ میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔''

بالآخر چمن کو ماں کے گھر جانے کا ایک مضبوط جواز مل گیا تھا۔

''بھابی...... میں تو یہ چاہتی ہوں امی جان کو ہر وقت یہ یقین رہے کہ آپ اُن کے پاس ہی ہیں۔ وہ آپ سے بات کر کے بہت خوش ہوتی ہیں۔'' افشاں کے جواب نے اُسے پھر بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

''یاور کے جانے کا Time تو Fix ہے مگر آنے کا اُن کا کوئی Time نہیں رات بھی بہت Late آتے تھے۔''

ربیعہ فردوس کے لیے چائے بنا کر کچن سے باہر آتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کیونکہ فردوس لاؤنج میں سامنے ہی صوفے پر ڈٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔

''ارے تو بیٹا! مردوں کے تو یہی کام ہیں۔ یاور کون سا نرالا کام کر رہا ہے۔ بہت محنت کرتا ہے میرا بچہ......''

''اب یہ تمہارا فرض ہے کہ تم اُس کا خیال کرو۔ رات کو تھکا ہارا آتا ہے اُس کے سر پر بادام روغن کا مساج کر دو...... پاؤں دبادو...... گرم گرم چپاتی ڈال کر دو۔''

فردوس نے بہو کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی طرف سے چند مفت مشورے عنایت کر دیے۔

''وہ تو ٹھیک ہے امی جان میرا مطلب یہ نہیں تھا ظاہری بات ہے اُن کا کام ہی ایسا ہے وہ تو انہوں نے شروع میں بتادیا تھا کہ میں جاتا ٹائم پر ہوں مگر آنے کا کوئی وقت نہیں ہے۔''

''تو پھر تمہیں یہ سب کچھ میرے سامنے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بھئی جب سب پتہ ہے تو بات کرنے کا مقصد......''

فردوس نے بھنویں تان کر ربیعہ کی طرف دیکھا تھا۔ کیونکہ اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ربیعہ یاور کے آنے جانے کا ذکر کیوں لے بیٹھی ہے۔

''امی جان یاور تو یہاں سے نکل کر بہت بزی ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں تو فارغ ہو جاتی ہوں نا میرے کام تو ایک طرح سے دیکھیے اُن کے آنے کے بعد ہی شروع ہو جاتے ہیں کچن میں سالن بنانا، دو تین روٹیاں ڈالنا یہ تو کوئی کام ہی نہیں ہے۔''

ربیعہ فردوس کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے اُن کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ فردوس حیرت سے اُس کی شکل تکنے لگیں۔ خاک پلے نہیں پڑا کہ آخر یہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

انہوں نے رُک کر انتظار کیا اور اس انتظار کو چائے کے ایک گھونٹ میں سمونے کی کوشش کی۔

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کسی دن آپ کے ساتھ جا کر اُن دونوں بچیوں کو یہاں لے آؤں گھر میں

بہت رونق ہو جائے گی اور مجھے بھی مصروفیت مل جائے گی۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو یاور کی بچیاں اب میری ہی ذمہ داری ہیں۔''

فردوس کو جیسے اچھو لگتے لگتے رہ گیا جلدی سے کپ میز پر رکھا اور اپنے دوپٹے سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے ربیعہ کی طرف دیکھا دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ ''اب اٹھ جاؤ ورنہ لگا دوں گی دو چار۔''

ربیعہ اُنہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ارے بیٹا تمہیں سوتیلی ماں کا تمغہ اپنے سر سجانے کا آخر کیوں شوق ہو رہا ہے۔ میں تمہیں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں کہ بیٹا تم اِن چکروں میں مت پڑو۔ یہ تو تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تم سوتیلی ماں کے امتحان میں پڑنے سے بچ گئیں اور بچیاں اپنی نانی کے پاس پل رہی ہیں تمہیں کاہے کو اتنی فکر ہے اُن کی۔ مجھ سے یایاور سے زیادہ تمہیں اُن کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔''

فردوس نے بہت سنبھل کر ربیعہ کو ایسا جواب دینے کی کوشش کی جس سے وہ مطمئن ہو جائے۔

''امی جان میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ بچیوں کی پرورش ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہی، نانا، نانی، دادا، دادی پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں پر جان دیتے ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہ رہی تھی کہ بچیاں اِس گھر میں آجائیں۔''

''اب یہ اس وقت دیکھیے کتنا سناٹا ہے گھر میں صرف واشنگ مشین چلنے کی آواز آرہی ہے۔ ہمارے گھر میں جو عورت کام کرنے آتی ہے وہ بھی اتنا کم بولتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے ورنہ کام والیوں کا تو آپ کو پتہ ہی ہے Gate میں قدم رکھتے ہی پورے محلے کی کہانیاں سنانا شروع کر دیتی ہیں۔''

''ارے تو بیٹا پھر ایسا کرو اس کام والی کو یہاں سے نکالو اور کوئی باتیں کرنے والی کو بلالو...... بہت رونق لگے گی گھر میں۔''

فردوس کی جیسے یہ ساری باتیں سنتے ہوئے جان جل کر خاک ہو رہی تھی اور جان جلنے کا واحد سبب یہ تھا کہ ربیعہ نے پھر اُن کی پوتیوں کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ جن سے وہ جان چھوٹنے کی خوشی منا رہی تھیں۔ اور اُس خوشی میں نئی نویلی بہو کرکری ڈال رہی تھی۔

یہ خوشی کیا کم تھی کہ لاکھوں کے خرچے نانا نانی کے سر پڑ گئے اور اُن کی جان بچی۔

''دیکھو بیٹا میں تمہاری بڑی ہوں ایک مشورہ دوں ...... برا مت ماننا۔''

فردوس نے چائے کا کپ اُٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے اور دوبارہ سے شروع ہو گئیں۔ ربیعہ نے بڑی سادگی سے اُن کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

''امی جان آپ میری ماں ہیں میں کیوں آپ کی بات کا برا مانوں گی اور آپ مجھے مشورہ دے رہی ہیں.....کوئی گالی تو نہیں دے رہیں، جی کہیے۔''

ربیعہ نے پھر اظہارِ محبت کیا جس کی دوسری طرف قطعی ضرورت نہیں تھی۔

''دیکھو بیٹا آج کل T.V پر چھ سات Cooking Channel آرہے ہیں تم وہ چینل دیکھ کر اچھے اچھے کھانے تیار کرنے کی ترکیبیں نوٹ کیا کرو اور یہ آلو گوشت، قیمہ فرائی، دم کا قیمہ، شامی کباب سے

ہماری جان چھڑاؤ اور کچھ نئی نئی چیزیں بنا کر کھلاؤ...... یہ مصروفیت بھی بہت ہے۔''
ربیعہ نے حیرت سے فردوس کی طرف دیکھا تھا۔
''امی جان کچن میں انسان کتنی دیر کھڑا رہ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ...... دو گھنٹے باقی تو سارا دن پڑا ہے۔''
''تو بیٹا وہ بچیاں بھی اگر آ گئیں تو صبح کے ٹائم اسکول چلی جایا کریں گی گھر میں تو اُسی طرح سناٹا ہوگا۔ رونق ہوگی تو شام کو ہوگی جب وہ سو کر اٹھیں گی اور اُن کے دادا بھی گھر پر ہوں گے۔''
''ابھی تو انہوں نے اللہ اللہ کر کے ایک ٹھیکے دار کے پاس جانا شروع کیا ہے اسے پارٹ ٹائم اکاؤنٹنٹ کی ضرورت تھی۔ یہ کہنے لگے۔ سارا دن میں گھر میں پڑا بور ہوتا ہوں چلو 15'20 ہزار بھی مل جائیں گے تو ہم دونوں کے لیے بہت ہیں۔''
''ماشاء اللہ یاور تو اپنا کمار ہا ہے بھئی ہم بیٹے کی کمائی پر نظریں جمانے والے لوگ نہیں۔ اللہ میرے مرد کو سلامت رکھے اتنا لا کر دیتا ہے کہ ہم سے برتا بھی نہیں جاتا۔ شکر ہے اللہ کا......'' فردوس نے بہت شکر گزاری کے جذبات لہجے میں سمو کر کہا اور چائے کے گھونٹ لینے لگی جو کے تقریباً ٹھنڈی ہو چکی تھی۔
ربیعہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جب وہ بچیوں کا ذکر کرنے بیٹھتی ہے تو فردوس اُن بچیوں کا نام سنتے ہی دوسری باتیں کرنا کیوں شروع کر دیتی ہیں۔
''اچھا بیٹا جاؤ اور ایسا کرو آج کچے قیمے کے کباب بنالو...... ساری چیزیں کچن میں موجود ہیں اور دال چاول بنا لینا۔''
''تمہارے سسر کو دال چاول کے ساتھ کچے قیمے کے کباب کھانا بہت پسند ہے۔ دوپہر کو آئیں گے تو اپنی مرضی کا کھانا دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اور تمہیں دعا دینگے۔ اللہ تمہاری گود بھرے تمہیں اپنی اولاد دے...... چاند سا بیٹا دے۔''
''چند مہینوں کی بات ہے بیٹا گھر میں رونق ہو جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو میرے یاور کو تمہارے ذریعے سے اپنا وارث ملے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ بہت جلد میرے گھر کے آنگن میں خوشیاں برسیں گی۔''
''بھئی ہم نے کبھی کسی کا برا نہیں کیا برا نہیں چاہا تو ظاہری بات ہے ہمیں بھی اللہ وہ خوشیاں ضرور دے گا جن کا ہمیں مدتوں سے انتظار ہے۔''
''بھئی ڈرے تو وہ جس نے کسی کے ساتھ برا کیا ہو ہمارے تو ہاتھ صاف ہیں۔''
''اللہ بخشے جانے والی تو دم بھرتی تھی ہمارا کہتی تھی کہ امی جان مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ میں اپنے ماں باپ سے دور ہو گئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ بس ایک خوشی کا انتظار ہے کہ اللہ میرے یاور کو چاند سا بیٹا دے۔''
''پتا ہے کیوں اس خاموشی اور تنہائی سے گھبرا جاتی ہو یہ تھوڑے دنوں ہی کی بات ہے۔ ارے تمہاری گود میں تمہارا اپنا بیٹا کھیلے گا تو تمہیں سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملے گی۔
''لاکھ ہم آوازیں دیں گے ایک گلاس پانی پلا دو یا ایک کپ چائے بنا دو تو تمہاری آواز آنا شروع ہو جائے گی۔''

’’امی جان ابھی آتی ہوں اس کو فیڈ کرا رہی ہوں...... ابھی میں اِس کا Diapeer Chang کر رہی ہوں...... امی جان میں یہ کر رہی ہوں...... وہ کر رہی ہوں ارے تم اتنا اُلجھو گی تم سوچ نہیں سکتیں کہ بچہ کتنا بڑا کام ہوتا ہے۔ 24 گھنٹے کا کام ہوتا ہے پھر تو تمہیں نا بچیاں یاد آئیں گی نا یہ ماں باپ کے گھر بار بار چکر لگانے کا خیال آئے گا۔‘‘

’’بچیوں سے میری فون پر بات چیت ہو جاتی ہے کبھی کبھی میں تمہارے سسر کے ساتھ چکر بھی لگا لیتی ہوں۔ ماشاء اللہ بہت خوش ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نانا نانی کے دل بہلا رہی ہیں۔‘‘

’’ارے دیکھو ناں اولاد کی جدائی کا غم کوئی چھوٹا غم تو نہیں ہوتا اُن کے کلیجے پر جو زخم لگا ہے یوں سمجھو کہ اس وقت وہ بچیاں نانا نانی کے زخم کا مرہم بن گئی ہیں بہت خوش ہیں۔‘‘

’’میری شکل دیکھتے ہی ڈر جاتے ہیں کہتے ہیں کہ بس آپ سو دفعہ ملنے آئیں۔ بچیوں کو یہاں سے لے جانے کی بات نہ کریں۔‘‘

’’اب تم ہی سوچو میرے پاس بہت بہلاوے ہیں۔ میرا بیٹا ہے میری بہو آ گئی ہے۔ اللہ نے چاہا میرے آنگن میں بچے بھی کھیلیں گے۔ اُن بے چاروں کے پاس کیا ہے۔ دو بیٹیاں ہیں...... ایک اپنے گھر میں مصروف رہتی ہے بہت خوش ہے اپنے گھر میں......‘‘

’’دوسری کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا جو اُس کی رضا...... میں تو ان دونوں میاں بیوی کی شکل دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں چلو ان بچیوں ہی کی وجہ سے کم سے کم اُن کا دل تو بہلا رہتا ہے۔ بس میرا دل نہیں مانا میں یہ ظلم نہیں کر سکتی اب میں اُن پر...... اولاد تو اُن کی چلی گئی اب بچیوں کو بھی اپنے پاس لے آؤں...... اور سچی بات بتاؤں میں تمہیں بچیاں بھی نانا نانی کی عادی ہو گئی ہیں۔‘‘

فردوس نے ایک سانس میں پورا اخبار پڑھ کر سنا دیا اور اس تواتر سے بولیں تاکہ اب ربیعہ اُس موضوع پر بات کرنے کا سوچے بھی نہیں اور اپنے کام میں لگ جائے۔

اور یہی ہوا ربیعہ اتنی لمبی تقریر سننے کے بعد کھڑی ہو گئی تھی۔

’’ٹھیک ہے امی جان...... جیسے آپ لوگ بہتر سمجھتے ہیں ویسے کیجیے میں نے تو بس ویسے ہی کہہ دیا تھا کہ بہرحال اصل گھر بچیوں کا تو یہی ہے نا...... لیکن چلیں ٹھیک ہے...... لیکن اب اگر آپ اُن سے ملنے جائیں تو مجھے ضرور لے کر جایئے گا۔‘‘

’’یاور کو صرف سنڈے کی چھٹی ہوتی ہے اور وہ ریسٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں فرمائش کروں کہ یہاں لے کر چلیں وہاں لے چلیں۔‘‘

’’یہ تو تم بہت اچھا کرتی ہو۔‘‘ فردوس نے جھٹ کہا۔

’’بیٹے اُسے پریشان کرنا بھی نہیں اُس کی بہت سخت ڈیوٹیاں لگتی ہیں...... ارے میرا بیٹا بالکل نچڑ کے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ کسی کی جیب سے پیسے نکلوانا کوئی مذاق بات ہے۔ پرائیویٹ نوکریوں کا تو تمہیں پتا ہی ہے، سیٹھوں کا بس نہیں چلتا کہ خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیں۔‘‘

’’بس تم اُس کا خیال رکھو سمجھو تم نے ہمارا بھی حق ادا کر دیا۔ ہم تمہیں اپنے کاموں سے آواز نہیں دیں گے۔ جو تم خوشی سے کر دو گی تمہارا شکریہ۔ بس اللہ ہمیں بہت جلد چاند سے بیٹے کی شکل دکھائے ارے ہم تو

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چوالیس (44) برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کررہی ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ...... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ...... پوری دنیا میں پھیلے' اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ...... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں' جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: ماہنامہ دوشیزہ کراچی

88-C II ۔فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

تمہیں اپنے سر پر بٹھائیں گے اور بٹھا رہے ہیں اگر تم سے کوئی اونچا نیچا بول دیں...... تو بس یہ سوچ لینا کہ ہم تمہارے بڑے ہیں۔ تمہارے ماں باپ کی طرح ہی ہیں۔''

''جی امی جان...... وہ تو میں سوچتی ہوں کہ ماں باپ تو اب بہت دور ہیں۔ آپ ہی میرے ماں باپ ہیں اور پھر آپ صبح اٹھتے ہیں مجھے کتنی دعائیں دیتی ہیں...... یقین کریں مجھے بہت اچھا لگتا ہے شروع شروع میں تو میرا دل چاہتا تھا کہ میں جلدی جلدی امی سے ملوں لیکن اب اس گھر سے جاتے ہوئے کئی بار سوچتی ہوں...... آپ لوگوں نے مجھے جو اتنا پیار و محبت دیا ہے نا...... وہ بہت کم لڑکیوں کو ملتا ہے۔''

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں...... میں کتنی خوش نصیب ہوں۔'' ربیعہ ساس کے ساتھ لاڈ ڈلار کرنے لگی۔ چونکہ اُس نے ابھی تک ساس کے منہ سے اپنی نیکیوں اور عظیم کارناموں کے...... کچھ نا سنا تھا اُس کے ساتھ بہت اچھی چل رہی تھیں اِس لیے کسی گواہی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

''اس بے خبر کو کیا خبر تھی کہ اگر پوتے کی بجائے پوتی اُن کی گود میں ڈال دی تو یہی جان نچھاور کرنے والی ساس سسرا اپنے بیٹے کی شاید تیسری شادی کا سوچنے لگیں۔

''اللہ کرے...... جتنی خوش نصیب تم ہو...... اتنے ہی خوش نصیب ہم بھی ہوں...... تم سے خاندان کا نام آگے چلے۔ جس دن چاند سا پوتا گود میں لوں گی اس دن یقین آئے گا کہ ہمارے نصیب بھی بہت بلند ہیں۔'' فردوس کا انداز سمجھ سے بالاتر تھا۔ نہ طنز' نہ تلخی' نہ پیار' نہ اپنائیت...... کسی روبوٹ کی طرح بول رہی تھیں۔ شاید حد درجہ احتیاط کی وجہ سے کہ ربیعہ کسی بات سے کھٹک نہ جائے۔

''یہ کیا بات ہوئی...... بیٹا بیٹی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔'' ربیعہ اپنی فطری سادگی کے بموجب کہہ رہی تھی۔

فردوس کے اندر آتش فشانی کے جذبے سر ابھارنے لگے۔ جی چاہا دھکا دے کر آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیں۔

ایسی منحوس باتیں کرنے سے اچھا ہے للو چپو کرتی رہے جو ماں نے سکھا کر بھیجا ہے۔ گُنوں پوری میٹھی چھری سے حلال کرتی ہے۔

''اچھا بیٹا...... جاؤ اپنے کام بڑھاؤ...... دن چڑھتا جا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر کی کھولن دباتی ربیعہ سے پہلے چل پڑیں۔

☆......☆......☆

''میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا عطیہ بیگم اِس رشتے میں بہت گنجائش ہوتی ہے...... ہوسکتا ہے کہ آہِ سحر گاہِ دعائے نیم شبی اپنا کام دکھا رہی ہو دیکھو نا اگر چمن کو یہاں کوئی گنجائش نہ نظر آتی تو وہ رات کو یہاں اُس گھر نا جاتی۔''

مشکور احمد صبح کا تازہ اخبار اپنے سامنے پھیلائے ناک کی نوک پر نظر کی عینک ٹکائے عطیہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

عطیہ بیگم جو تھال بھر کے مٹر لیے بیٹھی تھیں اور بچیوں کے لیے چائنیز بنانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ ایکدم جیسے ہتھے سے اُکھڑ گئیں۔

''مشکور صاحب اب بس بھی کریں۔ تماشا بنا کر رکھ دیا ہے انہوں نے میری بچی کا...... اپنا مطلب پڑا ہے تو پاؤں چھو کر لے گئیں اگر اُن کے دلوں میں گنجائش ہوتی ...... میں بانو آپا کی بات نہیں کر رہی وہ تو بے چاری اس وقت خدا سے زیادہ قریب ہیں اور ہم خدا سے بہت دور ہیں۔ آپ خود بتائیں اگر گنجائش ہوتی تو ثمر اپنی بہن کو بھیجتا خود نا آتا۔''

عطیہ بیگم کو ابھی تک یہ بات کھل رہی تھی کہ اتنے دنوں کی سرد جنگ کے بعد ثمر نے بہن کو لینے کے لیے بھیجا...... آخر کیوں چمن اُس کی نگاہ میں ہے تو وہ خود اُسے لینے آتا۔

''بات یہ نہیں ہے عطیہ بیگم...... بات یہ ہے کہ معاملات بہت بگڑے ہوئے تھے اور آپ کو تو پتہ ہے...... ثمر نے تو مجھے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ چمن کو اب دوبارہ اِس گھر میں بسانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے اُس کو اِدھر آتے ہوئے حیاء تو اُسے روکے گی نا...... ایسے ہی کہے ہوئے جملوں کا سامنا کیسے کرتا۔ کوئی تو بہانا ہوتا ہے اگر اُس کے پاس گنجائش نہ ہوتی تو وہ بہن کو بھی نا بھیجتا سختی سے منع کر دیتا۔

مشکور احمد نے پھر دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی جن کا عطیہ بیگم پر مطلق اثر نہ ہوا۔

''آپ ابھی تک وہی کہانی لیے بیٹھے ہیں ارے بھئی میں تنگ آ گئی ہوں...... آپ سوچ نہیں سکتے میں نے کیا کچھ سوچ لیا تھا۔ میں تو چاہتی ہی نہیں تھی کہ اب چمن دوبارہ اُس گھر میں جائے یا اُس گھر سے ہمارے ہاں کوئی آئے۔''

''میری بیٹی میں کوئی کمی نہیں ہے آج بھی اُسے ایک سے ایک رشتہ مل سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دوسری شادی نا کرنا چاہے۔ لیکن ہم تو اپنا فرض ادا کرتے ہوئے دباؤ ڈال کر اُس کو سمجھاتے...... لیکن ثمر کے لیے میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' عطیہ بیگم نے دوٹوک الفاظ میں بات کی۔

''عطیہ بیگم بات شادی کی نہیں ہے عورت کے لیے طلاق کے بعد دوسری شادی بڑا امتحان ہوتی ہے۔ اُس کو پہلے سے زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتا ہے۔ ثابت کرنا ہوتا ہے زندگی بھر کہ اُس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ بس قدرت نے شاید اُس کو آزمایا تھا۔''

''آپ بہت آرام سے بات کر لیتی ہیں کہ اُس کی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔ اُس کو رشتوں کی کمی نہیں ہے۔''

''یہ کوئی مذاق ہے۔ ایک عورت کی زندگی کا صحیح معنوں میں تماشا تب ہی بنتا ہے جب وہ ایک مرد سے نکل کر دوسرے مرد کے نکاح میں چلی جاتی ہے۔ بہت بڑی آزمائش ہے۔ بہت بڑی روحانی اذیت مشکور احمد نے پھر عطیہ بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ چمن کے ساتھ زیادہ وقت عطیہ بیگم کا گزرتا ہے اور چمن اُن کی باتیں سن سن کر ایسا فیصلہ کر سکتی ہے جو آنے والے دنوں میں بجائے سکون دینے کے مزید کسی تکلیف دینے کا باعث بن جائے۔

''آپ اپنے فارمولے کلیئے رکھیں اپنے پاس آج تک میں آپ کی ہر بات سر جھکا کر سنتی رہی ہوں۔ ہر بات مانتی ہوں اس لیے کہ آپ مرد ہیں میرے شوہر ہیں اور ماشاء اللہ بہت سوجھ بوجھ کی باتیں کرتے

ہیں۔ لیکن میں اپنی بچی کا تماشا نہیں بننے دوں گی۔ چھوڑ دیجیے یہ کہ دوسری شادی عورت کی آزمائش ہوتی ہے تکلیف ہوتی ہے اور اذیت ہوتی ہے۔''

''رہنے دیں آپ...... کیا دنیا میں عورتوں کی دوسری شادی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ تو میں نے دیکھا ہے دوسری شادی کے بعد عورت بہت پُرسکون زندگی گزار رہی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اُس کی پچھلی تکلیفوں کا ازالہ کر دیتا ہے اُس کو سکون مل جاتا ہے۔''

''اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے اس دنیا میں ڈاکٹر علی سے آپ مل چکے ہیں مجھے بتائیں اُن میں کوئی کمی جو آپ کو دکھائی دیتی ہو جس سے یہ پتا چلے کہ اُس کی بیوی اُسے کیوں چھوڑ کر گئی تھی۔''

عطیہ بیگم ابھی مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ مشکور احمد نے انہیں درمیان میں ٹوک دیا۔

''بات کیا ہو رہی ہے آپ ڈاکٹر علی کا ذکر لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ اچانک آپ کو ڈاکٹر علی کا خیال کیوں آ گیا۔''

مشکور احمد اپنی صابرانہ فطرت کے بموجب ابھی تک بہت حلیم انداز میں بات کر رہے تھے۔ عطیہ بیگم کی شدید تنقید نے بھی اُن کے مزاج پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

''اس لیے ذکر کر رہی ہوں کہ ثمر نے میری بیٹی کو بہت تکلیفیں دی ہیں۔ جتنی وہ دے سکتا تھا وہ سب دے دیں کوئی کمی نہیں چھوڑی آج اُن کا اپنا مطلب پڑا تو میری بیٹی کو بلا کر لے گئے۔ جب ماں ٹھیک ہو جائے گی پھر وہی سلسلے شروع ہو جائیں گے۔ بس اب مجھ میں مزید کچھ سہنے کی ہمت نہیں اور رہی ڈاکٹر علی کی بات تو اِس وجہ سے ہی میں نے ڈاکٹر علی کا ذکر کیا کہ ڈاکٹر کی بیوی اُن کو چھوڑ کر جا چکی ہے۔ اگر چمن کی جان ثمر سے چھوٹ جائے تو ڈاکٹر علی کے لیے بھی سوچا جا سکتا ہے۔''

''یعنی کے حد ہو گئی...... '' اب مشکور احمد نے درحقیقت ہلکی سی برہمی کا مظاہرہ کر ہی دیا تھا۔

''سوت نا کپاس اور گولی سے کٹھم لٹھا' آپ ڈاکٹر علی کے بارے میں اتنی دور کی سوچنے لگیں۔ نا آپ کو اپنی بیٹی کی خواہش کا پتہ نا ڈاکٹر علی کی طرف سے اِس طرح کی کوئی بات آ سکتی ہے۔ ظاہر ہے دنیا کی طرح ڈاکٹر علی کو بھی پتا ہوگا کہ چمن شادی شدہ ہے اور حال ہی میں اُس کو یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ اُس کی ساس بیمار ہے اور اس وجہ سے وہ Hospital کے چکر لگا رہی ہے۔''

مشکور احمد کو عطیہ بیگم کی بات پر درحقیقت بہت ہی زیادہ حیرت تھی۔

''مشکور صاحب جب اللہ بیٹیاں دیتا ہے نا تو ماں کو سب سے پہلی فکر یہ ہی ہو جاتی ہے کہ ایک دن اِن کو اِن کے گھر کا کرنا ہے۔''

''مائیں تو اِسی طرح سوچتی ہیں۔ ڈاکٹر علی میں مجھے وہ سب کچھ نظر آیا جو ایک اچھے انسان میں ہونا چاہیے۔ وہ بے چارے اپنی معذور بہن کو سنبھال رہے ہیں اگر کوئی عورت اُن کے ساتھ ہمدردی سے محبت سے انسانیت سے چلنے کی نیت کرے تو وہ اس کی بہت قدر کریں گے۔''

''اور ہماری بیٹی ناقدروں، ناشکروں کے ہاتھوں دکھ اٹھا کر ہمارے پاس لوٹائی گئی ہے۔''

عطیہ بیگم کے انداز سے لگتا تھا اُن کے دل میں اب ثمر کے لیے ذرہ برابر گنجائش نہیں۔

''عطیہ بیگم...... حالات بدلنے جا رہے ہیں...... با نو آپا کو اپنے کیے پر ندامت ہے تو کیا ثمر کو احساس

شام کے بعد

عجیب بات ہے شام کے وقت بجلی کی روشنی کے باعث غروب آفتاب کو کوئی نہیں پہچانتا۔ پر ہمارے اندر رہنے والے پتھر اور دھات کے زمانے والے انسان کے ساتھ بہت کچھ بیت جاتی ہے۔ شام کا انسان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ آج بھی اپنی اپنی جان کو کندھے پر مشکیزے کی طرح لٹکائے سب شہری لوگ پناہ کی طرف بھاگتے ہیں۔ سب شام سے بدکتے ہیں۔ اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔ شام کو بسوں کا رنگ تانگوں کی رفتار کاروں کا مزنا دکانوں کے شوکیس سائیکلوں کی گھنٹیاں رکشہ کے گیئر سب سارا شہر خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگتا ہے یہ سب شام کو اجالنے کا عمل ہے کیونکہ شام رات سے زیادہ غمگین ہوتی ہے۔ رات آنے سے پہلے لحاف کی کوکھ میں چھپنے سے پہلے اور نیند کے گھٹنے پر سر رکھنے سے بہت پہلے سب ذی روح سورج سے بچھڑنے کا سوگ کرتے ہیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے زمین کا روشن حصہ ہر روز شعلہ رو ہو کر سلگتا ہے۔ پھر اس کے کناروں کو آگ لگ جاتی ہے۔ جیسے ستی ہونے والی عورت کے پلو آگ پکڑ لیں۔ بچھڑنا رفتہ رفتہ یقین ہو جاتا ہے تو شام بیراگنوں جیسا لباس پہن لیتی ہے جیسے بجھتی ہوئی راکھ ہو۔ روشنی رہتی ہے لیکن نور نہیں رہتا۔ یہ وقت شام کے سے ہر شخص کے لیے بڑا دشوار اور اداس ہوتا ہے۔ لوگ دفتروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ عورتیں گھر چھوڑ کر دہلیزوں، پھاٹکوں اور دروازوں پر جا رکتی ہیں۔ بوڑھے سیر کا بہانہ بنا کر چار دیواری سے باہر بھاگنا چاہتے ہیں۔ بچے پارکوں سے گراؤنڈ سے بھاگ کر ماؤں کی طرف سرپٹ آتے ہیں۔ سب وہاں نہیں رہنا چاہتے جہاں وہ پہلے موجود ہوتے ہیں۔ انسان کی سائیکی سے نباتات کی روئیدگی سے جانداروں کی نشوونما سے جمادات کی پوشیدہ طاقت و پختگی کے ساتھ ہواؤں، سمندروں، چاند ستاروں سے سورج کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ شام کے وقت عجیب قسم کی خاموشی ٹھہر ٹھہر کر وارد ہوتی ہے۔ بولتے ہوئے چہرے اجتماعی گونگے پن سے نجات حاصل کرنے کے لیے بولتے چلے جاتے ہیں اور خاموش لوگ اور اندر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ لوگ الگ الگ محسوس کرتے ہیں۔ ان کا یہ احساس کہ وہ مجلس میں رہ کر کس قدر تنہا ہیں۔ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

(بانو قدسیہ کی تحریر سے راز عدن۔ بحرین کا انتخاب)

نہیں ہوگا؟''

''وہ ماں ہی کی وجہ سے متنفر ہوا نا؟''

''جب ماں نے کھلے دل سے اپنی کوتاہیاں مان لی ہیں تو سارے جھگڑے ہی ختم......''

''نہیں ختم...... میری بیٹی کو دکھ دے دے کر انہوں نے نڈھال کر دیا۔ اب نہیں جائے گی۔'' عطیہ بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔

یہ اُن کا مزاج نہیں تھا۔ مگر شاید اولاد مزاج پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

وہ آپ کے Dear Husband تشریف لے آئے ہیں۔ ارسلان نے گھر میں داخل ہو کر پہلے بیڈروم میں جھانکا۔ بستر تو خالی نظر آیا لیکن اُس کی نظریں واش روم کے بند دروازے کی طرف تھیں۔ بہت محتاط انداز میں چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

''آپ کو میرے Dear Husband کی بہت فکر ہے...... میرا Husband ہے مجھے فکر ہونی چاہیے آرام سے بیٹھ جائیں۔'' ندا نے اُسی پھکڑ پن سے کہا۔ ہانڈی میں چمچ چلانے کے بعد ہانڈی کے کنارے پر چمچ زور زور سے جھٹکنا شروع کر دیا......

وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔

ارسلان گھر Sale کرنے کے سلسلے میں اسٹیٹ ایجنسی چلا گیا تھا۔ صفائی کرنے والی صفائی کر کے جا چکی تھی۔ ندا نے سوچا ارسلان کسی بھی وقت آ سکتا ہے میں کم از کم کھانا بنا کر رکھ دوں۔

''بھئی تمہارا Husband ہے تو میرا بھی کچھ لگتا ہے۔ مجھے بھی فکر ہونی چاہیے۔ صبح لڑ جھگڑ کے تم سے گیا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ پتہ نہیں کتنے دن ناراض رہے گا جتنے دن ناراض رہے گا اتنے دن تمہارا موڈ خراب رہے گا۔ اور میں کسی خراب موڈ والی عورت کے ساتھ چند گھنٹے بھی گزارا نہیں کر سکتا۔''

''Language Please۔'' ندا کچن سے باہر آ کر ارسلان کو گھورتے ہوئے بولی۔

''میں عورت نہیں ہوں۔'' ارسلان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''پہلے تو مجھے شک تھا لیکن کیونکہ اب تم اپنے منہ سے اقرار کر رہی ہو...... پکا یقین ہو گیا بھئی اس بات کا کہ تم واقعی عورت نہیں ہو۔''

''مجھے تو کسی اور Planet کی مخلوق لگتی ہو...... لگتا ہے تم Mercury کی سرزمین پر پیدا ہوئیں تھیں اور غلطی سے تیز تیز چلتے ہوئے ہمارے Planet پر آ گئی ہو۔ عقل نام کی تو کوئی چیز نہیں ہے تمہارے پاس اور اِس سرزمین پر رہنے کی شرط یہ ہے کہ انسان میں تھوڑی سی تو عقل ہونی چاہیے۔''

ارسلان نے اپنی بات کے اختتام پر زبردست قہقہہ لگایا۔

ندا غصے میں بھری ہوئی اُس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ جب سے آئے ہیں مجھے بے وقوف احمق، Foolish، Stupid پتا نہیں کیا کیا کہہ چکے ہیں۔ آ کر آپ کو مسئلہ کیا ہے۔''

''میں تو کہوں گا۔'' ارسلان نے اُس کے غصے سے ڈرنے کے بجائے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''کیوں کہیں گے اگر میرے Husband نے سن لیا تو بڑی زبردست لڑائی ہو جائے گی۔''

''مجھ سے لڑ کر تو دیکھے میں شرطیہ کہتا ہوں وہ مجھ سے نہیں لڑ سکتا میں تمہیں کچھ بھی کہہ دوں اُس کی مجال نہیں کہ میرے سامنے وہ بولے۔''

''وہ بول سکتے ہیں اُن کا غصہ بہت تیز ہے...... آپ کو پتا نہیں ہے۔''

''پتا چل چکا ہے دیکھ لیا ہے میں نے مہمان کو ذلیل کر کے نکل گئے۔''

''یار اتنی دور سے بیوی کا کزن آیا ہے۔'' ارسلان نے آخری الفاظ بڑبڑانے کے انداز میں کہے۔

''توبہ ہے...... ارسلان بھائی آپ تو دل پر ہی لے گئے۔ چلیں خیر میں اب کوئی وضاحت نہیں کروں گی اور ہاں آپ بھی سن لیجیے آپ مجھے احمق کہیں Foolish کہیں Stupid کہیں جو مرضی کہیں...... آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا اگر میرے پاس عقل کی کمی ہوتی تو ثمر جیسا بندہ کبھی شادی نہ کرتا اور پتا ہے آپ کو انہوں نے مجھ سے اس وجہ سے شادی کی ہے کہ انہیں مجھ سے عشق ہو گیا تھا محبت کرتے ہیں مجھ سے......''

ندا نے بڑے فخریہ انداز سے ایک طرح سے انوکھی خبر سے مطلع کیا تھا۔

ارسلان نے اب قدرے سنجیدگی سے ندا کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے لگتا تھا...... کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے......

ندا اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اِس طرح کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''میں یہ دیکھ رہا ہوں اپنے آپ کو کوئی بے وقوف نہیں کہتا...... سامنے بیٹھنے والے شخص کو پتا ہوتا ہے جو شخص یا خاتون اُس کے سامنے بیٹھی ہے اُن میں کتنے Grambrain پایا جاتا ہے۔''

''Maximum 15 گرام Brain سب کے پاس ہوتا ہے۔ تمہارے پاس مجھے Sorry To Say شک ہے کہ 2 گرام Brain ضرور ہوگا۔ کیونکہ جس لڑکی کے پاس 2 گرام Brain ہو اُسی کو کوئی شادی شدہ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیے بغیر بے وقوف بنا سکتا ہے۔''

ارسلان نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اپنا تجزیہ پیش کیا تھا۔

ندا تھپ سے اُس کے مقابل بیٹھ گئی آپ کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔ آپ میرے Husband کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟

''اس لیے کہ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے دنیا دیکھی ہے۔ جب کوئی شادی شدہ مرد اپنی بیوی کو طلاق دیے بغیر خوبصورت UnMarried لڑکی سے عشق بگارتا ہے تو وہ...... بڑا ایسا سی آدمی ہوتا ہے عام آدمی نہیں ہوتا۔ اور میں Guarantee سے کہتا ہوں کہ وہ غصے کا بہانہ کر کے اپنے گھر گیا ہے جہاں اُن کی پہلی بیگم صاحبہ بہت دل و جان سے اُن کی خدمتیں کرنے میں مصروف ہوں گی اور وہ انہیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلا رہے ہوں گے کہ وہ دنیا کی واحد خوش نصیب عورت ہیں، جن کو اتنا چاہنے والا شوہر ملا ہے۔''

''اُف توبہ...... بس بھی کریں اتنی دیر سے بجے جا رہے ہیں۔ ثمر اُن خاتون کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔''

''ابھی تک انہوں نے Divorce نہیں دی لیکن اپنے Cell سے اُن کا نمبر Delete کر دیا ہے۔ اگر اُن کے درمیان کوئی Contact ہوتا تو وہ اُن کا نمبر Delete نہ کرتے۔

ندا نے کسی منجھے ہوئے وکیل کی طرح اپنی دانست میں بہت بڑی دلیل دی تھی۔

''ایک بہت پتے کی بات بتاؤں...... میں چلا جاؤں گا مگر تمہارے بہت کام آئے گی......'' ارسلان نے اُٹھ کر بڑا سا دریچہ وا کرنے کے لیے بہت زور لگا کر چٹخنی گرائی۔ مدتوں بند رہنے کی وجہ سے چٹخنی بھی جام ہو رہی تھی۔

دریچہ کھول کر اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو دھول مٹی سے آلودہ ہو گئے تھے۔

''جلدی سے بتا دیں...... مجھے بہت کام کرنا ہیں...... آپ کو تو خالی باتیں ہی کرنا ہیں۔ مسلسل پیارے شوہر پر تنقید کر رہا تھا ایسے کزن سے تو 'بے کزن' ہی بھلی۔ طبیعت میں تکدر پیدا ہو رہا تھا۔

''یہ تو عیاش اور فلرٹ مرد ہوتے ہیں ناں...... ان کے پاس کمال کا آرٹ ہوتا ہے۔''

''ایک وقت میں بائیس خواتین کو خوش رکھ سکتے ہیں۔ اُن میں ہر ایک اپنے روم میں بیٹھی خود دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی ہوتی ہے۔'' اپنی بات کے اختتام پر ارسلان نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا تھا۔

''آخر آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں اپنے ہزبینڈ کو برا سمجھوں، کیوں دشمن بن رہے ہیں اُن کے......''

''اب میں اُن کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کروں گی۔ So Please Stop۔'' ندا

نے ہاتھ بلند کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''مجھے تمہاری فکر ہے۔'' ارسلان نے کچھ کہنا چاہا مگر ندا نے فوراً اُس کی بات کاٹ دی تھی۔

''مت کریں میری فکر...... I Am Satisfied ۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل پڑی۔ اسے تو ارسلان کی باتوں سے جان چھڑانا تھی۔ اسے خود نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کرنے جارہی ہے۔

''نانا جان تھے تو ہمیں تمہاری کوئی فکر نہیں تھی۔ مگر میرے یو ایس واپس جانے کے بعد تم اب یہاں بالکل اکیلی ہو...... تمہیں حقیقت پتہ کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی بیوی کو Divorce کیے بغیر آخر دوسری شادی کیوں کی؟''

''میرے کان آٹومیٹک بند ہوگئے ہیں ارسلان بھائی مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ وہ گھر کے عقب میں دھلے کپڑے الگنی سے اتارنے جارہی تھی۔ اچانک ہی کام سوجھ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ارسلان یہاں نہیں آئے گا۔ جہاں سالہا سال کا ''قیمتی'' کباڑ پڑا ہوا تھا۔ شبیر حسین کی یادگار......

ہر چیز کے بارے میں ارشاد ہوتا تھا کہ ''سنبھال کر رکھ دو...... کسی وقت کام آجاتی ہے۔''

اور سنبھالا ہوا کباڑ اب پہاڑ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے افشاں کی ہدایت یکسر نظر انداز کر کے اپنی ماں کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس لیے کہ اسے پورا یقین تھا کہ ثمر رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ لازمی گھر جا کر سو گیا ہوگا۔

یہ یقین اتنا ہی مضبوط تھا جتنا کہ اس بات کا یقین کہ اب ثمر کی نگاہ میں اس کی حیثیت اسٹور میں پڑے سامان سے زیادہ کی نہیں ہے۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو عطیہ بیگم نے سکون کا سانس لیا۔ سلام دعا کے بعد فوراً سوال ہوا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری ساس کی؟''

''ساس......'' چمن کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ بے ساختہ ابھری۔

''ارے دنیا کی نظر میں تو ابھی وہ تمہاری ساس ہی ہیں۔ اور تم نباہ کر بھی آرہی ہو......'' عطیہ بیگم اس کی مسکراہٹ سے جز بز سی ہو کر بولیں۔

''شکر ہے پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ میں اسی لیے رُک گئی تھی کہ شاید وہ پھر مجھے بلائیں اور میں نہ ملوں تو اُن کے ذہن پر بوجھ ہو۔''

''جزاک اللہ...... باپ جیسا جگرا ہے تمہارا...... بھئی ہم میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اپنے خیمے جلانے والوں کے ہاتھ چومیں......'' عین اسی لمحے چمن کے سیل کی رنگ ٹون نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔ اس نے بیگ سے سیل نکال کر دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا تھا۔

''اوہ...... ڈاکٹر علی...... اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ عطیہ بیگم اُس کی طرف دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

''خبردار، کوئی گل منہ سے نہ نکالنا سمجھے؟ اللہ جانے ان لوگوں کا کیا ارادہ ہے۔ ہمیں زور زبردستی نہیں کرنی۔ بچی اس ماحول کی نہیں ہے۔ اگر اس کی خوشی نہیں ہوگی تو خاموشی بہتر ہے۔'' مامی کی بات سے نانو سو فیصد متفق تھیں مگر ان سب کے منہ......

سب کچھ وہی تھا جو آج سے تین سال پہلے تھا ویسے ہی گاؤں کے نیم پختہ گھروں سے اٹھتا دھواں، ویسے ہی گلیوں میں کھیلتے بھاگتے ننگ دھڑنگ بچے اور وہی دور سے ابھرتی پن چکی کی آواز جو اسے بچپن سے ہی عجیب یاسیت بھری بے کلی میں مبتلا کر ڈالا کرتی تھی۔

وہی گھر تھا نیم پختہ، بڑا سا آنگن اور ریل گاڑی کی طرح قطار میں بنے کمرے، لیکن اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا سب کچھ بدل گیا ہو اور یہی سچ بھی تھا واقعی بہت کچھ بدلا تھا مگر یہ تبدیلی باہر نہیں تھی۔

اس کے اندر آئی تھی سوچوں سے لے کر خیال و جذبات تک پہلے اگر وہ سب کچھ تھی تو اب کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کی ذات کی نفی کرنے کا باعث صرف ایک وجہ تھی وہ تھا اس کا دل، وہ تھی اس کی محبت......

☆......☆......☆

شام گہری ہو چکی تھی۔ ڈھلتے سورج کی نارنجی کرنیں مسجد کے میناروں کو دہکا رہی تھیں۔ فضا میں موجود خنکی کا احساس مزید گہرا ہونے لگا تو اس نے اپنے گرد لپٹی شال کو مزید اچھی طرح کھول کر پھیلایا۔

''حرم پتر اندر آجا، ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔ کہیں بیمار نہ پڑ جانا۔'' نانو کی مدھم نقاہت زدہ آواز پر وہ قدرے چونک کر سوچوں کے بھنور سے ابھرتی اُٹھ کر اندر چلی آئی۔ بھابی اپنے چھوٹے بچے کو سلا کر سرمد کو کھانا کھلا رہی تھیں اسے دیکھا تو مسکرادیں۔

''آؤ بیٹھو حرم!'' وہ جواباً مسکرائی۔ مگر یہ مسکراہٹ بہت اوپری قسم کی تھی بلاشبہ۔

''یہاں آجاؤ ناں، لحاف میں، وہاں تو سردی بہت ہے۔ حالانکہ سورج نکلا تھا مگر سردی کی شدت کم ہی نہیں پڑتی۔''

اسے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر بھابی نے ٹوکا اور اپنے نزدیک پلنگ پر جگہ بنائی۔ ان کے اپنائیت آمیز لہجے میں خلوص بھرا ہوا تھا۔ حرم جو انگیٹھی میں

دہکتے کوئلوں کو بے خیالی میں دیکھ رہی تھی۔ چونک کر نانو ہی کے عالم میں انہیں تکنے لگی۔

''ثانیہ کو بتایا تھا رات تمہارے بھائی نے فون پر، بیچاری آنا بھی چاہ رہی تھی مگر اس کا بھی چھوٹا بیمار ہے۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے اسے، یقیناً تمہارا دل تو نہیں لگ رہا ہوگا کہ پچھلی بار کی سی رونق کہاں ہے اب یہاں۔

سارے پنچھی اُڑ کر اپنے اپنے آشیانوں میں جا بیٹھے۔'' بھابی کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا اُداسی کا تاثر تھا۔

حرم کا دل گداز ہوتا چلا گیا تو آنکھیں جانے کس کس سوچ اور یاد کے ہمراہ بھیگی تھیں۔ جی چاہا پوچھے علی شیر، ساجد اور عبدالرافع سب کہاں گئے؟ مگر وہ یہ حوصلہ نہیں کر پائی۔

جبھی تیزی سے اُٹھ کر نانو کے کمرے میں آ گئی کہ خود سے خوفزدہ ہوگئی تھی کہ جانتی تھی اگر مزید وہاں بیٹھی رہی تو مزید ایسی باتوں پر وہ ضبط نہ چھلکا دے جس پر بڑی مشکلوں سے بند باندھے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

اس قدر شدید سردی نے اس کی طبیعت خراب کر کے رکھ دی، کھانسی، زکام، چھینکیں اس کا برا حال تھا۔ اس پر شدید بخار وہ دو لحاف اوڑھ کر بھی کانپ رہی تھی۔ احمد بھائی صبح سے دو بار ڈاکٹر کو گھر لا چکے تھے۔ دوا پرہیز سب کچھ ہی تھا اس کے باوجود اس کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آئی تو نانو کے ساتھ ساتھ ماموں ممانی احمد بھائی اور بھابی بھی گھبرا گئیں۔ احمد بھائی اسے شہر کے اسپتال میں لے جا کر علاج کرانا چاہتے تھے مگر وہ مانتی، تب تھا ناں۔

اگلے دن اس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔

البتہ نقاہت باقی تھی کہ پورا ایک ہفتہ بیماری کاٹی تھی۔ بھابی دودھ میں تیار کیا ہوا دلیہ کا باؤل لیے اسے کھانے پر اصرار کر رہی تھیں مگر اس کا دل ہی نہ مانتا تھا۔

اس کی بیماری کا سن کر ثانیہ بھی اپنے دونوں بچوں سمیت آ گئی تھی۔

''کیا ہوگیا جناب؟ آتے ہی ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔'' اس نے چھیڑا تو جواباً حرم پھیکے انداز میں مسکرا دی تھی۔

''پہلے سے پیاری مگر کمزور ہوگئی ہو۔'' اس کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد ثانیہ کی رائے مستند تھی۔

''ارے بس بیماری نے میری دھی کا منہ اتنا سا نکال دیا اور کیا؟'' نانو نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔

''السلام علیکم بھئی! سنا تھا بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔'' تبھی عبدالرافع ہنستے ہوئے چلا آیا۔ اس کے سر پر چپت لگا کر بولا ساتھ میں ساجد تھا۔ حرم کا دل بہت زور سے دھڑک اٹھا۔ یقیناً وہ بھی آیا ہوگا۔ یہ خیال ایسا تھا جس نے سارا خون سمیٹ کر چہرے پر جمع کر دیا تھا۔

''کیسی ہو اچھی لڑکی؟'' ساجد کے انداز کا وہی مشفقانہ پن تھا جس پر سب اسے چھیڑتے تھے کہ وہ جوانی بلکہ لڑکپن سے ہی بڈھا ہوگیا ہے۔

''اچھی ہوں، خود ہی تو کہہ رہے ہو۔'' جواباً اس نے سابقہ خوش دلی کا مظاہرہ کرنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی کہ لہجے و آنکھوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ نگاہیں کس بے تابی سے صرف اُسے ڈھونڈ رہی تھیں جس کی خاطر دل نے اسے دیس نکالا دے دیا تھا سات سمندر پار کا سفر کرا دیا تھا۔

''دادی نے فون پر تمہارا بتایا تو ہمیں بھاگم بھاگ آنا پڑا۔ چھٹی کا انتظار کیے بغیر۔'' ساجد اس کے ہر لمحہ مایوس ہوتے چہرے اور بجھی آنکھوں کو تکتا اپنی کارگزاری بتلا رہا تھا۔ جواباً وہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

''چلو اچھا ہوا ورنہ تم کون سا آ ہی جاتے۔'' اس کے شاکی پن پر ساجد نے کتنی عجیب نظروں سے اُسے دیکھا تھا۔ کتنا دکھ بھرا ہوا تھا اس کے اس دیکھنے کے انداز میں۔

''ایسا سمجھتی ہو ہمیں؟'' اسے لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو اپنے جیسا سمجھتی ہو ہمیں۔ وہ اب کیا جواب دیتی بھلا؟ سر آپ ہی آپ مجرمانہ انداز میں جھکا تھا۔

''شیر نہیں آیا تمہارے ساتھ؟'' نانو کے سوال نے حرم کی دھڑکنیں اتھل پتھل کر کے رکھ دیں۔ اسے خود ہی محسوس ہو گیا اس لمحے زندگی نے اس کے چہرے پر سانس لی ہو اس ایک نام پر۔

''نہیں...... بہت مصروف ہیں پروفیسر صاحب! کہہ رہے تھے عید پر ہی آؤں گا۔'' ساجد کے جواب پر حرم کا بے تحاشا دھڑکتا ہوا دل ایسے چپ سادھ گیا جیسے پھر کبھی نہیں بولے گا۔ وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کرتی پھر سے لیٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

ثانیہ نے اپنے دونوں بچے بھابی اور ممانی کے سپرد کیے اور خود اس کے لیے پھر وہی لاابالی زندہ دل اور شریری ثانی بن گئی۔ جسے اس نے تین سال پہلے دیکھا تھا۔ ساجد اور عبدالرافع تو تھے ہی چھڑے چھانٹ، بس پھر سے وہی تین سال پرانا وقت لوٹ کر آنے لگا جیسے، وہی قہقہے وہیں شرارتیں اور سیر سپاٹے، اور راتوں کو لمبی لمبی محفلیں جمنے لگیں مگر وہ کھل کر رہی تھی نہ ہی مگن ہو پاتی۔

ثانیہ کسی بچے کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیتی، دھموکے مار مار کر پیچھے کیے جاتی اور ناز بھری نگاہ حرم پر ڈال کر کہنا بھی نہ بھولتی۔

''تسی سے پراں مرو مینوں اپنی بہن نال وی گل کر لینے دیو۔''

''تم بالکل بھی نہیں بدلیں۔'' حرم کی زبان سے یہ فقرہ ایسے سموں ہی پھسلا تھا اور ثانیہ نے فوراً ہی اس پر گرفت بھی کر لی تھی۔

''تم جو بالکل بدل گئی ہو۔'' اس کی نظریں گہری تھیں جانچتی پرکھتی ہوئی حرم نظریں چرانے لگی۔

''اک بات پوچھوں حرم؟ سچ بتانا۔'' ثانیہ اچانک اس کے سر ہو گئی تھی اور حرم کی گھبراہٹ سوال سنے اور جانے بنا ہی عروج پر پہنچنے لگی تھی۔

''تمہاری اس واپسی کی وجہ شیر ہی ہے نا، تمہیں محبت ہو گئی ہے اس سے؟'' وہ سوال نہیں کر رہی تھی۔ اپنا تجزیہ بیان کر رہی تھی۔

اس کا پُریقین لہجہ حرم کو بالکل زرد کر کے رکھنے لگا۔ لبالب پانیوں سے بھرتی آنکھیں اس کی بے بسی کی گواہی دینے لگیں جیسے، یہ آنسو تاسف ملال کے تھے یا بھید کھل جانے کے، ثانیہ سمجھنے سے قاصر ہی رہی۔

البتہ دل سے رنجیدہ ضرور ہو گئی تھی۔ پھر گہرا سانس متاسفانہ انداز میں بھرا اور اسے پُرملال انداز میں تکنے لگی تھی۔

''صرف تم ہی نہیں بدلیں کملی لڑکی! وہ بھی بہت بدل گیا ہے۔ میرا ویر تو وہ رہا ہی نہیں جو پہلے کبھی تھا۔'' حرم نے بے طرح چونک کر مگر نافہم نظروں سے ثانیہ کو تکا تھا۔ جس نے اس کی

آنکھوں کا واضح سوال پڑھ کر بھی نظر انداز کر دیا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اسے مزید دکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

اس کا انتظار کرتیں جب حرم کی آنکھیں تھکنے لگی تھیں تب وہ چلا آیا تھا۔ بالکل اچانک بنا کسی اطلاع کے، سردی ان دنوں اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ موسم بہار کی آمد تھی اور گلوں میں شگوفے پھوٹ رہے تھے۔

ایسا ہی شگوفہ حرم کے دل میں بھی اسے روبرو پا کے پھوٹا تھا۔ وہ برآمدے میں بچھی چارپائیوں میں سے ایک پر سب کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ جب صحن اور برآمدے کو الگ کرتی گرل کے جالی کا دروازہ کھول کر بھابی کا بڑا بیٹا بھاگتا ہوا اس اطلاع کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

''بڑی امی چاچو آ گئے۔'' وہ پھر بھی نہیں چونکی کہ ذہن میں ساجد یا عبدالرافع کا ہی خیال آ سکا تھا۔ مگر جب وہ ڈیوڑھی سے بیگ کاندھے پر ڈالے آنگن میں آیا تو سب سے پہلی نگاہ اس کی ہی اٹھی تھی۔

لائٹ گرے کھدر کے شلوار سوٹ میں اُس کا نمایاں ہوتا لمبا قد اس لباس میں بے حد جچ رہا تھا۔ جسم پہلے کی نسبت بھر گیا تھا، کاندھے مضبوط اور چوڑے ہو گئے تھے۔ اس کے تیکھے نقوش بے نیازی کے تاثر کو سمیٹ کر انوکھی کشش دینے لگے۔

فریش شیو کی نیلاہٹیں اسے تازہ دم ظاہر کر رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ دیکھتی رہ گئی تھی۔ دیکھا تو علی شیر نے بھی تھا مگر صرف ایک نظر...... انتہائی سرسری قسم کی...... جیسے راستے میں پڑی کسی بھی چیز پر پڑ جاتی ہے۔ اڑتی پڑتی سی نگاہ...... وہ بھی ایسی ہی تھی۔ اسے لگا اس کا وجود برف کا گولا تھا جو شدید تپش کے زیر اثر آ کر تیزی سے گھل رہا تھا بلکہ گھل گیا تھا۔ وہ ختم ہو گئی تھی، اسی ایک لمحے میں اپنا آپ بے معنی ہوتا بے مایا ہوتا دیکھنا کیسا ہوتا ہے یہ اس نے اس لمحے جانا، یہ کتنا اذیت انگیز ہوتا ہے یہ بھی اسے تب ہی معلوم ہوا تھا اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور چہرے سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اس کے اندر رونے کی خواہش شدت پکڑ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں بہن سے مل رہا تھا۔

پھر نانو کے آگے جھکا حرم نے سر جھکا لیا۔ اب وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے صاف لگا تھا اس کا یہ طویل سفر رائیگاں چلا گیا ہے۔ اک پل میں ہار گئی تھی وہ...... سب کچھ...... سب ہی کچھ...... اسے وہ وقت یاد آیا تھا۔ جب اس کے صرف ایک بار یہ کہنے پر کہ اسے مردوں کی مونچھیں اچھی نہیں لگتیں۔ حالانکہ اس نے عام سی اک بات کی تھی۔ اسے بالخصوص نہیں کہا تھا مگر وہ جا کر شیو کروا آیا تھا۔ پھر تنہائی ملتے ہی اس کے سامنے کھڑا ہو کر بولا تھا۔

''حرم اب دیکھ کر بتاؤ، مونچھوں کے بغیر میں تمہیں کیا لگتا ہوں؟'' اور جواب میں حرم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''یہ تم بالخصوص مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ تم نے ہی یہ بات کہی تھی۔''

''اور تم اتنے فرمانبردار ہو کہ جھٹ سے وہ بات مان بھی لی؟'' اس کا سر دلہجہ طنز سمیٹ لایا۔

''ہاں...... اس لیے کہ میں ہر صورت چاہتا ہوں تمہیں پسند آ جاؤں۔'' اس کی شکل پر مسکینی برسنے لگی۔ حرم اسے گھورنے لگی تھی۔ اس کے تیور

جارحانہ اورانداز تیکھا تھا۔

''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟''

''افوہ! یہ مت پوچھو، یہ راز کی بات ہے۔'' شرمانے کی اداکاری کرتا وہ خوامخواہ لال ہونے لگا۔ اور عین اسی پل ثانیہ کے آجانے کے باعث بات پلٹ گئی تھی۔ ورنہ حرم اس کے لتے نہ لیتی ممکن نہ تھا۔

''شیرحرم بھی آئی ہوئی ہے، تم اس سے نہیں ملے؟'' نانو کی آواز اُسے ماضی سے حال میں کھینچ لانے کا باعث بنی تھی۔ اس نے چونکتے ہوئے سر اونچا کیا۔ وہ بیگ اٹھائے اندر کی جانب بڑھتے رُکا تھا۔

''آئی ایم ساری، میں نے دیکھا نہیں آپ کو، کیسی ہیں آپ؟'' پلٹے بغیر محض گردن موڑے وہ فارمیلٹی نبھا رہا تھا۔ کیسا لہجہ تھا۔ تکلف سے بھرپور، نہ بیگانگی لیے نہ اپنائیت کا تاثر دیتا۔ سرسری سا، سپاٹ سا، جس میں نہ ناراضی تھی۔ نہ جتلاتا ہوا کوئی احساس، یعنی اس نے اسے اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا کہ ناراضی کا حق بھی دیتا۔ حالانکہ حرم کو پورا یقین تھا وہ اس سے بات بھی نہیں کرے گا۔

وہ تو مناتی ہار جائے گی اسے، مگر اب اب...... اسے یہ بھی ناممکن لگ رہا تھا۔ اس کا گلا بھرایا اور آنکھیں جھلملا گئیں۔ وہ جواب میں بولنے سے قاصر رہی تھی۔ علی شیر کے آنکھوں کے سپاٹ تاثر میں خفیف سا تمسخر پھیلا۔ اگلے لمحے وہ کمرے میں جا گھسا تھا۔

☆......☆......☆

ساری رات بارش برسی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی وہ کھڑکی جو نہر کے منظر اور کھیتوں کو اجاگر کرتی تھی کھولے گو بھی کے کھیتوں کو بارش میں نہاتا دیکھتی رہی تھی۔ ساری رات جاگی تھی جبھی صبح دس بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھل سکی۔

جاگ جانے کے بعد بھی وہ بستر میں پڑی گاہے بگاہے گونج اٹھنے والی بھابی ساجد اور عبدالرافع کے علاوہ بچوں کی آوازیں سنتی رہی۔ نانو اپنے بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اونگھتی تھیں۔

ہاتھ میں تسبیح تھی جس کا موتی وہ ہر بار نیند کے جھونکے میں ڈھلک جانے والے سر کو چونک آنکھیں کھولتے اٹھاتے گرا دیتیں۔ یہ بھی اک دلچسپ منظر تھا مگر بات تو ساری دل کی تھی جو کہیں لگتا ہی نہ تھا۔

باہر سے علی شیر کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بھابی کو دروازہ بند کرنے کا کہہ رہا تھا۔ یقیناً کہیں باہر جا رہا تھا۔ یہ اس کی مخصوص تاکید ہوا کرتی تھی۔ حرم کے پاس اب اس کے حوالے سے یاد کرنے کو بہت کچھ تھا اور آنسو بہانے کو اس سے بھی زیادہ بہانے سو اس وقت بھی آنکھیں بھیگتی چلی گئی تھیں۔

''حرم اٹھتی کیوں نہیں ہو یار؟ نیند پوری نہیں ہوئی یا طبیعت خراب ہے؟'' ثانیہ بولتی ہوئی کمرے میں آئی تب اس نے سرعت سے بھیگے گال رگڑ ڈالے۔

''نہیں ٹھیک ہوں میں...... بارش پھر تو شروع نہیں ہوگئی؟'' کسلمندی سے کہتی وہ اُٹھ کر بیٹھی اور لانبے سیاہ ریشمی بال جوڑے کی شکل میں لپیٹنے لگی۔ نانو ان کی باتوں کی آواز پر ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی تھیں۔ اب پوری توجہ سے تسبیح پڑھنے میں مشغول ہوئیں۔

''منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرلو، بکرے کے پایوں کے ساتھ نان منگوائے ہیں۔ گرماگرم دودھ پتی

اور کیک، یار تمہاری وجہ سے اب تک میں بھی بھوکی پھر رہی ہوں۔'' اس کے انداز کی بے چارگی حرم کے ہونٹوں پر مضمحل مسکان کسی نہ کسی طرح کھینچ ہی لائی تھی۔ حرم نے کچھ کہنے کی بجائے بستر سے پاؤں لٹکا کر سلیپر پہنے اور سرہانے پڑا دوپٹہ کھینچ کر شانے پر ڈالا۔

''ہاں چلو۔'' وہ اُٹھ کر اس سے پہلے کمرے سے نکلی تو عین اسی پل علی شیر بھی اپنے دھیان میں برابر کے کمرے سے باہر آیا تھا۔ دونوں کی نظریں محض ایک لمحے کو چار ہوئیں۔ اگلے پل شیر نظر بدل چکا تھا۔

حرم کے دل سے جیسے ہوک اٹھی تھی۔ وہ اس کے اس تکلیف دہ رویے سے بچنے کی خاطر ہی تو چھپی پھرتی تھی اور اپنے تئیں اس کے گھر سے نکل جانے کا یقین کر کے باہر آئی تھی مگر......

''بھائی آپ خفا ہیں حرم سے؟ رات بھی آپ نے اچھے انداز میں بات نہیں کی اُس سے۔'' اس کی سوچوں کو دھچکا لگانے کا باعث ثانیہ کی شکایتی آواز تھی۔

وہ اسے روکنے کی ہر ممکن سعی کرتی اگر جو اسے ذرا سا بھی گمان ہوتا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ یوں تھی جیسے زمین میں گڑھی ہو، ٹھٹھک تو شیر بھی گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر چتونی حرم کو نہیں ثانیہ کو دیکھا تھا۔

یہ نظریں تادیبی نظریں تھیں جبھی ثانیہ کی رنگت میں تغیر پیدا ہوتا چلا گیا تھا۔

''میں معمولی باتوں کو ہرگز اہمیت دینے کا قائل نہیں ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی کل ان سے نارمل بی ہیوئیر تھا میرا جیسا کسی بھی عام رشتے سے ہوسکتا ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں سمجھ آ گئی ہوگی۔'' اک ساتھ بہت کچھ جتلا کر وہ لمبے ڈگ بھرتا اپنے پُراعتماد انداز میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ حرم کا سکتہ مزید گہرا ہوا تھا تو ثانیہ کی شرمندگی کا بھی انت شمار نہیں رہ سکا۔

''تم تو ہمارے پاس آ کر بیٹھتی نہیں ہو۔ ہم نے سوچا خود ہی تمہیں بور کر لیتے ہیں جا کر۔ ویسے کن سوچوں میں ڈوبی رہتی ہو؟''

نانو کے پلنگ پر وہ اُن کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹی تھی جب بھابی اپنے دونوں شریر ترین سپوتوں سمیت اس کے پاس آ گئیں ان کے شکوے کے جواب میں اس کے چہرے پر خجالت آمیز تاثرات ابھرے تھے۔ بجائے کچھ کہنے کے وہ محض خجل انداز میں مسکرائی تھی۔

''چائے پیئو گے تم لوگ؟'' تب ہی ثانیہ نے اندر جھانکا۔ بھابی کی تو جیسے باچھیں کھل گئیں۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ......'' انہوں نے شرارت سے کہتے ثانیہ کے ہاتھ میں موجود ٹرے سے سب سے بڑا مگ اٹھایا۔

وہ اس دھاندلی پر انہیں گھورتی رہ گئی۔ ساجد، عقیل اور عبدالرافع بھی جیسے چائے کی خوشبو سونگھتے ہوئے آئے تھے اور باقاعدہ جھگڑا ہونے لگا کہ ثانیہ بے چاری نے محض چار کپ بنائے تھے۔ اپنا نانو کا اور بھابی کے ساتھ حرم، ان تینوں کے آنے سے یہ ہوا کہ آدھا آدھا کپ تقسیم ہوا تھا مگر ساجد کہاں آسانی سے مطمئن ہو سکتا تھا۔ جبھی عقیل پر چڑھ دوڑنے لگا۔

''مجھے آدھی سے بھی آدھی دی ہے تم نے، بددیانتی ہے یہ۔'' وہ چیخ رہا تھا، حرم مسکرائی گئی۔

''مجھ سے لے لیں، ساری لے لیں۔'' اس نے اپنا مگ بڑھا دیا۔

ساجد نے کاندھے جھٹکے تھے اور کمال درجے کی بے نیازی کے ساتھ مگ لے کر سپ لینے لگا۔

اس فرمانبرداری کے مظاہرے پر جو ہر طرف سے اُسے لتاڑا گیا اس پر دھیان کس نے دینا تھا۔

''اور سنائیں حرم جی آپ کا لندن کیسا ہے؟ سنا ہے بڑی ٹھنڈ پڑتی ہے وہاں۔'' عبدالرافع کے سوال پر وہ محض مسکرا کے رہ گئی تھی۔

''حرم بہت بدل گئی ہے۔'' بھابی کا تجزیہ بھرپور تھا۔ حرم بوکھلائی اس کی نظر بے اختیار ثانیہ سے ملی اور گھبرا کر جھک گئی مگر وہ اس موضوع کو طول پکڑتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جبھی آگے کی سمت جھک کر بھابی کی گود میں موجود ان کے بیٹے کے پھولے رخساروں کو سہلایا تھا۔

''آپ کا بے بی بہت کیوٹ ہے۔'' مقصد ان کا دھیان بٹانے اس موضوع سے ہٹانے کا تھا مگر الٹی آنتیں گلے پڑنے والی بات ہوگئی تھی۔

''اس طرح کے دو نہیں تو ایک تو لازماً بچہ تمہاری گود میں بھی کھیل رہا ہوتا اگر اس وقت شادی سے منع نہ کرتیں۔''

بھابی نے مذاق میں کہا تھا مگر ہر مذاق ضروری نہیں بے ضرر ہو۔ یہ سنگین بات تھی جو اسے بھک سے اڑا کے رکھ گئی تھی تو عین اسی وقت علی شیر کی وہاں اتفاقیہ آمد تھی۔ اسے دروازے میں کھڑے پا کر حرم کو اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے تھے۔

''آپ کے میکے سے فون ہے بھابی۔'' وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ سنا ہو۔ چند قدم بڑھا کر فون بھابی کو تھمایا اور اُلٹے قدموں پلٹ گیا جبکہ حرم کو سنبھلنے کو ایک صدی بھی شاید کم پڑتی۔

☆......☆......☆

اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ کھڑکی کے پار کا منظر درد بکھرتا تھا۔ بارش کی بوندیں اک تسلسل

اپنی اپنی آنکھوں سے درو دیوار پر منظر بناتی ہوں
کبھی پاؤں کبھی صحرا، کبھی اِک گھر بناتی ہوں

بنانا خوش بہت آتا ہے مجھ کو ہجر لمحوں کا
کبھی تو بھول جاتی ہوں کبھی اکثر بناتی ہوں

چھن جائے نہ آنکھوں کی تپش سے خواب کی دنیا
میں چشمِ نم کے سائے میں ترا پیکر بناتی ہوں

دھنک رنگوں سے پھر آراستہ کر کے ترا پیکر
کبھی آنکھوں کبھی دل کی جگہ پتھر بناتی ہوں

بڑھا دیتا ہے قامت روز وہ دیوار، زنداں کی
میں کشفِ ذات سے جب بھی کہیں اِک در بناتی ہوں

نبھاتی ہوں میں اس انداز سے رسمِ زباں بندی
بناتی ہوئی قفس کاغذ پہ پھر کچھ پَر بناتی ہوں

کسی پر کیوں کھلے روداد دردِ دل حجابؔ اپنی
سو ہونٹوں پر ہنسی کے ساتھ چشمِ تر بناتی ہوں

حجاب عباسی

سے گرتی تھیں اور سب کچھ بھیگتا جا رہا تھا۔ در و دیوار، درخت، پودے، نہر کے ساتھ ساتھ چلتی سرمئی سڑک کے ساتھ اس کی آنکھیں، اس کا دل بھی، بارش یادوں کے در وا کرتی تھی۔ سب کچھ فراموش کراتی تھی۔ وہ بھی فراموش کر رہی تھی۔ خود کو بھی، تسلسل سے دو دن ہونے والی بارش نے جاتی سردیاں پھر پلٹا دی تھیں۔ کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی کا غبار پھیلا تھا۔ اور نانو کی ہموار سانسوں کا زیر و بم ان کی گہری نیند کا پتہ دیتا تھا۔ انہوں نے سونے سے قبل بھابی سے کہہ کر انگیٹھی میں کوئلے سُلگا کر اپنی چارپائی کے نزدیک رکھوالی تھی۔ انہیں معمول سے زیادہ سردی محسوس ہوا کرتی تھی۔ حرم کی نگاہ انگیٹھی میں دہکتے کوئلوں پر چڑھتی راکھ کی تہہ میں چھپے انگاروں کو کھوجتی تھی۔ ایسے ہی انگارے اس کے دل میں بھی دہکتے تھے۔ جن پر راکھ کی تہہ موٹی اور کبھی باریک ہوتی رہتی۔ مگر آج شام بھابی نے اپنی بات سے گویا پھونک مار کے ساری راکھ اڑا دی تھی۔ کتنی تپش تھی اب ان انگاروں کی، ناقابلِ برداشت، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھرنے لگیں۔ ہاں اس کا قصور تھا۔ غلطی تھی، اب تو اس بات کو تسلیم کیے بھی ایک عرصہ ہونے کو تھا۔

اس کے اندر سرد راتوں کی یخ بستہ ہواؤں کی شوریدہ سری تھی جو گزرے ماہ و سال کی گرد اڑا کر انہی لمحوں میں اسے گھسیٹنے لگی۔ جو ہر بار سوچنے پر تکلیف کا باعث بنتے تھے۔ زیادہ پرانی بات بھی نہیں تھی۔ جب وہ ماما کے ساتھ پہلی بار پاکستان آئی تھی۔ ان کی فلائٹ لاہور کے ایئرپورٹ پر اتری تو ماموں عبدالرافع کے ساتھ پچھلے دو گھنٹوں سے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہاں سے وہ لوگ ٹیکسی کے ذریعے گاؤں کے راستوں پر ہو لیے تھے۔

سرسبز کھیتوں اور باغات کا سلسلہ شروع ہوا تو عبدالرافع جو اس دوران اس سے اچھا خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''کزن ہمارے باغات دیکھیں گی؟''

''وائے ناٹ۔'' جواباً اس نے بھی خوشدلی کا ازلی مظاہرہ کرتے ہوئے آمادگی ظاہر کی تو عبدالرافع نے اسی وقت گاڑی رکوا دی۔

''بچی اتنے سفر سے تھکی ہوئی ہے پتر، شام کو لے آنا باغ دکھانے کو۔'' ماموں کو اُن کا ارادہ جان کر اختلاف ہوا تھا بہن سے بات چیت ترک کر کے ٹوکا، تو دونوں مسکرانے لگے۔

''نو پرابلم ماموں، میں بالکل ٹھیک ہوں، جانے دیں پلیز۔'' اس نے مچل کر کہا تو ماموں کو سر ہلاتے بن پڑی۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر عبدالرافع کے ساتھ چلتی وہ اس انوکھے ایڈونچر سے کتنی محظوظ ہوتی رہی تھی۔ عبدالرافع نے اسے بالکل تازہ امرود اور کینو توڑ کر دیے تھے۔ جو اس نے شوق اور اشتیاق کے عالم میں وہیں کھڑے کھڑے کھانے شروع کر دیے۔ موسم سرد تھا اور فضا میں ہر قسم کے پھل کی مخصوص خوشبو پھیلی تھی۔ وہ گردن گھما گھما کر اور سر اونچا کر کے ہر طرف کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

''آیئے اب آپ کو کسی سے ملواؤں۔'' عبدالرافع اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک جانب کو چل پڑا۔ حرم نے اس کی تقلید کی تھی۔

''بھائی جلدی آیئے۔'' معاً وہ اک جگہ تھمتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کے چیخا۔ حرم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا تھا۔ اب نظر کے سامنے ہموار قطعہ ارض تھی۔ جس میں ٹریکٹر کے ذریعے ہل چلایا جا رہا تھا۔ عبدالرافع کا مخاطب ٹریکٹر

ڈرائیور ہی تھا یقیناً اس کی آواز ٹریکٹر کے انجن کے شور میں دب گئی مگر یہ حرم کا خیال تھا۔ ٹریکٹر پر سوار نوجوان نے گردن موڑ کر ان کی جانب دیکھا تھا۔ پھر بریک لگانے کے بعد نیچے کودا اور بھاگنے کے انداز میں ان کی جانب چلا آیا۔

''پہچانیں بھائی کون ہے؟'' عبدالرافع کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ جبکہ وہ جھینپ گیا تھا۔ سرمئی عوامی سوٹ سر پر بندھا صافہ، وہ پہلی نگاہ میں حرم کو بے حد عام سا نوجوان ہی محسوس ہوا تھا۔ جس کے چہرے پر بے حد تمتماہٹ تھی۔

''مجھے پسند ہے۔ ثنا بوا کی بیٹی ہیں۔'' سر کا ڈھاٹا اُتار کر چہرے کا نادیدہ پسینہ پونچھتا وہ پتہ نہیں کیوں خجل تھا۔ حرم کو قطعی سمجھ نہیں آسکی تھی۔

''بس؟'' عبدالرافع کا انداز صرف شرارتی نہیں تھا چھیڑتا ہوا بھی تھا۔ وہ محض اسے گھورنے لگا۔

''حرم، یہ علی شیر ہیں۔ میرے بڑے بھائی، ذکر تو سنا ہوگا بوا سے آپ نے؟'' عبدالرافع کے تعارف کروانے پر حرم نے اسی بے تکلفی سے اس سے مصافحہ کیا۔ جیسے وہ پہلے عبدالرافع سے بھی کر چکی تھی۔ علی شیر بھی ویسے ہی ہونق ہوا تھا جیسے وہ عبدالرافع کو ہوتا دیکھ چکی تھی۔ وہ لڑکے ہو کر شرماتے حرم کو بہت عجیب اور مضحکہ خیز لگے تھے۔ علی شیر نے اپنا ہاتھ اس کے موی گلابی ہاتھ سے نکالتے خفت بھری نگاہ عبدالرافع پر ڈالی جو مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش میں ہلکان تھا۔

''آپ کھیتوں میں کام کرتے ہیں؟'' وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے سرسری سا بولی تھی۔ گاؤں کے کھلے ماحول میں پلا بڑھا۔ لمبے قد کا مضبوط جسم کا مالک نظر آتا تھا۔ جس کی لمبی نوک دار مونچھیں اسے خوامخواہ مسکرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

''ہوگئی سیر یا ابھی رہتی ہے؟'' اس کے بجائے عبدالرافع سے مخاطب تھا۔ جس کے ہر تاثر سے ہی آج شوخی ٹپک رہی تھی۔

''پوچھ لیں، اگر رہتی ہے تو آپ کروادیں۔'' اس کا لہجہ ہنوز شوخ و شنگ تھا۔

''نہیں پلیز، باقی پھر سہی، اب چلتے ہیں واپس۔'' اس کے مداخلت کرنے پر عبدالرافع کاندھے جھٹک کر رہ گیا۔

☆.........☆.........☆

''ہوں، اب مزا آئے گا۔ شیر بھائی کی شادی ہوگئی اور آئے گی میری باری، واہ، واہ۔'' گھر میں اک بھونچال آیا ہوا تھا صبح سے، صفائیاں، کھانے اور جانے کیا کچھ اہتمام، ایسے میں ساجد لڈیاں ڈالتا پھر رہا تھا۔ سب جانتے تھے۔ ثنا بوا کی اکلوتی بیٹی شیر کی منگ ہے۔ اپنے طور پر بوا کی آمد کو سب نے یہی سمجھا تھا وہ بیٹی کی شادی کا معاملہ ہی نپٹانا چاہ رہی ہیں۔

''حرم باجی تو بولتی ہی انگریزی ہوں گی۔ انہیں تو اردو آتی ہی نہیں ہوگی۔'' عقیل کی پریشانی کا عالم بھی قابلِ دید تھا۔ وہ میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا اور انگلش میں بڑی باقاعدگی سے فیل ہوتا آرہا تھا ہمیشہ سے۔

''لو بھلا اس میں پریشانی والی بات ہی کیا ہے۔ ہم صاف کہہ دیں گے ہمارے شیر بھائی بھلے پڑھے لکھے ہیں پر انہیں یہ گٹ مٹ ہرگز پسند نہیں۔ اردو میں بات کریں۔ بلکہ پنجابی زیادہ ٹھیک ہے۔'' ثانیہ نے بھی دانت نکالے تھے اور مامی سے دھوکہ کھایا تھا جو ان کے بقول کام چھوڑ کر باتیں کرنے کی شوقین تھی۔

''ہاں بالکل! بھائی جان وہ والا گانا گا کر کہیں

گے......''

ساڈے نال پنجابی بول کڑے
ساڈے نال پنجابی بول کڑے
سانوں ہم کو تم کو نئیں آندی
سانوں گٹ مٹ گٹ مٹ نئیں آندی
ساڈے نال پنجابی بول کڑے

ساجد مارے جوش میں اُٹھ کر ساتھ بھنگڑا بھی ڈالنے لگا۔ اس کی آواز بھی بھانڈوں جیسی تھی۔ بھابی کو ہنسی روکنا دشوار ہونے لگا۔

اے پیپسی برگر پھوک پران، آ کھایئے دال تے چول کڑے

وہ اسی جوش و خروش سے جھوم رہا تھا۔ لہک کر گا رہا تھا۔

''دال نے چول وی پھوکو پرے، ساگ نے مکھن لسی کھو جی۔'' بھابی نے لقمہ دیا تھا۔ اب تو نانو اور مامی کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

''شرم تے آتی نہیں ہے نا۔ سارے اکو جیسے ہیں۔'' مامی دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسی مخفی رکھنا چاہتی تھیں مگر ان کی اس مخصوص ادا سے چنڈال چوکڑی آگاہ تھی، جبھی پھیلے گئی۔ تبھی گھر کے دروازے پر گاڑی رُکنے اور ہارن کی آواز نے سب کو بوکھلا دیا۔

''یا ہو......'' آ گئے ساڈے وڈے پرادے سورے تے نال ہونے والی بڈھی۔'' ساجد کے نعرہ مستانہ پر مامی نے اسے زور سے جھنجوڑا تھا۔ اور بے دریغ گھورا۔

''خبردار، کوئی گل منہ سے نہ نکالنا سمجھے؟ اللہ جانے ان لوگوں کا کیا ارادہ ہے۔ ہمیں زور زبردستی نہیں کرنی۔ بچی اس ماحول کی نہیں ہے۔ اگر اس کی خوشی نہیں ہوگی تو خاموشی بہتر ہے۔'' مامی کی بات سے نانو سو فیصد متفق تھیں مگر ان سب کے منہ لٹک گئے تھے۔

''لو...... یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ وہ ہماری ہی بھرجائی بنے گی۔'' ساجد کا انداز احتجاجی تھا۔

''بنے گی تو تب ناں، جب وہ آئے گی۔ دیکھو کوئی نہیں ہے حرم ساتھ۔'' ثانیہ جو کھڑکی سے آنے والے مہمانوں کو دیکھتی تھی گوہر افشانی کرتی پلٹ کر باہر چلی گئی۔ ساجد حیران ہوتا اس کے پیچھے لپکا تھا مگر صورتحال جان کر ان کے سوکھتے سانس پھر سے بحال ہونے لگے تھے۔

''خوامخواہ ڈرا دیا بھرجائی تو آتے ہی بھرا کو ملنے چلی گئی۔'' وہ کچن میں آ کر ثانیہ سے کہتا دانت نکوس رہا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ملگجا اندھیرا دھرتی پر اترا تو فضا میں موجود خنکی گہری ہوتی چلی گئی۔ مما اندر کچن میں نانو اور ماموں کے پاس تھیں جبکہ وہ کچن میں ثانیہ کے پاس بیٹھی اسے سالن بھونتے دیکھتی تھی۔ چولہے میں جلتی آگ کی نارنجی روشنی کا سایہ دیواروں پر لرزاں تھا اور ماحول میں گوشت کے مسالے اور دھویں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ثانیہ نے ہاتھ میں موجود۔ پھونکنی کو نیچے رکھا اور سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا حرم!''

''کون سی بات؟'' وہ قدرے چونکی اور مستغرانہ نظروں سے اُسے تکنے لگی۔

''میں نے پوچھا تھا ہم سب تمہیں کیسے لگے؟ ہمارا گھر ہمارا گاؤں تمہیں اچھا بھی لگا کہ نہیں؟'' ثانیہ پتہ نہیں کیا سننا چاہتی تھی اور وہ جانے کیا سمجھی جبھی سادگی سے مسکراتے ہوئے جواب دے دیا۔

''یار بہت اچھا ہے سب کچھ، تم سب بھی بہت اچھے ہو، نوڈاؤٹ، جبھی تو یہاں رہ رہی ہوں۔ ورنہ میں تو ایک ہفتہ کا پروگرام بنا کے آئی

تھی۔ آج کتنے دن ہو گئے۔'' ثانیہ کے چہرے پر اس جواب نے رنگ بکھیر دیے تھے۔ اس نے چمکتی آنکھوں سے حرم کو دیکھا۔ اسے اسی جواب کی توقع تھی کہ انہوں نے محبت ہی بہت دی تھی اسے، ہر رات رتجگا ہوتا وہ سب کتنا شغل لگاتے تھے۔ بیت بازی، گانوں کا مقابلہ، ہنسی مذاق، حرم کتنا انجوائے کر رہی تھی ان کی کمپنی، وہ واقعی یہاں آ کر مگن تھی۔ اس نے وہ سوال اب کیا جس کے لیے یہ تمہید باندھی تھی۔

''اور اگر ہم ہمیشہ کے لیے تمہیں یہاں رکھ لیں۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ اسے کریدنا چاہتی تھی۔ اور جس نظریے سے یہ بات کہی گئی وہ تو حرم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ثانیہ کے برعکس وہ اس بندھن سے بہر حال لاعلم تھی جو اس کے بڑوں نے باندھا تھا اس کے لیے، جبھی کھلکھلا کر ہنس پڑی کہ اس بات کو وہ مذاق سے بڑھ کر کیا کہہ سکتی تھی۔

''ہاں تو رہ لوں گی۔ بس تم مجھ سے اکتانا نہیں۔'' وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھی۔ جبکہ ثانیہ سے یہ خوشی سنبھالے نہیں جا رہی تھی۔ صرف ثانیہ سے نہیں، علی شیر کو بھی لگا تھا۔ اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔

☆......☆......☆

منگنی کی رسم تو ہو ہی چکی تھی۔ میں چاہتی ہوں ثانیہ کے ساتھ علی شیر کو بھی نپٹا دوں۔ ثانیہ کی بارات کے دن شیر کا ولیمہ ہو جائے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے ثنا؟''

نانو نے بیٹی کو مخاطب کیا تھا۔ گویا بہو اور بیٹے کے دل کی بات کہی تھی۔ مما کا چہرا لمحہ بھر کو پھیکا پڑا پھر قدرے توقف سے بولی تھیں۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے اماں جان مگر میں نے ابھی حرم سے بات نہیں کی اس موضوع پر کسی قسم کی بھی، دراصل ابھی وہ پڑھ رہی تھی تو......'' وہ گریزاں تھیں متذبذب تھیں۔ تینوں ماں بیٹا اور بہو اک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ پھر نانو ہی مداخلت کر گئی تھیں۔

''ثانیہ کی عمر کی ہے حرم! پورے انیس کی ہو گئی۔ شادی کو یہی مناسب عمر ہوتی ہے۔'' وہ گویا بیٹی کو تنبیہ کر رہی تھیں۔ مما کو چپ ہونا پڑا۔

''ثنا بہن آپ حرم دھی کی فکر نہ کرو۔ میں نے ثانی کے ذریعے اس کی مرضی معلوم کرائی ہے اُسے اعتراض نہیں۔'' ممانی کے کہنے پر مما کے چہرے پر حیرانی و غیر یقینی کا گہرا تاثر ابھرا تھا مگر اس کے بعد وہ جیسے بے تحاشا خوش اور مطمئن نظر آنے لگیں۔ دل سے ان کی بھی یہی خواہش تھی۔ شیر پڑھا لکھا تھا۔ خوبصورت بھی، بطور داماد انہیں دل سے قبول تھا۔ بس بیٹی پر جبر نہیں چاہتی تھیں۔ جہاں تک بات اس ماحول کی تھی تو یہاں رہنا کس نے تھا۔ وہ اکلوتے داماد کو انگلینڈ میں سیٹل کرا سکتی تھیں۔ ہر قسم کی مورل سپورٹ فراہم کرتے ہوئے۔ انہیں یقین تھا ان کی ماں اور بھائی کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ آخر انہی کے بیٹے کا مستقبل سنور رہا تھا۔

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اگر حرم راضی ہے تو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں تو سب کے چہرے چمک اٹھے تھے۔

''مبارک ہو پھر تو، بہت بہت ابھی منہ میٹھا کرو سب۔'' نانو باری باری تینوں اولادوں کو گلے لگاتے ہوئے بولیں۔

☆......☆......☆

''اماں دیکھیں ذرا اپنی حرم شیر کے ساتھ کھڑی کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ بالکل چن سورج

کی جوڑی ہے دونوں کی، ہے ناں؟'' آج ثانیہ کے سسرالی شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے تھے جبھی گھر میں خاصی پرونق تھی۔ حرم معمول کے لباس سے ہٹ کر شلوار قمیض اور دوپٹے میں ملبوس تھی۔ سفید کلف دار کرتا شلوار میں تک سک سے درست شیر سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی، اپنے دوپٹے میں اُلجھتی وہ واقعی مبہوت کردینے کی حد تک دلکش نظر آتی تھی۔ ایسے میں ممانی نے نانو کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو وہ بھی انہیں دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''کیا فیصلہ کیا ہے پھر ان دونوں کے بارے میں؟'' بھابی نے دلچسپی ظاہر کی تھی۔

''ثنا بہن کہتی ہیں ابھی صرف نکاح کر لیتے ہیں۔ رخصتی سال دو سال بعد ہو جائے گی۔ تب تک حرم کی تعلیم مکمل ہو جائے گی اور علی شیر بھی کسی ملازمت سے لگ جائے گا۔'' جواب ممانی نے دیا تھا۔

''چلو یہ بھی مناسب ہے۔'' بھابی نے سکھ کا سانس بھرا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' شیر ان کی جانب چلا آیا تھا۔ بھابی نے اسے شرارت سے دیکھا تھا۔

''تیرے بیاہ کی بات کر رہے ہیں ہم۔'' شیر کے چہرے پر ایک رنگ آ کر ٹھہر گیا۔

''اچھا مگر کس کے ساتھ؟'' ترچھی نظروں کو حرم پر ٹکائے وہ جانے کیا سننا چاہتا تھا مگر وہ بھی بھابی تھیں، اسے لتاڑ کے رکھ دیا تھا۔

''چل وے، اتنا بھولا ہے نا جیسے تو، جانتا ہی نہیں۔''

''ہوسکتا ہے وہ نہ جانتی ہو۔ جس کا میرے ساتھ بیاہ کر رہی ہیں۔'' وہ اب براہِ راست حرم کو دیکھتا ہوا مسکراہٹ ضبط کر کے بولا۔ بھابی اور شیر اس دوران بات کرنے حرم کے پاس آ رکے تھے۔ جس نے بے ساختہ لقمہ دے کر گویا شیر کو چھیڑنا چاہا تھا۔

''ہاں نا بھابی! اتنا سسپنس پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔ بتا دیں ہمیں بھی آخر وہ بدنصیب کون ہے؟ جس کا شیر سے نصیب پھوڑا جا رہا ہے۔'' وہ جیسے شیر کو زچ کرنے کے درپے تھی۔ شیر کے ساتھ اب کے بھابی نے بھی چونک کر بغور اسے دیکھا تھا۔ جہاں ازلی سادگی اور بھولپن تھا۔ آنکھوں کا معصوم تاثر اس کے لاعلم ہونے کا گواہ بنا ہوا تھا۔

''تمہیں واقعی نہیں پتہ؟'' بھابی ٹھٹکیں، تو حرم زرا سے جھنجلائی۔

''ہاں بھئی، اب کیا اسٹامپ پیپر پر لکھ کے دوں۔''

''اچھا تو پھر شیر سے ہی پوچھو، یا پھر اپنی مما سے۔'' بھابی دامن بچا کر کھسک گئیں تو حرم اچنبھے میں مبتلا ہوتی شیر کے سر ہوئی تھی۔

''بتاؤ مجھے شیر کے بچے، ایسی کون سی حور پری ہے جس کا نام بھی راز رکھا جا رہا ہے۔''

''نام تو میں بھی نہیں بتا سکتا بھئی، مجھے شرم بڑی آتی ہے۔'' وہ مصنوعی انداز میں شرمایا اور بھاگ گیا۔ حرم اسے گالیاں دیتی رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''مائی گاڈ! کتنے اچھے ڈریسز ہیں۔'' وہ ثانیہ کے ساتھ اندر آئی تو نانو اور ممانی کے ساتھ مما کو بھی رنگ برنگ بے حد نفیس اور کامدار ملبوسات کے ڈھیر میں اُلجھے پا کر اشتیاق آمیز خوشی سے کہتی لپک کر قریب آئی اور سرخ کلر کا سوٹ پکڑ کر اس کا کام چھو کر دیکھنے لگی۔ جس کی شرٹ کے دامن پر

سرخ شعاعیں بکھیرتا ہوا کام بہار دکھار ہا تھا۔
''تمہیں اچھا لگا۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' مما اس کے اجلے چہرے پر بکھرے خوشی کے تاثر کو بھتیں مسکرائیں تو اس نے پوری شدت سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔
''ہاں ناں، بہت ہی پیارے ہیں مگر ہیں کس کے؟ ثانیہ کے؟''
''نہیں بھئی، شیر کی دلہن کے ہیں۔'' نانو کی نظروں میں اس کے لیے محبت بھری ہوئی تھی۔
''اُف...... یہ تو غضب ہے مما ایسا کریں ایسا ہی اک میرے لیے بھی بنوا دیں۔'' سی گرین سوٹ دیکھتے ہی وہ مچل کر بولی تھی۔ اس کے انداز کو دیکھتے ہر چہرے پر مسکان بکھری تھی اور آنکھوں میں چند اشارے ہوئے تھے۔ گویا راز کھول دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔
''تمہارا ہی ہے بے فکر رہو۔'' ثانیہ نے اپنے انداز میں تسلی سے نوازا مگر وہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔
''واٹ یو مین؟ ابھی تو یہ شیر کی وائف کا تھا۔ اب میرا بنا دیا، یہ کیا مسٹری ہے؟''
''مسٹری یہ ہے کہ تم ہی شیر کی دلہن ہو، آئی سمجھ میری بنو؟'' ثانیہ نے کھلکھلا کر کہتے اس کے گلے میں بازو حمائل کیے تھے۔ حرم شاکڈ رہ گئی۔
''واٹ، دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟'' اس نے غرانے کے انداز میں کہا اور ہاتھ میں پکڑی شرٹ شدید طیش کے عالم میں دور پھینکی۔
''ثانیہ کے ساتھ ہی تمہارا ابھی شیر سے نکاح ہے بیٹے اور......''
''چپ ہو جایئے مما! فار گاڈ سیک۔'' وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کے چلائی۔ کتنی وحشت در آئی تھی۔ اس پل اس کے چہرے پر، وہ سب حق دق دم سادھے اس کا قہر و غضب دیکھتے تھے۔ جو ہر لمحہ بڑھ رہا تھا۔
''سنیں مما! مجھے بس یہ بتائیں آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ کیا کیا؟ آپ کو میرا اسٹینڈرڈ شیر لگا تھا؟ شیر؟ ہاؤ فنی...... اس سے بڑھ کر بھی کوئی مضحکہ خیز بات ہو سکتی ہے؟'' اس کی آواز پھنکارتی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔ اس کے انداز میں حقارت ہی حقارت تھی۔ وہ مزید کیا کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالتی رہی پھر ایک دم پلٹی اور لال بھبھوکا چہرا لیے ان سب کو ششدر چھوڑ بھاگ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ سب سمجھے تھے قیامت آ کر گزر گئی۔ مگر ابھی قیامت آنا باقی تھی۔

☆......☆......☆

''مجھے صاف لگتا ہے وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ بس نکاح ہو جانے دو۔ پھر دیکھنا میں اسے واپس جانے سے کیسے روکتا ہوں۔'' وہ ساجد اور عبدالرافع کے ساتھ کچن میں بیٹھا آگ تاپتا ہوا کتنے وثوق سے کہہ رہا تھا تو یہ اس کی سادگی کی انتہا تھی۔ حماقت کی حد تھی۔ سادگی دوسرے لفظوں میں حماقت کا ہی درجہ رکھتی ہے۔ اس کے ہاتھوں انسان بار بار دھوکہ کھاتا ہے بار بار ذلیل ہوتا ہے۔ فطری سادگی بھی بس اوقات کسی سزا سے کم نہیں ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں چمچ تھا جسے وہ جوش کھاتی یخنی میں گھماتا تھا۔ تبھی قہر ساماں تاثرات کے ساتھ حرم کچن کے دروازے پر نمودار ہوئی۔
''مسٹر علی شیر......!'' اس کی سرد طنزیہ پکار پر وہ اپنا شغل ترک کرتا چونک کر متوجہ ہوا اور اس کے چہرے کی کبیدگی اور تلخی کو نوٹ کیے بغیر فطری سادگی وازلی خوش دلی سے مسکرایا تھا۔
''آؤ حرم! ہم یہاں تمہاری ہی باتیں

کرر ہے تھے۔''

''اچھا! گڈ، تو کیا باتیں کر رہے تھے تم میری؟'' وہ دو قدم چل کر بالکل اس کے سر پر چڑھ کر پھنکاری۔ علی شیر اس کے لہجے کی تبدیلی محسوس کر کے ہی چونکا تھا۔ اس نے ٹھٹکنے والے انداز میں قدرے غور سے اس کی صورت دیکھنی چاہی۔ جس پر تلخی، کدورت اور نفرت کا غبار تھا۔ وہ حیران ہوا تھا اور ابھی اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کی اس بات کا کیا مقصد ہے کہ وہ پھر سے اسے مخاطب کرتی انگارے برسانے لگی۔

''میرا خیال ہے مجھے خود بتا دینا چاہیے کہ تم کیا باتیں کر رہے تھے میرے متعلق، یہ کہ تم مجھ سے شادی کرنے والے ہو۔''

''یا یہ کہ تم کتنے خوش ہو، ہے ناں؟ مسٹر علی شیر میری بات غور سے سنو۔ تم نے اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب کیوں دیکھے؟ کیا تم سمجھتے ہو تم جیسا عام سا لڑکا مجھے یعنی حرم شاہ کو ڈیزرو کرتا ہے؟'' اس کا لہجہ تنکا ہوا تھا۔ سرد منجمد کر ڈالنے والا، علی شیر کا چہرہ جو پہلے دھواں ہوا تھا پھر یکلخت پیلا پڑا اس کے بعد اس کی رنگت میں تبدیلی آئی اور لٹھے کی مانند سفید لگنے لگی۔ یہ رنگ مستقل رنگ تھا جو ٹھہر گیا تھا۔ وہ پتھرایا ہوا لگتا تھا۔ ساجد اور عبدالرافع بھی کم و بیش اس جیسی کیفیات سے دوچار تھے مگر یہ اُن کی کیفیت وقتی تھی جبھی عبدالرافع خاموش نہیں رہا تھا حرم کو ٹوکنے میں پہل بھی اسی نے کی تھی۔

''دس از ٹو مچ حرم! یہ بات کرنے کا ہرگز بھی کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ دھیما ضرور تھا مگر ہرگز بھی نرم نہیں کہا جا سکتا تھا انداز کی ناگواری و ناپسندیدگی واضح تھی۔ حرم کو اس کا یوں ٹوکنا بھی کھولا گیا تھا جبھی اسی بدتمیزی کی لپیٹ میں اسے لینا چاہا تھا۔

''تم چپ رہو، یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔''

''تم بھی چپ رہو، تمہارے انداز بھی بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔ تمہیں انکار ہے، بات ختم، شادی زبردستی تو نہیں کر دی، نہ ہوگی۔'' عبدالرافع نے سرد آواز میں کہتے ایک بار پھر علی شیر کو دیکھا۔ جس کی کیفیت ہنوز تھی۔ چہرے پر رنج و غم کے ساتھ ایسی ٹوٹتی کیفیت تھی جس پر کم از کم عبدالرافع نگاہ نہیں جما سکتا تھا۔

''تم لوگوں نے مجھے دھوکے میں رکھا، یہ فیئر تھا؟'' وہ پھر چیخی۔ عبدالرافع نے اب کی مرتبہ اسے محض شعلہ ساں نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا تھا۔

''شور مچا کر معاملہ کو ہوا مت دیں حرم بی بی! یہ پاکستان ضرور ہے۔ یہاں کا قانون اتنا سخت نہیں ہے جتنا وہاں جہاں آپ رہتی ہیں۔ مگر ہم خود بہت رواداری اور عزت رکھنے والے لوگ ہیں۔ یہاں معاملہ چھپانے کا مطلب آپ کو دھوکہ دینا نہیں محض ایک معمولی شرارت تھی۔ سرپرائز کرنا جو ظاہر ہے ہماری حماقت ثابت ہو چکی۔ اس کے باوجود نقصان آپ کے کھاتے میں نہیں لکھا گیا۔ سو ریلیکس اینڈ ٹیک کیئر آؤ علی شیر!'' اب کہ عبدالرافع کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ بات کے اختتام پر وہ علی شیر کا بازو پکڑے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ جو ہنوز کسی سنگی مجسمے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ حرم تنتناتے ذہن کے ساتھ پیر پٹختی ہوئی واپس پلٹی تھی۔

☆......☆......☆

پھر جب تک بھی وہ وہاں رہی۔ اسے علی شیر کی صورت دوبارہ نظر نہیں آ سکی، ثانیہ کی شادی تو ہوگئی تھی مگر جیسے ایک اَن دیکھی اُداسی کا رنگ ہر

طرف چھا گیا تھا۔ کسی نے بھی اس سے کوئی شکوہ گلہ نہیں کیا تھا۔ سوائے مام کے، وہ البتہ ضرور بہت خفا تھیں اور بہت دن اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔ واپس جانے کے بعد وہ بھی نارمل ہو گئیں۔ البتہ اس کے اندر جیسے کوئی کانٹا چبھا رہ گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مطمئن ہو جاتی ریلیکس ہو جاتی۔ مگر وہ نہ مطمئن ہوئی نہ ریلیکس، شاید یہ اس کی غلطی کی سزا تھی۔ یا غرور کی کہ اسے اگر زندگی میں محبت جیسا احساس ہوا بھی تو اس کا حقدار پھر کوئی اور نہیں ٹھہرا تھا۔ علی شیر کے علاوہ......

کتنا وحشت سے بھرا ہوا تھا یہ احساس......

جس نے اسے کئی راتوں تک سونے نہیں دیا تھا۔ شرمندگی خوف اور بے بسی، کیسے کیسے احساس نہ تھے۔ کیسے کیسے خدشے نہ تھے۔ وہ تو خود سے بھی اظہار سے قائل نہ تھی۔ اسی بے بسی کے ساتھ جی لینا چاہتی تھی۔ مگر گزرتے وقت نے اسے بہت بری طرح سے توڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب ہر پرپوزل پر وہ انکار کرتی گئی تھی تو مما کی ناراضگی کے سامنے اپنی بے چارگی رکھتے بے اختیار ہو کر سسک پڑی تھی۔

''اب اس کے علاوہ اور کوئی مداوا نہیں ہے مام! میں سمجھتی تھی میں یونہی عمر گزار لوں گی مگر یہ بھی ممکن نہیں۔''

کتنی بے بسی تھی اس کے انداز میں اور مام وہ تو جیسے گنگ رہ گئی تھیں۔ پھر یہ انہی کا مشورہ تھا انہی کی دلائی ہوئی ہمت تھی کہ وہ پھر سے پاکستان آنے کا حوصلہ جمع کر پائی تھی۔ علی شیر کے حوالے سے یہ خیال اگر تقویت کا باعث تھا کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تو یہ خوف بھی دامن پکڑ لیتا تھا۔

''اگر وہ اُسے معاف نہ کر پایا؟ اس کا یقین نہ کر پایا تو کیا کرے گی وہ؟''

لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ خدشات کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی خود کو اور اپنی زندگی کو، جبھی بہت امید اور حوصلہ لے کر بالآخر پاکستان آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کا آغاز ہوئے اب کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ مگر سردی کی شدت میں کمی سورج نکل آنے کے باوجود بھی نہیں آ سکی تھی۔ زرد سنہری مگر کمزور دھوپ گھر کی اونچی دیواروں سے آہستہ روی سے پھیلتی فرش پر رینگنے لگی۔ ناشتے کے اختتام پر اب گھر کی صفائی کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ حرم نے بھابی کے ساتھ ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نرمی اور محبت سے منع کر دیا کرتیں۔ یہ کہہ کر کہ اسے عادت کہاں ہے ایسے مشکل کاموں کی۔ وہ نہیں جانتی تھیں مگر یہ بھی حقیقت تھی بہت اذیت انگیز حقیقت کہ روزمرہ کے ان عام سے جملوں میں بھی حرم کے ماضی کے حوالے سے کچھ نہ کچھ جڑا ہوا تھا۔ یاد کی صورت، جبھی ایک بار پھر اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔ اس روز ثانیہ کی شادی کی تاریخ طے ہونا تھی۔ چونکہ مہمانوں کی آمد تھی تو خصوصی صفائی کا غل اٹھا ہوا تھا۔ ثانیہ کو بانس سے کپڑا باندھے نہایت انہماک سے دیواروں سے جالے اتارتے پا کر اسے بھی یہ انوکھا شوق چرا گیا تھا۔

''لاؤ میں کرتی ہوں۔'' وہ مچل گئی تھی۔ اور ممانی اس کی بچکانہ ضد پر ہنسنے لگی تھیں۔

''جھلی نہ ہو تو میری دھی، تیرے کرنے کا نہیں یہ کام پتر، ہاتھ سے سوئی چھوٹی تو سٹ چوٹ وی لگ سکتی ہے۔ تجھے کہاں تجربہ بھلا ایسے کاموں کا۔'' اُن کے لہجے میں اس کے لیے بہت

پیار تھا اور احساس ایسا گویا وہ کانچ کی گڑیا ہو۔ جو ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ سکتی ہے مگر وہ ضد کیے گئی تھی۔ ممانی پھر بھی شامل، تب علی شیر جو متبسم نظروں سے یہ ساری کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا مسکراتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا۔

''کرنے دیں ناں اماں! کیا حرج ہے۔''

''پر پترا اسے کہاں کرنے......''

''کرے گی تو کرنے آئیں گے۔ آخر ایک دن اسے بھی تو یہ سب سنبھالنا ہی ہے ناں۔'' یہ سب کہتے اس کا انداز حرم کو بہت معنی خیز محسوس ہوا تھا۔ مگر اپنی دھن میں تھی دھیان نہ دیا تھا اور یہ دھیان نہ دینا ہی اچانک شاک کا اور پھر نقصان کا باعث ٹھہر گیا تھا۔

''حرم!'' وہ گم صم بیگانہ انداز لیے کھڑی تھی جب ثانیہ کے پکارنے پر چونکی۔ وہ اسے ہی پکار رہی تھی۔

''یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو اتنی ٹھنڈ میں؟''

ثانیہ حیران تھی۔ وہ چپ رہی، اور اس کے ہمراہ اندر آ گئی۔ ثانیہ نے کچھ کہے بغیر ہاتھ پکڑ کر اسے چوکی پر بٹھایا اور خود انگیٹھی اُٹھا کر اس کے نزدیک لا رکھی۔ فریج سے دودھ نکال کر چولہے پر دودھ پتی کے لیے چڑھایا اور کھنکار کر اُسے دیکھا۔

''اگر تم واقعی سنجیدہ ہو اس معاملے میں حرم تو میں آج علی شیر سے بات کروں گی۔ تم منتظر، وہ انجان بنا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے یہ وقت کو مزید ضائع کرنے والی بات ہے۔'' ثانیہ کی سنجیدگی بتاتی تھی وہ اس معاملے پر بہت غور و فہم کر چکی ہے۔ حرم نے ہڑبڑا کر سر اونچا کیا اور کسی قدر متوحش نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''نہیں...... یہ بالکل مناسب بات نہیں ہے ثانی! مجھے شیر کا ارادہ اب ایسا معلوم نہیں ہوتا اور زبردستی کی قائل نہیں ہوں میں۔'' اس نے بہت حوصلہ کر کے کہہ ڈالا تھا مگر ثانیہ اس کی آنکھوں میں مچلتی بے بسی اور اذیت کی نمی کو بہت دھیان سے دیکھ رہی تھی۔

''وہ محبت تو کرتا تھا تم سے حرم! اب معاملہ اَنا کا ہی کہا جا سکتا ہے۔ جو تم دونوں میں سے کسی ایک کو تو توڑنی چاہیے۔ پھوپو جانی سے کل فون پر میری تفصیلی بات ہو چکی۔ مجھ سے کچھ نہیں چھپایا انہوں نے اور میں سمجھتی ہوں ٹھیک کیا کم از کم حماقت تو نہیں کرنے دوں گی تمہیں اب میں۔'' وہ کھولتے دودھ میں پتی ڈالتے کسی قدر قطعیت بھرے مگر خفا انداز میں کہہ رہی تھی۔ حرم کی آنکھوں کی سطح پر تیرتا ہوا پانی جیسے پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر گالوں پر اترنے کو بے تاب ہو گیا۔ اس نے ہونٹ کچل کچل کر خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے تھے۔

''پھر کیا کرو گی تم؟'' اس کے انداز میں عجیب سی بے بسی اور لاچاری کا عنصر تھا۔ جسے محسوس کرتے ثانیہ کو اس پر ترس آیا۔

''شیر سے بات کروں گی یار! سمجھاؤں گی اُسے، پھر تم اُسے منا لینا کچھ نہیں کہے گا تمہیں، محبت میں انسان کا ظرف خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ دیکھ لینا وہ بھی تم سے زیادہ خفگی نہیں ظاہر کرے گا۔'' ثانیہ کا انداز اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ حرم کو اپنے دل پر دھرا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ کہے بغیر وہ آہستگی سے مسکرا دی تھی۔ ثانیہ نے گرم گرم بھاپ اڑاتا سنہری رنگت والا چائے کا مگ اُسے تھمایا تو پہلی بار اس نے دل آمادگی اور طمانیت سمیت پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

☆......☆......☆

''کہاں غائب رہنے لگے ہو...... اتنا مصروف...... کب سے انتظار کر رہی تھی۔'' ثانیہ علی شیر کو اندر آتے دیکھ کر شروع ہوئی۔ شادی کے بعد وہ خود کو بہت معتبر سمجھنے لگی تھی۔ جبھی علی شیر کو بھائی یا ویر کہنا کب کا چھوڑا ہوا تھا۔ علی شیر اس کے کلاس لینے والے انداز کو محسوس کرتا گہرا سانس بھر کے مسکراتا اس کے سامنے آن بیٹھا۔

''خیریت...... تیور خطرناک لگ رہے ہیں، اور یہ تمہارا شوہر تمہیں یہاں چھوڑ کر اس بار بھول گیا کیا؟'' اس کا انداز شرارتی تھا۔ وہ خود بھی خاصا ریلیکس اور فریش لگ رہا تھا۔

''خیر خطرناک تو نہیں البتہ اہم بات تو واقعی کرنی تھی اور یہاں میں جس وجہ سے ٹھہری ہوں ابھی معلوم ہو جائے گی۔'' ثانیہ جھینپ کر وضاحت دینے لگی مگر آخر میں لہجہ ذومعنی کر لیا تھا۔ شیر نے اب کے قدرے دھیان سے اُسے دیکھا تھا۔ پھر کاندھے اُچکا دیے۔

''بولو کیا بات ہے، ویسے بات تو مجھے بھی ایک کرنی تھی سب سے، وہ بھی بہت اہم ہے۔'' اب کہ وہ سنجیدہ ہوا۔

''کیا بات؟'' ثانیہ چونکی اور غور سے اُسے دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش میں مصروف ہوئی۔ اسے صاف لگا تھا۔ شیر بھی حرم کے حوالے سے بات کرے گا۔ آخر وہ محبت تھی اس کی، جب تک سامنے نہیں تھی اور بات تھی اب واپس لوٹ آئی تھی بدلے ہوئے منتظر انداز کے ساتھ...... شادی کے بغیر...... یقیناً وہ بھی معاملہ سمجھتا تھا۔ اسے انوکھی سی مسرت محسوس ہونے لگی۔

''تم کر لو جو کرنا چاہتی ہو۔ میں تو اماں اور دادی جان کے سامنے ہی کروں گا۔'' علی شیر کا لہجہ متوازن اور نرم تھا ثانیہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

''تو ٹھیک ہے، میں سب کو بلا لاتی ہوں یہاں!'' وہ اٹھی اور بھاگ گئی۔ شیر اُسے پکارتا رہ گیا۔

''پاگل ہے بالکل!'' وہ مسکراتا ہوا سر جھٹک رہا تھا جب ثانیہ دادی کا بازو تھامے اماں کے ہمراہ اندر آئیں۔ بھابی پیچھے پیچھے تھیں۔

''یہ لیجیے، خواتین کا اجلاس تو پورا ہے، کہیں تو آپ کی قوم کو بھی اکٹھا کروں؟'' وہ شریر ہو کر پوچھ رہی تھی۔ شیر اُسے گھور کر رہ گیا۔

''خیریت ہے پتر! یہ کہہ رہی ہے بہت خاص بات ہے جو شیر بتانے والا ہے۔'' اماں اس کے پاس آ بیٹھیں۔ دادی کو ثانیہ نے ان کے بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا تھا۔ گویا وہ بھی منتظر تھیں۔ شیر قدرے خفیف سا ہو گیا تھا۔

''بول بھی دیں، ہم سب ہی ہمہ تن گوش ہیں جناب!'' ثانیہ اُسے احساس دلانے کو ہلکا سا چیخی۔ علی شیر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ اور محتاط نظروں سے ان سب پر ایک نگاہ ڈال کر کھنکارا۔

''میں اب شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ایکچو لی میری ایک اسٹوڈنٹ ہے جواب کولیگ بھی ہے۔ کب سے پیچھے پڑی ہوئی ہے میرے، سوچا اب یہ انتظار ختم کر دوں اُس کا۔'' وہ بہت سکون سے مگر بہت فریش انداز میں بات کر رہا تھا۔ ثانیہ کو جیسے دھچکا لگا تھا۔ وہ ہکا بکا بیٹھی غیر یقین نظروں سے شیر کو دیکھتی رہی۔ جو اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ اسے نہیں خبر تھی دادی یا پھر اماں پر اس بات کے کتنے اور کیسے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ ہاں اُسے یہ ضرور معلوم تھا کہ اس کے اندر کچھ بہت خاموشی سے ٹوٹتا چلا گیا تھا۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں کو سہمے ہوئے انداز میں دروازے کے ساتھ جھولتے پردے کے پرے حرم کا عکس

ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جو نظر نہیں آسکا۔ کیسی حماقت کرڈالی تھی اس نے بنا سوچے سمجھے۔ ابھی جب وہ دادی اور اماں کو بلانے گئی تو حرم کو بھی زبردستی وہاں آنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس کے متامل ہونے گریز برتنے کے باوجود بھی۔

''مناسب کیوں نہیں لگتا۔ تم اپنی آنکھوں سے سننا اور دیکھنا ساری گفتگو، تمہارا کام تو خود بخود ہو رہا ہے یار۔'' وہ اس کا گال کھینچ کر چہکی تھی اور حرم اس کے اصرار کے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔ اور اس حد تک آمادہ کہ اندر نہیں آئے گی۔ ہاں دروازے پر رک کر سن لے گی۔ ثانیہ اُسی پر خوش ہو گئی تھی اور اب اس نے جانا تھا وہ خود کو علقمند سمجھنے کی حماقت کرتی آئی ہے۔ حقیقت اس کے بہر حال برعکس تھی۔

''تم اتنی خاموش کیوں ہو؟ خوشی نہیں ہوئی یا خوشی میں سکتہ ہو گیا ہے؟'' علی شیر کی آواز اسے سوچوں کی عمیق کھائی سے نکالنے کا باعث بنی تھی۔ اس نے دیکھا وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ اتنی جلدی خود کو سنبھالنا بہر حال اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ جبھی نم آنکھوں میں عجیب سا اضطراب اتر آیا تھا۔ بے چینی اور وحشت الگ، شیر تو پریشان ہو کر رہ گیا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟ ہوا کیا اچانک؟'' وہ اُٹھ کر اس کے پاس آیا تھا۔ ثانیہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اک حماقت ہو چکی تھی۔ وہ مزید نہیں کر سکتی تھی۔ حرم کا بھرم اس کا راز اب اس کے کاندھوں پر پڑا تھا۔ جو ذرا سی غلطی پر پاش پاش ہو سکتا تھا۔ اس کا دل بے تحاشا بھر آیا۔

''کک...... کچھ نہیں...... یکدم میں درد شروع ہو گیا ہے۔ ایسے ہی ہوتا ہے جب میرا بی پی شوٹ کرے۔'' بھیگی ہوئی بھیگی آواز میں کہتی وہ وہیں سر پکڑ کر لیٹ گئی۔ گویا سب سے کنارہ کرنا چاہا۔ وہ سب بعد میں بھی کچھ کہہ رہے تھے۔ سوال، وضاحتیں اور جانے کیا کچھ، مگر وہ خاموش رہی۔ اس کی چپ فی الحال ٹوٹنے والی نہیں تھی۔ اس کے اندر موسم سرما کی ہواؤں کی شوریدہ سری تھی جو خزاں زدہ پتے کی مانند اس کے وجود کو اپنے ہمراہ اڑائے پٹخائے پھرتی تھی۔

☆......☆......☆

''مجھے معاف کر دو حرم! ساری غلطی ہی میری ہے۔ تمہارا دکھ اتنا نہ بڑھتا اگر جو میں......'' اس کے سامنے وہ سب ضبط گنوا کر بلک پڑی تھی۔ اور حرم...... وہ تو جیسے اتنی سی دیر میں ہی ٹوٹ پھوٹ کے مرحلے سے گزر کر نئے سرے سے ایک مورت تھی مگر اس توڑ پھوڑ کے اثرات چہرے پر رقم ہو گئے تھے۔ دکھ کی دراڑیں، شکنیں غم والم کی مگر وہ مسکرا رہی تھی۔

''اٹس اوکے، بلکہ اچھا ہوا تم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ذرا سوچو پھر کیا عزت رہتی۔''

''لیکن......''

''بس اس بات کو ختم کر دو ثانیہ۔'' وہ ملتجی ہو گئی تھی۔ ثانیہ نے اذیت سے گزرتے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ شیر کی خواہش ماموں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اللہ اللہ کر کے تو وہ شادی کو مانا تھا۔ مگر ابھی یہ لوگ اس بات کو آگے نہیں بڑھانا چاہتے تھے۔ حرم کی واپسی کو ہر کسی نے ایک ہی انداز سے سوچا تھا مگر یہاں شیر کا اچانک فیصلہ ان کے سوچ کے انداز کو ڈگمگا گیا تھا۔ ہر کوئی دل مسوس کر بیٹھ رہا مگر کچھ کہنے کی پوزیشن ہی کہاں تھی۔

حرم واپس جانا چاہتی تھی مگر اچانک نہیں...... وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی اس کا یہ فیصلہ شیر کو اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

زندگی

☆ طلوعِ آفتاب کے بعد کسی نے کہا۔ ''زندگی قدرت کا ایک خوب صورت عکس ہے۔''
☆ مرجھائے ہوئے پھولوں نے کہا۔ ''زندگی چند ساعتوں کی کہانی ہے۔''
☆ غریب مزدور نے کہا۔ ''زندگی دُکھوں کا گھر ہے۔''
☆ حریص نے کہا۔ ''زندگی ایک لالچ ہے۔''
☆ نامُراد عاشق نے کہا۔ ''زندگی حسرتوں کا نام ہے۔''
☆ بلبل نے کہا۔ ''زندگی ایک چمن کا نام ہے۔''
☆ گلشن نے کہا۔ ''زندگی خوب صورتی کا نام ہے۔''
☆ سورج نے کہا۔ ''زندگی روشنی ہے۔''

حسنِ خیال: افشاں چوہدری۔ U.K

یقین پر پختہ کرے کہ وہ اس کی خاطر آئی تھی۔
''تم میرے ساتھ چلو کچھ دن کو۔'' گھر میں جب شیر کی متوقع سسرال جانے کا پروگرام فائنل ہوا تو ثانیہ نے حرم کے لیے نجات کا یہ درمیانی راستہ نکالا تھا۔ وہ ثانیہ کی ہمدردی اور محبت کو سمجھتی تھی جبھی انکار نہیں کیا۔ بہرحال سنبھلنے کے لیے اسے بھی وقت اور تنہائی تو چاہیے تھی۔ خاص طور پر اس ماحول سے شیر سے، جو آیا تھا تو واپس جانا بھول چکا تھا۔ مقصد جو بھی تھا وہ بہت اذیت کا شکار ہو چکی تھی۔ ثانیہ نے خود اس کی تیاری کی تھی پیکنگ وغیرہ حرم باتھ لے کر باہر آئی تو باقاعدہ ٹھٹھر رہی تھی۔ اوپر سے لائٹ بھی نہیں تھی۔ ثانیہ نے مشورہ دیا تھا چھت پر دھوپ میں جا کر بال سکھالے۔ شال لپیٹے سر کے بال تولیے میں اچھی طرح چھپا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب اوپر سے نیچے آتا ہوا علی شیر ایک دم ہی اس کے سامنے آ گیا۔ یہ سامنا بہت غیر متوقع تھا۔ جبھی چند ثانیوں کو دونوں ہی ساکت و جامد ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دوسرے کو تکتے ایک دوسرے سے گریزاں پہلے حرم ہی سنبھلی تھی اور سائیڈ سے ہو کر گزرنا چاہتی تھی کہ علی شیر نے بے اختیار مخاطب کر لیا۔

''میرا خیال غلط ثابت ہو گیا میں سمجھتا تھا آپ مجھے مبارکباد دیں گی۔'' حرم کو اس سے اس درجہ سفاکی کی امید نہیں تھی۔ کجا وہ اسے سرے سے نظر انداز کر رہا تھا اور اب یوں اس طرح سے نہ صرف جتلانا بلکہ جتلانے کے لیے خود سے مخاطب ہو جانا اسے لگا وہ دانستہ اسے اذیت دینا چاہ رہا ہے۔ اور ایسے لوگوں کے سامنے تو خاص طور پر خود کو بھی کمزور نہیں پڑنے دینا چاہیے۔ اس نے بھی پوری جان لڑا دی تھی۔ خود کو کمپوز رکھنے سے لے کر اس کی جانب دیکھ کر مسکرانے تک میں۔

''اوہ...... سوری! مجھے خیال نہیں رہا۔ خیر ابھی بھی زیادہ تاخیر تو نہیں ہوئی۔ بہت مبارک ہو آپ کو۔'' اس کا لہجہ جتنا بھی نارمل تھا۔ مگر اس میں کہیں سے نمی اور بھراہٹ شامل ہونے لگی تھی۔ جبھی پلکیں جھکا کر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچے اور کترا کر دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اوپر منڈیر کے ساتھ بچھی چارپائی پر گرتے اس نے جلتی

آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنسوؤں کو بہنے کی اجازت نہیں بھی دی تب بھی وہ زارو قطار بہہ نکلے تھے۔ اس نے پختہ فیصلہ کرلیا تھا ثانیہ کے گھر سے واپسی پر وہ زیادہ نہیں رُکے گی۔ یہاں قدم قدم پر بکھرنے سے بہتر تھا وہ اپنا پندار سنبھالے یہاں سے چلی جاتی مگر اس کی سوچ اور خیال کے برعکس قدرت کچھ اور فیصلہ کرچکی تھی۔

☆......☆......☆

وہ حواس باختہ سی بیٹھی ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ثانیہ اس سے بڑھ کر گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی بلکہ اس نے گھر کے دیگر افراد کے بھی ہاتھ پیر پھلا کے رکھ دیے تھے۔ ثانیہ کے سسرال میں وہ ایک ہفتہ بھی نہیں ٹھہری تھی اور واپس آ گئی تھی۔ مگر ایک مصیبت ضرور ساتھ ساتھ چلی آئی۔ ثانیہ کے سسرالی عزیزوں میں ہونے والی شادی میں ثانیہ اسے زبردستی لے گئی تھی ہمراہ کہ دل بہل جائے گا۔ حالانکہ اس نے کتنی جان چھڑوانے کی بھی کوشش کی تھی مگر بے سود، وہیں شادی کی تقریب میں وہاں انوائیٹڈ گاؤں کے سردار صاحب کی نگاہِ التفات اس پر پڑ گئی تھی۔ دو بیویاں بھگتانے والا پچاس کے پیٹے میں موجود جوان اولاد کا باپ سردار اشفاق چوہدری حرم کو پانے کو مچل گیا تھا۔ پہلے شادی کی تقریب میں ثانیہ کے شوہر سے اظہارِ خواہش کیا پھر اگلے دن اہتمام کے ساتھ ان کے ہاں آن پہنچا۔ ثانیہ کے سسرالی تو حرم کی قسمت پر رشک کررہے تھے۔ جبکہ ثانیہ کے ہاتھ پیر پھول کر رہ گئے۔ چوہدری کی حیثیت جتنی بھی مضبوط تھی مگر وہ شکل وصورت اور عمر کسی بھی لحاظ سے حرم کے قابل نہیں تھا۔ اس پر چوہدری صاحب کا کردار...... عورت ان کے نزدیک پیر کی جوتی سے بڑھ کر حیثیت کی حامل نہیں تھی۔ صرف یہی نہیں ان کے بارے میں مشہور تھا عورتوں سے ناجائز تعلقات بھی تھے۔ نکاح کی مجبوری تو محض وہاں نبھائی جاتی تھی جہاں معاملہ ایسے نہ حل ہونے کا پختہ یقین ہو۔ یہ ساری معلومات ثانیہ کے ذریعے جان کر دادی اور ماموں ممانی کی پریشانی بھی دیکھنے لائق تھی۔ چوہدری کی خصلت سے آگاہ تھے۔ جبھی سیدھا صاف انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

''میں واپس چلی جاتی ہوں فوری۔'' ماموں ممانی اور دادی نے جو حل نکالا تھا اسے سن لینے کے بعد ہی وہ جزبز ہوکر بولی تھی۔ پہلے کی بات اور تھی۔ مگر اب وہ ہرگز بھی زبردستی شیر پر مسلط ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ماموں ممانی کے فیصلے پر کہ اُس کا نکاح علی شیر سے کردیا جائے اسے ہرگز قابل قبول نہیں تھا۔

''یہ مسئلے کا حل نہیں ہے پتر! وہ آدمی اس بات کو کبھی ہضم نہیں کرے گا۔ بہت کینہ والا انسان ہے۔ اور گدھ کی طرح جھپٹ لینے والا، میں نقصان سے ڈرتا ہوں۔'' ماموں سخت بے چین تھے۔ حرم ان کی ڈھکا چھپا کر کہی بات کو سمجھ کر ہی ہونٹ بھینچے وہاں سے اٹھی تھی۔ علی شیر نے سنا تو کسی طرح بھی خود پر کنٹرول نہیں رکھ سکا۔

''دماغ ٹھیک ہیں سب کے؟ آپ لوگ دوسری بار میری تذلیل کرانا چاہتے ہیں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں ہرگز بھی قربانی کا بکرا نہیں بن سکتا۔'' وہ بھڑک اٹھا تھا۔

''کیوں ہوگی تذلیل! شیر بچی کی واپسی سے بھی کچھ نہیں سمجھے تم؟ کیوں کسی کو ٹوٹنے دیکھ کر بھی جھکانا اور ضرب لگانا ضروری سمجھتے ہو۔ اُن کہا درد اس کے منہ پر لکھا ہے عورت اظہار کی قائل نہیں ہوتی تم......''

''معذرت کے ساتھ بابا! میں اب ان چکروں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا۔ اپنا فیصلہ میں آپ کو سنا چکا۔ مجھے اب حرم صاحبہ سے نہیں عائزہ سے شادی کرنی ہے۔'' وہ سخت بے مروت نظر آنے لگا تو ماموں کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، کر لینا تم عائزہ سے شادی! مگر اس سے پہلے حرم سے نکاح کرنا ہوگا۔ یہ طے ہے کہ حرم واپس نہیں جائے گی۔ کیونکہ ہم چوہدری پر اسے تمہاری منکوحہ ظاہر کر چکے ہیں۔ اس سے جان چھڑانے کا ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔'' ان کا لہجہ قطعیت آمیز اور دوٹوک تھا۔ علی شیر جیسے چکرا کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتا انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا تھا۔

''بس خاموش رہو شیر! میں نے کہا ناں، یہ دلوں اور انا کے نہیں عزت اور وقار کے معاملے کی ایک کڑی ہے۔ اس وقت خاندان کی عزت کو بچانا ہے۔ اتنا حصہ تو تمہیں بھی ڈالنا پڑے گا۔ نکاح بہت خاموش اور سادگی سے آج شام ہی ہوگا انشاءاللہ! اور تم اب کچھ نہیں بولو گے۔

انہوں نے کہا تھا اور اسے سرخ چہرے کے ساتھ کھڑے دیکھ کر خود باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

نکاح واقعی بہت سادگی سے ہوا تھا مگر اس کے باوجود آس پڑوس تک یہ خبر بہرحال پہنچ گئی تھی جبھی ماموں نے ساتھ ہی رخصتی کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ حرم کی کیفیات بے حد عجیب ہو رہی تھیں۔ من چاہا ضرور ہوا تھا مگر اس میں زبردستی کا احساس ساری خوشی کے احساس کو اپنے ہمراہ اڑا لے گیا تھا۔ اس کی جگہ خدشے واہمے اور اندیشے آن گھیرے تھے۔ ممی نے اسے کچھ دیر قبل ہی فون پر مبارکباد دی تھی۔

''میں بہت خوش ہوں کہ میری بیٹی کو منزل مل گئی۔ تم بھی پریشان نہیں ہونا۔ بیٹے جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد کوئی ایسا حادثہ یا پھر معجزہ ہی تمہیں تمہاری محبت سے ملا سکتا تھا۔ میں تو دعا ہی یہی کرتی تھی کسی طریقے سے بھی سہی تم اپنی منزل پالو۔''

''مگر ممی...... شیر بالکل خوش نہیں ہیں۔ زبردستی ہوئی ہے ان کے ساتھ...... وہ تو کہیں اور بھی انوالو ہو چکے۔'' اس نے بوجھل آواز میں اہم اطلاع دی تھی۔

''ڈونٹ وری! شادی تو تم سے کی ہے ناں، پرانا تعلق بھی گہرا تھا۔ تم بہت ذہین اور قابل ہو میری جان! مجھے یقین ہے اس معمولی بگاڑ کو اپنی سمجھداری سے سدھار لوگی۔ میری دعائیں ہر پل تمہارے ساتھ ہیں۔'' وہ اسے حوصلہ دیتیں، وش کرتی رہی تھیں۔

''لڑکیوں بچی کو تیار کر دو۔ شیر آج ہی شہر واپس جانے کی ضد لگائے بیٹھا ہے۔ تمہارے ماموں کہہ رہے ہیں حرم ساتھ جائے گی۔'' ممانی نے آن کر کہا تو حرم کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ تو اتنی جلدی رخصتی پر ہی جز بز تھی۔ کجا اکیلے اس کے ساتھ وہاں جانا رہنا۔ دوسرے لفظوں میں پوری طرح اس کے رحم و کرم پر۔

''واہ جی! یہ تو بڑا رومینٹک آئیڈیا سوجھا ہمارے دیور کو۔'' بھابی ہنسی تھیں۔ حرم نے گھبرا کر ثانیہ کو دیکھا۔

''تم کیوں سہم رہی ہو؟ تمہارے تو عیش ہو جائیں گے۔ اکیلی وہاں مزے کرنا شوہر سے خدمتیں کرا کر کے۔'' ثانیہ نے حوصلہ بھی اپنے انداز میں دیا تھا۔ وہ سٹپٹا کر نظریں چرا گئی۔ پھر بھابی اور ثانیہ تن دہی سے اسے سجانے سنوارنے

پر لگ گئی تھیں۔ مہندی سنگھار خوشبوئیں، وہ پور پور مہکنے لگی تھی۔ مگر جس کے لیے سجایا گیا تھا اس نے ایک نگاہ بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ اس تک جو اطلاع بہت شرمندگی کے ساتھ پہنچائی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ علی شیر کسی بہت اچانک پیش آ جانے والی ایمر جنسی کے باعث واپس شہر چلا گیا ہے۔ ثانیہ نظریں چراتی تھی اور ممانی اس کے سامنے سے گریزاں ماموں کا غصہ دبانے کے باوجود نہیں دب رہا تھا۔ وجہ واضح تھی علی شیر مجبور ضرور ہوا تھا۔ مگر کٹھ پتلا ثابت نہیں ہوسکا کہ جب تک مرضی اس کا دھاگہ اپنے ہاتھ سے ہلاؤ اور وہ ناچتا رہے

☆......☆......☆

''اب ایسی بھی کیا شوخی! بہر حال ویر کو یہ زیب نہیں دیتا تھا۔ اتنے ہی اکڑو تھے تو شادی سے بھی انکار کر دیتے۔'' ثانیہ کا غصہ ایک بار پھر بھڑکا ہوا تھا۔ وہ آج واپس سسرال جا رہی تھی۔ بڑبڑاتی ہوئی سامان سمیٹتی پھر رہی تھی۔ حرم نے چائے کی ٹرے لاکر میز پر رکھتے درزیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا اور مگ اُٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔

''کیوں خوامخواہ خون جلا رہی ہو؟'' وہ دانستہ مسکرائی تھی۔ ثانیہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔

''تمہیں دکھ نہیں ہے؟'' وہ حیران ہوئی، حرم نے اسی سکون سے سر کو نفی میں جنبش دے ڈالی جس کا مظاہرہ وہ پچھلے کئی دنوں سے ان سب کے سامنے کر رہی تھی۔

''جو کچھ میں نے شیر کے ساتھ کیا تھا ناں ثانیہ! اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے شکوہ نہیں، یہ حق ہے اُن کا، ناراضگی وہیں ہوتی ہے جہاں تعلق اور رشتے کی موجودگی کا احساس ہو۔'' ثانیہ حیران رہ گئی تھی۔ جبھی کچھ بول نہیں سکی۔

''لیکن...... ایسا کب تک چلے گا حرم! شیر واپس نہیں لوٹا۔ حالانکہ آج شادی کو پندرہ دن ہوئے۔ ابا نے کئی بار فون پر آنے کا کہا بھی مگر......''

''کوئی بات نہیں، میں خود چلی جاؤں گی وہاں۔'' اس کے جواب پر ثانیہ کا منہ کھل گیا۔ ایسے کہ بند کرنا بھی بھول گئی۔

''اگر میں انہیں خفا کر سکتی ہوں تو منا کیوں نہیں سکتی؟ پھر اب تو یہ حق بھی ہے اُن کا۔''

وہ نرمی و حلاوت سے کہہ رہی تھی۔ ثانیہ کی آنکھوں سے استعجاب چھلک رہا تھا۔

''تم واقعی بہت بدل گئی ہو۔'' وہ یہی کہہ سکی۔ حرم گہرا سانس بھرتی مسکرانے لگی تھی۔

''محبت بدل دیا ہی کرتی ہے اور جو بدل نہ سکے ناں ثانیہ! وہ محبت نہیں ہوسکتی۔'' اس کا انداز مدبرانہ تھا۔

''بہت اچھی بات ہے، میری دعائیں ساتھ ہوں گی تمہارے۔'' ثانیہ نے حوصلہ افزا انداز میں مسکرا کر کہتے اُسے دیکھا اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''ماموں خود اسے وہاں چھوڑنے آئے تھے۔ علی شیر ان کے ہمراہ حرم کو دیکھ کر جتنا بھی جز بز ہوا ہو مگر کچھ کہنے سے البتہ گریز برتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ حرم نے جاتے ہی گھوم پھر کے اس کا چھوٹا سا مگر بے حد خوبصورت گھر دیکھا تھا۔ اپنائیت کے ساتھ ملکیت کا احساس اسے اپنے اندر سرائیت کرتا محسوس ہوتا رہا۔ بیڈروم کی کلر اسکیم آف وائٹ اور پنک تھی۔ خواب سا ماحول بہت آسودگی کا باعث بن رہا تھا۔ اس نے فی

الحال اپنا بیگ ایسے ہی رکھ دیا تھا اور خود کچن میں آ گئی تھی۔ شیر جب گھر آیا وہ کچن میں ہی تھی۔ دس منٹ بعد چائے لے کر آئی تو ماموں اسے حرم کی یہاں موجودگی کی اطلاع دے چکے تھے۔ حرم نے خود کچن میں سن لی تھی۔ جواب میں خاموش تھی جس میں ناگواری تھی یا کچھ اور وہ نہیں سمجھ پائی البتہ جس وقت وہ چائے لے کر لاؤنج میں پہنچی علی شیر نے جس ایک نگاہ سے اسے نوازا تھا۔ اس میں ہرگز بھی کوئی قبولیت اور گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ بلیک ڈریس پینٹ ہلکی آسمانی شرٹ، میرون ٹائی کا پھندا ڈھیلا ہو کر گلے میں لٹک رہا تھا۔ کوٹ گود میں پڑا تھا۔ بال بکھر کر ماتھے پر آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی...... وہ متاثر کن حد تک وجیہہ نظر آنے لگا تھا۔

''کھانا پکانے کو رہنے دینا پتر، یہ ہوٹل سے لے آئے گا۔ اتنے لمبے سفر سے ویسے ہی تھکی ہوئی ہو۔ پھر آتے ہی کام سے لگ گئی۔ بس اب آرام کرلو ذرا۔'' ماموں نے اس سے چائے کا مگ لیتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی محبت پر اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو اٹھ کر وہاں سے آ گئی۔ کمرے میں آ کر اپنا سوٹ کیس کھولا۔ پھر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا ابھی یقیناً شیر بھی کمرے میں آتا۔ وہ اس سے سامنے کو ہرگز تیار نہیں تھی۔ سب کچھ ویسے ہی چھوڑ کر دوبارہ باہر آ گئی۔ شیر سے اس کا سامنا لاؤنج اور ہال کمرے کے مشترکہ دروازے پر ہوا تھا۔ دونوں ہی کترائے تھے اور اپنی اپنی راہ ہو لیے۔ حرم نے چائے کے برتن اٹھاتے دیکھا۔ ٹی وی آف تھا اور ماموں صوفے پر ہی سر کے نیچے کشن رکھے خراٹے لے رہے تھے۔ ہیٹر کی تپش بڑھا کر وہ ٹرے سمیت کچن میں آ کر کھانے کی تیاری کے پہلے مرحلے میں مختلف کیبنٹ کھول کھول کر مطلوبہ اشیاء نکال رہی تھی۔ جب آہٹ پر بے ساختہ متوجہ ہوئی۔

''تم نے سنا نہیں کیا کہا ہے بابا نے؟ ویسے بھی یہاں اپنے سگھڑاپے کی دھاک بٹھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر یہ بندھن تمہارے لیے زبردستی کا ہے تو اسے دل سے میں نے بھی نہیں باندھا ہے۔''

چوکھٹ پر وہ اکھڑے سرد اور بیگانے تاثرات سمیت موجود حوصلہ شکن انداز میں بات کر رہا تھا۔ حرم ٹکر ٹکر اس کی صورت تکتی رہ گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ قطعی سمجھ نہیں سکی اس صورتحال کو کیسے سنبھالے۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتی وہ انہی برفیلے جامد احساسات کے ہمراہ جھٹکے سے پلٹ گیا۔ وہ تھکی تھکی وہیں کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

حرم نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور آگے بڑھ کر کافی کا مگ اس کے نزدیک میز پر رکھ دیا۔ علی شیر جیسے جھکا ہوا کچھ لکھنے میں مصروف تھا ویسے ہی مصروف رہا۔ وہ بار ہا منع کرنے کے باوجود اس کا ہر کام کیے جاتی تو شیر نے چپ سادھ لی تھی۔ اُن کی زندگی یونہی گزر رہی تھی۔ بے رنگ، بے معنی، پر جمود، حرم ہر روز اس سے بات کرنے کا سوچتی، حوصلہ باندھتی مگر اس کے سامنے جاتے ہی ہر حوصلہ ٹوٹنے لگتا۔ اس کے تاثرات ہی اتنی بیگانگی لیے ہوئے تھے کہ وہ کنفیوژ ہو جایا کرتی۔

''علی شیر......!'' کتنی دیر اس کے پہلو میں کھڑی انگلیاں چٹخانے کے بعد اس کی توجہ حاصل ہونے کی خواہش منہ رہ کر اس نے بالآخر مضطربانہ انداز میں پکار لیا۔ علی شیر کا انہماک ذرا سا ایسے بکھرا کہ کتاب سے نگاہ ہٹا کر لمحہ بھر کو اسے دیکھا

تھا اور پھر وہی عالم......

''مم...... مجھے بات کرنی ہے آپ سے۔''
اس کے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ شیر کی پیشانی پر بل پڑے۔

''تو کرو، تمہیں میرے کان بند لگتے ہیں؟''
وہ تڑخا اور کافی کا مگ اٹھالیا۔

''مم...... مجھے معاف کردیں۔ اس سب کے لیے جو......''

''اس کی ضرورت نہیں ہے باقی! محترمہ آپ کو نہیں لگتا پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی گزر چکا۔ سارے دھان ہی خشک ہوگئے ہیں۔ کم ازکم آپ کے لیے یہاں کچھ نہیں بچا۔'' اس نے اپنے دل کے مقام کی جانب اشارہ کیا تھا۔ حرم چند لمحوں کو بری طرح سے شرمندہ ہوکر رہ گئی۔ پھر کچھ ہونق کچھ بے بس سی ہوکر گویا ہوئی تھی۔

''لیکن اس طرح کب تک چلے گا؟ آپ خفا ہیں تو میں......''

''جب تک تم چلانا چاہو۔ یہ تمہارا اسٹیمنا ہے۔ میں بہرحال اب تمہارے ہاتھوں میں مٹی کا کھلونا نہیں بن سکتا۔ مجھے اپنی زندگی اپنے انداز میں گزارنی ہے۔ میں عائزہ سے شادی کا وعدہ کرچکا ہوں۔ بابا اپنی سی کرچکے، اب میری باری ہے تم اگر یہ سب برداشت نہیں کرسکتیں تو خوشی سے جاسکتی ہو۔ واپس امی بابا کے گھر یا پھر اپنے والدین کے ہاں۔'' وہ اپنی بات مکمل کرکے اسے یوں دیکھنے لگا۔ گویا اس کی رائے جاننا چاہتا ہو۔ حرم فق چہرہ لیے کھڑی تھی۔ وہ ناراض تھا، وہ جانتی تھی مگر وہ نہیں مانے گا وہ یہ نہیں جانتی تھی اسے لگا وہ کھڑی نہیں رہ پائے گی۔ جبھی لڑکھڑاتے قدموں سے پلٹ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ وہ ساری رات اس نے جاگ کر اور رو کر گزاری تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح وہ معمول کے مطابق نہیں جاگ سکی۔ نہ ناشتہ بنایا اسے یہ بھی خبر نہیں تھی شیر کب گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا ہنوز تھا۔ سر بھاری اور جسم انگارہ محسوس ہورہا تھا۔ حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے جیسے، وہ بے حس بنی پڑی رہی۔ نقصان کا احساس جان لیوا تھا۔ اب تو واپسی کے راستے بھی مسدود تھے۔ وہ جانے انجانے میں ہی بہت سے نقصان اپنی جھولی میں ڈال بیٹھی تھی۔ خوف تھے کہ جان نکال رہے تھے، اگر وہ واقعی شادی کرلیتا تو...... اس کی جگہ تو کہیں نہیں تھی۔ وہ تو اب نظر نہیں آتی تھی اسے بعد کا کیا سوال...... وہ ایک بار پھر بے بسی کی انتہا پر جاکر سسکنے لگی۔ سر میں جیسے دھماکے ہونے لگے تھے۔ پیاس کا احساس بھی شدید تھا اور معدے میں بھوک کے باعث بھی اینٹھن ہورہی تھی لیکن وہ بے حس بنی پڑی رہی۔ یہاں تک کہ نقاہت پھر سے اسے غافل کرنے کا سبب بن گئی تھی۔

''السلام علیکم!'' وہ کالج سے نکل کر پارکنگ میں اپنی گاڑی کی جانب آرہا تھا جب مسلسل بجتے فون کو کوٹ کی جیب سے نکال کر بابا کی کال ریسو کی۔ جتنی بھی ناراضگی تھی، مگر لحاظ ہمیشہ ملحوظ رکھے جاتے تھے اُن کے ہاں۔

''کہاں ہو تم؟ حرم خیریت سے ہے؟ فون نہیں اُٹھارہی وہ نہ ہی دروازہ کھولتی ہے۔ ہم کب سے تمہارے گھر کے باہر کھڑے ہیں۔ کہیں باہر تو نہیں نکلے ہوئے تم اُسے لے کر ساتھ؟'' اس کے سلام کا جواب عجلت میں دے کر وہ تیز تیز شروع ہوئے تھے۔ شیر کا ماتھا ٹھنکا تھا یہ سب سن کر۔

''نہیں، میں تو کالج سے آف کے بعد گھر آنے لگا ہوں وہ گھر پر ہی تھی۔''

''گھر پر ہوتی تو دروازہ نہ کھولتی، فون ہی اٹھالیتی۔'' ابا بھڑکے، اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''آپ خیریت سے آئے ہیں؟ میرا مطلب......؟'' وہ گڑبڑایا۔ اگر برامان لیتے تو لینے کے دینے پڑ جاتے کہ اپنے گھر باپ کا آنا بیٹے کو گوارا نہیں۔

''تیری پھوپو آئی ہے تمہیں تو توفیق نہیں ہوسکتی تھی کہ خیر خبر رکھو ہماری، وہ تو ماں ہے، بیٹی سے ملنا چاہتی ہے۔'' جواباً وہ پھر طنزیہ ٹون میں شروع ہوئے، شیر سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

''میں پہنچ رہا ہوں کچھ دیر میں چابی ہے میرے پاس، صبح جب نکلا تو سو رہی تھی وہ۔ جبھی تالا لگا دیا تھا اگر نہیں دروازہ کھلتا تو تھوڑا انتظار کرلیں۔'' اس نے کہہ کر عجلت میں فون بند کیا اور گاڑی کو گیئر میں ڈال کر اسپیڈ بڑھا دی۔ راستے بھر بھی اُلجھتا رہا تھا۔

''آخر وہ کیوں دروازہ نہیں کھول رہی تھی۔ صبح بھی وہ نہیں اٹھی تھی۔ اور یہ خلافِ معمول تھا۔ اسے اِس کا رات سے ستا ہوا چہرہ یاد آیا ساتھ ہی اپنی باتیں بھی، تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔

''کہیں محترمہ اُلٹا سیدھا قدم نہ اٹھا چکی ہوں۔'' اس نے متفکر انداز میں سر جھٹکا تھا۔ گھر پہنچا تو اسے سب کے درمیان گھرے پایا تھا۔ بکھرے بال، متورم چہرہ...... صاف لگتا تھا کسی دھچکے سے گزر چکی ہے۔

''غضب خدا کا، اتنا بخار تھا بچی کو ایک طرح سے بے ہوش پڑی تھی۔ اگر ہم نہ آتے تو جانے کیا ہوجاتا۔ وہ تو فون کی بیل مسلسل چیختی رہی اور بے چاری نے ہمت کرکے دروازہ کھول دیا۔ تم اسے ایسے چھوڑ کر کیسے چلے گئے شیر؟'' بابا کے ساتھ اماں نے بھی آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ جز بز ہوتا پھوپو سے احوال دریافت کرنے لگا۔ جو بہت خندہ پیشانی سے گلے لگا کر محبت سے ملی تھیں۔

''ارے کچھ نہیں ہوا بھائی جان! بتا تو رہی ہے حرم کہ اچانک طبیعت خراب ہوئی تھی وہ بھی شیر کے جانے کے بعد۔'' انہوں نے بھائی کی بڑبڑاہٹ کو ٹوکنے کو کہا تھا۔ علی شیر کی بے اختیار نگاہ اٹھی تھی۔ وہ بکھرے ہوئے ریشمی بال سمیٹتی ہونٹ کچل رہی تھی۔ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی مگر عنابی لباس میں اپنی دہکی ہوئی رنگت کے ساتھ شعلہ ساماں تھی گویا، آج بھی براہِ راست دل پر کمند ڈالتی ہوئی۔

''چلو اب ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ، دوا لاکے دو، حد ہوتی ہے لاپرواہی کی بھی۔'' ماموں کا غصہ ہنوز قائم دائم تھا۔ حرم سٹپٹا گئی۔ اور بے اختیار خائف ہوتے اُسے دیکھا۔ جو ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔

''نہیں، نہیں ماموں جان! میں اب بہت بہتر ہوں۔ دوا لی ہے ناں آپ کے سامنے۔''

''میں ذرا اپنے کمرے میں جارہا ہوں، فریش ہوجاؤں۔'' اس نے کسی کو بھی مخاطب کیے بغیر کہا تھا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے ماموں کی سخت سست اماں کی شرمندگی کے ساتھ حرم کی گھبراہٹ اور ممی کا اضطراب باقی رہ گیا تھا۔

اس کی طبیعت کے پیشِ نظر ممی نے کچن کا کام اس کے ساتھ مل کر سمیٹا تھا۔ اس کے بعد لاؤنج میں ان سب نے مل کر ہی کافی پی تھی۔ تب وقتاً فوقتاً حرم نے شیر کی پرتپش نظروں سے اپنا چہرہ جلتا محسوس کیا تو چونک چونک گئی تھی۔ وہ جب بھی نگاہ اٹھاتی اسے پہلے سے اپنی جانب تکتا پاکر کتنا

حیران ہوئی اور گھبرائی تھی۔ یہ حرکت خلافِ عادت تھی۔ ورنہ وہ اسے اب تک بری طرح سے نظر انداز کرتا آیا تھا۔ حرم کے لیے ان نگاہوں کا مفہوم سمجھنا دشوار ہوا جا رہا تھا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آتی تھی ان خشمگیں نگاہوں کا مطلب کیا ہے۔ وہ اسی اُلجھن میں تھی کہ ممی کے بعد ماموں ممانی کے آرام کرنے کے ارادے سے اٹھنے پر خود بھی کمرے میں چلا گیا تھا۔ جبکہ حرم تو پہلے ہی کچن میں برتن رکھنے کے بہانے وہاں سے جا چکی تھی۔ برتن دھو کر خشک کرنے کے بعد ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر وہ لائٹ بند کرتی آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئی اور دھیمی آواز میں پھر ٹی وی آن کر لیا۔ آج یہ تو طے تھا کہ وہ حسبِ سابق دوسرے کمرے میں جا کر نہیں سو سکتی تھی۔ دوسرے بیڈ روم میں ممی جبکہ گیسٹ روم میں ماموں ممانی جا چکے تھے۔ مصلحتاً یا پھر مجبوراً اسے شیر کے پاس ہی جانا تھا مگر حوصلہ کہاں سے لاتی۔

''اُٹھ کر کمرے میں آؤ۔'' سوچوں میں اُلجھی مضطرب وہ جیسے وہاں ہو کر بھی موجود نہیں تھی۔ جب اپنے نزدیک شیر کی سرد آواز سن کر ہڑبڑا کر رہ گئی۔ وہ جانے کب نزدیک آن کھڑا ہوا تھا کہ خبر تک نہ ہو سکی۔ حرم اس کے خطرناک حد تک سنجیدہ تیور دیکھ کر جان لیوا ہوتی محسوس کرتی بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ٹھہرا نہیں تھا۔ واپس پلٹ گیا تو مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق حرم کو بھی اس کے پیچھے قدم اٹھانے پڑے تھے۔

''جتنی بھی مجبوری اور ناگواری میں یہ بندھن باندھا ہو۔ مگر میرا خیال ہے محترمہ آپ کو اس کے تقاضوں کا لحاظ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔''

کھٹاک سے دروازہ بند کر کے لاک لگاتے ہوئے وہ ایک طرح سے اس پر برس پڑا تھا۔ حرم نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے۔ وہ یونہی تن فن کرتا جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔

''کچھ لوگ ظالم ہو کر بھی مظلومیت کا پرچار ضروری سمجھتے ہیں اور مجھے ایسے لوگوں سے بہت شدید نفرت ہے۔'' وہ پھر اسی شدید لہجے میں بولا تھا۔ حرم کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا مگر ضبط کا دامن نہیں چھوڑا۔

''مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔'' وہ منمنائی۔ شیر نے جواباً کھا جانے والی نظروں سے نوازا تھا اسے۔

''یہ سب اسی طرح بہت عرصہ تک نہیں چل سکتا۔ میں سمجھتی ہوں اس کا حل نکلنا چاہیے۔ آپ شادی کرنا چاہتے ہیں دوسری کر لیں۔ مجھے ہرگز اعتراض نہیں ہے۔'' وہ اس سے نگاہ ملائے بغیر بہت جرأت سے بول گئی تھی۔

شیر نے کسی قدر دھیان سے مگر ابرو اچکا کر اُسے دیکھا۔ اور یونہی دیکھتا رہا تھا۔ پھر اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے نزدیک آن ٹھہرا۔ اس طرح کہ زبردستی اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا۔

''اچھا...... اور تم......؟'' اس کا لہجہ جتنا ٹھہراؤ لیے تھا۔ اسی قدر طنزیہ بھی تھا تیکھا بھی۔

''میں...... میں ممی کے ساتھ واپس چلی جاؤں......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ شیر کا ہاتھ ایسے ہی اچانک اٹھ گیا تھا اس پر کہ وہ لڑکھڑا کر سنبھلے بغیر صوفے پر گر سی گئی۔ گال پر ہاتھ رکھے، حواس باختہ سراسیمہ، ششدر دوسری جانب علی شیر تھا۔ جس کا خون ہنوز کھول رہا تھا اور چہرے پر جیسے کوئی آگ سی دہک رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور اسی ہیجان آمیز انداز میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر ایکدم جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

''یہ ہے تمہارے نزدیک میری حیثیت و

اہمیت حرم بیگم! تم آج بھی مجھے کھلونا سمجھ کر کھیلنا چاہتی ہو۔ کیا مجبوری تھی پھر یہ بندھن کیا فرق پڑا تمہیں؟ پہلے کیوں نہ چلی گئیں واپس؟''
آنکھوں میں اترتے خون کے ہمراہ وہ تیز چلتی سانسوں کے درمیان سوال پر سوال کر رہا تھا۔ حرم سکتہ زدہ تھی۔
''وہ سب احمق تھے۔ جن کا خیال تھا کہ تم بدل گئیں۔ تمہاری واپسی کو جو تمہاری محبت کی ہار سمجھ کر خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پاگل تو میں تھا جس نے پھر دھوکہ کھایا اور خود کو تمہارے حوالے کر دیا کہ تم پھر مجھے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر لو مگر میں نے جانا تم جیسے لوگ محبت نہیں کرتے اتنے سالوں کے انتظار کا یہ حاصل تھا کہ تم بجائے شرمندہ ہونے کے اُلٹا مجھے فیصلے سنا رہی ہو کل کی طرح، مجھے بتاؤ گی کہ میری زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار تم نے کیسے اپنے پاس سمجھ لیا؟''
حرم پتھرائی ہوئی سی اُس کی ہذیانی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ حیرت، غیر یقینی، خوشی، مسرت انبساط، کیا کچھ نہ تھا اس کے دل کو اپنے حصار میں باندھتا ہوا۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ جو کچھ وہ اتنے غصے میں کہہ چکا وہ سچ ہی ہے۔ یعنی وہ اسی کا منتظر تھا اس کا متلاشی تھا۔ معاً علی شیر نے ہونٹ بھینچے اور اُسے جھٹک دیا۔ یوں سر جھٹکا گویا اپنی بے اختیاری پر نادم ہو۔ فاصلہ بڑھایا اور واش روم میں جا کر بند ہو گیا۔ حرم وہیں صوفے پر بیٹھی اپنا بے قابو دل اور دھڑکنیں سنبھالتی خود کو یقین دلاتی رہی کہ وہ ہاری نہیں ہے۔ بلکہ ہارتے ہارتے جیت گئی ہے۔ اب اسے ہرانا اور گریز بھلا کر اسے منانا تھا۔ اس کے پاس یقین و اعتبار کی طاقت آ گئی تھی۔

''شیر...... آئی ایم سوری!'' وہ واش روم سے باہر آیا تو حرم نے لپک کر اس کا بازو تھاما تھا علی شیر کے چہرے پر مجروح سی مسکان بکھری۔ اذیت سے لبریز شکستہ......
''اک کمزور لمحے نے مجھے اگر تم پر عیاں کر دیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب تم مجھ پر ترس کھاؤ۔'' اس کا لہجہ زہر خند ہو گیا تھا۔ بازو چھڑا کر وہ آئینے کے آگے کھڑا ہو کر گیلے بال بنانے لگا۔
''ایسا کیوں کروں گی میں؟'' وہ جھنجلائی۔
''میں محبت کرتی ہوں آپ سے، اگر ایسا نہ ہوتا تو شادی کرتی بھلا؟'' وہ مسکرائی تھی۔ شیر نے برش ٹیبل پر پھینکتے ہوئے آئینے میں سے اک نگاہ اُسے دیکھا۔
''اس بات کی گواہی ثانیہ بھی دے گی آپ کو۔'' اس نے جیسے صفائی دی۔
''مجھے کیا ضرورت ہے گواہیاں اکٹھی کرنے کی۔ صورتحال کھل کر میرے سامنے ہے۔ اگر کسی کو میری ضرورت ہوتی تو مجھ سے رجوع کیا جاتا۔ محبت میں اَنا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر یہاں مجھے دوسری شادی کی اجازت دی جا رہی تھی۔ خود واپس جانا چاہتی ہیں آپ۔ محترمہ یہ آپ کا صبر تو ہو نہیں سکتا۔ جان چھڑانے کا طریقہ کہا جا سکتا ہے۔'' اس کا لہجہ ہنوز تپا ہوا تھا حرم بری طرح خفت زدہ ہوئی۔
''اور پھر کیا کرتی میں؟ آپ نے ذرا سی بھی گنجائش چھوڑی تھی جو میں حوصلہ دکھاتی۔'' اسے رونا آنے لگا۔
''پہلے آپ میری واپسی کے باوجود اپنا رشتہ کہیں اور کرانے پر تل گئے تھے۔ صرف یہی نہیں اگر حادثاتاً یا معجزانہ طور پر شادی ہو بھی گئی تو بجائے

غلط فہمی دور کرنے کا موقعہ دیتے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں یہاں آئی...... منانا چاہا تو......'' اس کی بات مکمل نہیں اور موٹے موٹے آنسو گالوں پر اتر آئے۔ جنہیں گالوں سے پونچھے بغیر مزید شاکی ہونے لگی تھی۔

'' مجھے گمان تک نہیں تھا آپ اتنے سنگدل ہوں گے۔ نہ ہی آج سے قبل کسی نے مجھے اتنی بری طرح سے ذلیل کیا تھا۔ آخر کیا کرتی پھر میں، اور یہ آخری والا فیصلہ تو ویسے بھی میں نے آپ کو خوشی دینے کو ہی کیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ...... میں ہمیشہ آپ کے دکھ اور ٹینشن کا باعث ہی بنی ہوں۔''

لانبی ریشمی پلکوں کو اٹھاتی گراتی وہ موم کی گڑیا لگتی تھی۔ گلابی نازک اور سانچے میں گھڑی ہوئی علی شیر کا دل سینے سے ڈگمگانے لگا۔ وضاحتیں دیتی، صفائیاں پیش کرتی اعتبار دلاتی، یقین سونپتی یہ لڑکی کم از کم اس وقت ضرور پوری طرح اس کے حواسوں پر سوار ہو رہی تھی۔ اتنا کہ وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ پا رہا تھا۔

'' یہاں آؤ۔'' وہ اسے یک ٹک دیکھتا ہوا بھاری بھرکم آواز میں بولا تو حرم چونکی۔ اس کا انداز بدلا محسوس کیا تو یکلخت رشتے کے احساس نے گھبراہٹ طاری کر دی۔

'' جی......؟'' وہ ہڑبڑائی تھی۔ کترائی اور گھبرائی۔

'' مجھے تمہاری باتوں کی اتنی دور سے سمجھ نہیں آ رہی۔ غالباً تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تمہیں بھی بالآخر مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ کب...... کیسے؟ یہ نہیں بتایا؟''

ماحول کی خوبصورتی دونوں جانب کی آمادگی، تنہائی...... وہ مزید ممکن ہی نہ تھا خود پر ناراضگی کا چولا چڑھائے رکھتا۔ حرم کی خفت اور شرم سے بری حالت ہونے لگی۔ پلکیں لرز کر عارضوں پر گریں اور گویا ایک حشر اٹھانے لگیں۔ اس کے گریز کو پاتا علی شیر خود اُٹھ کر اس کے نزدیک آ گیا۔

'' چلو یہ داستان میں پھر کبھی فرصت میں سنوں گا۔ ابھی تمہارے اطمینان کو اتنا بتا دوں کہ عائزہ نام کی کسی لڑکی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ پیکر خیالی تھا جسے میں نے ایک پتھر کی مورت کی انا کو توڑنے کے لیے بنایا تھا۔ شاید کچھ فرق پڑ جائے مگر اپنے ایسے نصیب کہاں۔'' اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بہت دھیان سے تکتے وہ نرم گرم انداز میں گویا ہوا۔ حرم نے یکدم اُسے دیکھا تھا پھر یکدم جیسے ہلکی پھلکی ہو کر ہنس دی۔

'' ارے...... پھر تو بہت چالاک نکلے آپ...... میں تو معصوم سمجھتی تھی رہتی......'' علی شیر نے اس کی اس بات پر اسے مصنوعی انداز میں گھورا۔

'' آج میں نے پھوپو جان کی آنکھوں میں تمہاری شادی شدہ زندگی کے حوالے سے بہت تشویش اور پریشانی دیکھی ہے۔ مجھے امید ہے کل تمہارا چہرہ دیکھ کر وہ سارے خدشات بھول جائیں گی۔ ہے ناں، کہ اتنی ہی خوشی اور روشنیاں ہوں گی اس پر۔''

وہ اس پر جھک کر بوجھل آواز میں بولا تھا۔ حرم جواب نہیں دے سکی۔ شرم سے جھینپ کر بس اس کے کاندھے پر ہاتھ کا مکا مار دیا تھا۔ تھوڑی سی انا تھوڑی سی نرمی اگر بروقت اختیار کر لی جائے تو بہت بڑے بڑے نقصانات کی شروعات کو ازل سے ہی روکا جا سکتا ہے۔ یہی کامیابی کا گر ہے۔ اگر کوئی سمجھ لے تو۔

☆☆......☆☆

افسانہ

حنا اصغر

مینا کی گڑیا

''گڑیا بیٹا کیا ہوا ہے۔ تم پریشان ہو کیا؟'' مینا نے اُس کو پُر سوچ انداز میں بیٹھے دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''امی...... وہ...... وہ م...... مجھے صفدر بھائی اچھے نہیں لگتے۔'' اُس نے ڈرتے ڈرتے سرعت سے کہہ دیا۔ مینا اُس کی بات کو سننے کے بعد ہنسنے لگی۔ وہ جانتی تھی......

مئی کی چلچلاتی دوپہر تھی۔ سب گھر والے سو رہے تھے اُس نے ایک دو بار اُٹھ کر امی کی جانب دیکھا اُن کے ہلکے ہلکے خراٹے اُس کو اس بات کی یقین دہانی کرا چکے تھے کہ وہ خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تاکہ اگر اُن کے جاگنے کا ہلکا سا گمان بھی ہو تو سرعت سے پانی پینے کا عذر تراش لیا جائے۔ پھر اُس نے سامنے بیڈ پر نظر دوڑائی۔ جہاں صدف باجی اپنا دایاں بازو آنکھوں پر رکھے چت لیٹی ہوئی تھیں وہ آہستگی سے بیڈ سے نیچے اتری پاؤں میں جوتی اڑسی اور بغیر آواز کیے قدموں سے چلتی ہوئی دروازے تک آ گئی تھی اُس نے محتاط نگاہ اُن پر ڈالی تھی اور دونوں کے سونے کا یقین کر کے اُس نے دروازہ بغیر چرچراہٹ پیدا کیے ہوئے کھولا باہر نکلی اور اسی خاموشی سے دروازہ بند کر کے اسٹور روم میں آ گئی۔ وہ اسٹور روم کے آدھ کھلے دروازے سے کبھی کبھار جھانک لیتی تھی اور پھر سے اپنے کام میں مگن ہو جاتی تھی۔ پچھلی بار اُس نے کمال مہارت سے صدف باجی کی سرخ قمیض پر اپنے ہاتھ صاف کیے تھے۔ لیکن کام میں اناڑی ہونے کی وجہ سے اُس کی چوری اس وقت پکڑی گئی تھی جب وہ اپنی گڑیا کی شادی عاصمہ (کزن) کے گڈے سے کر رہی تھی۔ اور عین رخصتی کے وقت صدف نے اُس کی گڑیا کو اس سرخ چنگھاڑتے ہوئے رنگ میں دیکھ لیا تھا جس کی قمیض کو وہ دو ہفتوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئی تھی۔ صدف نے تو دل ہی دل میں ہمسائی عائشہ پر اس قمیض کی چوری کا الزام لگا کر اپنے دل میں اس کے لیے کدورت کو پروان چڑھا دیا تھا۔ لیکن مینا کی گڑیا کو اس سوٹ میں ملبوس دیکھ کر اُس کا دبا ہوا سارا غصہ سارا غبار عود آیا تھا۔

وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔

''مینا کی بچی رُک میں تجھے بتاتی ہوں۔'' وہ دیوانہ وار غصے میں بھری اُس کی جانب لپکی تھی لیکن دھان پان اور پھرتیلی ہونے کی وجہ سے مینا نے سرعت سے اپنی گڑیا کو بغل میں دبایا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اسٹور میں جا گھسی تھی اور اس نے خود کو اس اسٹور میں بند کر لیا تھا۔

صدف باجی نے ہر طرح سے اُس کو دھمکایا تھا لیکن کلر پنسلیں نئے بال پوائنٹ تک چھین لینے کی

دھمکیاں دی لیکن وہ مینا ہی کیا جو کسی دھمکی کا اثر قبول کرے وہ باہر نہیں نکلی کتنی ہی بار امی جان نے آ کر یقین دہانی کرائی تھی۔ کہ وہ باہر آ جائے اُس کو کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن وہ مارے دہشت وخوف کے اپنی گڑیا کو سینے سے لگائے فرش پر بیٹھی بیٹھی سوگئی تقریباً چار بجے کے قریب عارف بھائی دکان سے واپس آئے انہوں نے ڈبلی کیٹ چابی کی مدد سے دروازہ کھولا وہ جو غصے میں کھولتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ برہنہ فرش پر مینا کو بے سدھ لیٹا دیکھ کر اُن کا سارا غصہ جھاگ کی طرح نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

انہوں نے جھک کر اُس کو اپنی بانہوں میں بھرلیا سوئے ہوئے بھی وہ اپنی گڑیا کو خود سے جدا ہونے نہیں دے رہی تھی۔ شام کو جب وہ جاگی تو ڈری ہوئی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر صدف باجی نے گھورنے کے علاوہ اُس کو نہ تو کچھ کہا تھا نہ غصہ کیا تھا اور نہ ہی سرزنش کی تھی۔ لیکن آج مینا نے اپنی گڑیا کے لیے بہترین کپڑے کا انتخاب کیا تھا۔ یہ مینا کے اس سوٹ کا دوپٹہ تھا جو اُس کی وادی جان نے پچھلی عید پر اُس کو دیا تھا اس کے دوپٹے کو مینا نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جو کہ دیکھنے میں بالکل نیا تھا صدف باجی نے کتنی ہی بار مینا سے اُس کا دوپٹا مانگا لیکن مینا نے نہیں دیا اور آج پوری دوپہر صرف کرنے کے بعد مینا نے اس دوپٹے سے اپنی گڑیا کے لیے شلوار قمیض اور ایک خوبصورت سا دوپٹہ بنایا تھا جس کے کناروں پر اُس نے بلیک پائپنگ لگائی تھی۔ اس کی گڑیا اس لباس میں بہت خوبصورت اور حسین ترین لگ رہی تھی۔ مینا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کتنی ہی بار اپنی گڑیا کی بلائیں لی۔

☆......☆......☆

اشعر مینا کے بڑے ماموں کا بیٹا تھا انتہائی تیز اور چالاک اور کچھ کچھ بدلحاظ بھی تھا اشعر اور اس کے بہن بھائی جب بھی چھٹیاں گزارنے ان کے گھر

آ تے تھے ایک ہجوم اور طوفان بدتمیزی سا برپا ہو جایا کرتا تھا۔ خاص طور پر اشعر کو مینا اور اُس کی گڑیا سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ مینا کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ کبھی اس کی گڑیا کو چھپا دیتا اس کے رونے پیٹنے پر گڑیا تو واپس کر دیتا لیکن پھر اس کے پیچھے پڑ جاتا تھا کبھی اُس کی چوٹی پکڑ لیتا تو کبھی کرکٹ کھیلتے ہوئے جان بوجھ کر بال کو ہٹ اس جگہ لگاتا جہاں مینا بیٹھی ہوتی۔ کبھی کبھار وہ مینا کی الماری میں گھس کر اُس کی من پسند چیزیں چرانے اور توڑنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔

وہ خود سے اتنے بڑے کزن سے جتنا اُلجھ سکتی تھی اُلجھتی تھی صدف باجی اور امی سے بھی شکایت کرتی لیکن وہ مہمان ہے چلا جائے گا واپس کہہ کر اُس کی بات سنی ان سنی کر دیا کرتی تھیں۔ مینا کو پتہ تھا کہ اشعر اس کے گھر والوں کو بہت پسند ہے وہ اس کی ہر بدتمیزی کو شرارت مان کر درگزر کرتے تھے۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی جب اشعر وغیرہ چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے اشعر کی بڑی بہن رخسانہ باجی کے کہنے پر مینا ان کے ساتھ بازار چلی گئی۔ رخسانہ باجی نے مینا کو اُس کی گڑیا کے لیے کئی جدید کھلونے لے کر دیے۔ وہ خوشی خوشی کھلونوں کا شاپر ہاتھ میں پکڑے ہوئے گھر آئی۔ لیکن اسٹور میں گھستے ہی اس کو شدید گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہاں بکھرے گڑیا کے کپڑے اور کھلونے اُس کو ایک عجیب ہی کہانی سنا رہے تھے۔ کیا ڈھونڈ رہی ہو مینا...... اشعر اس کے عقب میں آ کر بولا تھا۔ ایسے جیسے وہ اُس کا ہی انتظار کر رہا ہو۔

جبکہ وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے فرش پر جا بجا بکھرے گڑیا کے سامان کو دیکھ رہی تھی۔ گھر والے مینا کی اپنی گڑیا سے محبت اور لگاؤ کو سمجھتے تھے لاکھ لڑائیوں کے باوجود بھی کسی نے آج تک اُس کی گڑیا کو اپنے عتاب کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔

''اوہ مینا تمہاری گڑیا کا تو دھیانت ہو گیا ہے مجھے خبر ملی تھی کچھ دیر پہلے......'' وہ انتہائی مکاری و خباثت سے ہنستا تھا۔ مینا اشک بار نگاہوں سے اُس کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو بھائی افضل کے ساتھ مل کر میں نے اُس کی چِتا جلائی ہے۔ تم تو بازار گئی ہوئی تھی۔ اس لیے ارتھی کو کندھا بھی ہم نے دیا ہے۔ وہ اسٹار پلس کے کسی ڈرامے کے مکالموں کو ازبر کیے ہوئے تھا جبکہ مینا نے رو رو کر پورا گھر آسمان پر اٹھا لیا۔

اُس کا یوں دیوانہ وار رونا اور بھکوں بھکوں رونا اشعر کو حیران کر گیا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر جو تحریر ابھری تھی مینا کے حوالے سے اُس کو سوچ کر ہی وہ حیران رہ گیا۔ پہلی بار اشعر کو برا بھلا کہا گیا۔ لیکن وہ خود اتنا ندامت میں ڈوبا ہوا تھا کہ کسی کے الفاظ بھی اس تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ مینا کو نئی گڑیا تو مل گئی تھی لیکن پہلی گڑیا کو کھو دینے کا قلق جوں کا توں برقرار رہا۔

☆......☆......☆

صدف باجی کی شادی کے بعد امی جان کو مینا کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ بڑے ماموں نے اشعر کے لیے مینا کا ہاتھ مانگ کر اُن کی مشکل آسان کر دی تھی اشعر بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھا اس لیے بغیر سوچ و بچار کے گھر والوں نے ہاں کر دی یوں مینا کی شادی دھوم دھام سے اشعر سے ہو گئی۔ اشعر ایک بہترین شوہر ثابت ہوا تھا۔ دس سالوں میں اُن کے تین بچے ہوئے بڑی بیٹی مریم جس کو مینا گڑیا کہہ کر بلاتی تھی اور پھر دو بیٹے علی اور حذیفہ تھے۔ گڑیا انتہائی حساس اور ہر ایک کی پرواہ کرنے والی بچی تھی۔ گڑیا چونکہ ان کی فیملی کی بڑی لڑکی تھی اس لیے افضل (جیٹھ) کی بیوی کے کام بھی کر دیا کرتی تھی۔ مینا نے گڑیا کو کبھی تائی کا ہاتھ بٹانے سے نہیں روکا حالانکہ انہوں نے

ایک مستقل ملازمہ بھی رکھی ہوئی تھی لیکن گڑیا کو وہ اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھیں۔ جس پر اعتراض نہ کبھی اشعر نے کیا اور نہ ہی مینا نے۔

کچھ دنوں سے مینا کو گڑیا کچھ جھنجلائی ہوئی کچھ کچھ پریشان اور اُلجھی اُلجھی سی نظر آرہی تھی۔ اس کے بارہا پوچھنے پر وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتی ایسے جیسے بات کا سرا ہاتھ میں رکھنے کے باوجود بھی اِس کو نہ تھمانا چاہتی ہو۔

''گڑیا بیٹا کیا ہوا ہے۔تم پریشان ہو کیا؟'' مینا نے اُس کو پُرسوچ انداز میں بیٹھے دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''امی...... وہ ...... وہ م...... مجھے صفدر بھائی اچھے نہیں لگتے۔'' اُس نے ڈرتے ڈرتے سرعت سے کہہ دیا۔ مینا اُس کی بات کو سننے کے بعد ہنسنے لگی۔ وہ جانتی تھی صفدر غصے کا تیز ہے اور گھر کا ہر بچہ اُس سے ڈرتا تھا۔

''لو میری گڑیا اتنی سی بات پر گھبرا گئی تم اس سے بات ہی نہ کیا کرو۔'' مینا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور سر جھٹک کر کچن میں چلی گئی۔

☆......☆☆

''گڑیا...... گڑیا بیٹا کہاں ہو؟'' مینا ابھی کچن سے باہر آئی تھی۔ آج اُس نے گڑیا کی من پسند بریانی بنائی تھی لیکن گڑیا اپنے پورشن میں نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

''حذیفہ گڑیا باجی کہاں ہے؟'' مینا نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ٹی وی پر کارٹون دیکھتے حذیفہ سے پوچھا۔

''امی اُن کو صفدر بھائی بلانے آئے تھے تائی جان بلا رہی تھیں، وہ چلی گئی ہیں۔'' حذیفہ نے جواب دیا تھا۔

''ایک تو یہ عشرت بھابی بھی ناں نوکر ہی سمجھ لیا ہے میری بیٹی کو۔'' وہ ہڑبڑا کر ان کے پورشن کی جانب بڑھی۔ ان کے پورشن کے اختتام پر ایک چھوٹا سا باغیچہ بنایا گیا تھا جہاں آم اور جامن کے درخت تھے ان درختوں کے پیچھے ایک طویل راہداری کے بعد عشرت کا پورشن شروع ہوتا تھا۔ جامن کے موٹے درخت کے پیچھے اُس کو گڑیا کا دوپٹہ لہراتا ہوا نظر آیا۔

''لو یہ یہاں کھیل رہی ہے محترمہ......'' وہ آگے کو بڑھی۔ لیکن کچھ ہی فاصلے پر اُس کو ٹھٹک کر رُک جانا پڑا گڑیا کا ہاتھ صفدر کے ہاتھ میں تھا اور وہ مسلسل رو رہی تھی اور صفدر اُس کو دھمکا رہا تھا وہ اس پر دھاڑ رہا تھا۔ مینا کو کچھ دن پہلے گڑیا کا کھویا کھویا سا انداز یاد آنے لگا۔ وہ ان دونوں کے عین سامنے جا ٹھہری۔ گڑیا بھاگ کر اُس سے لپٹ گئی۔ جبکہ صفدر کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔

''وہ چچی...... میں...... میں...... وہ......'' وہ گھگھیا رہا تھا جب اس سے کوئی عذر نہ بن پایا تو بھاگ گیا جبکہ گڑیا روتے ہوئے اس سے لپٹ لپٹ جاتی۔ مینا کو بے ساختہ اپنی وہ گڑیا یاد آئی جس کی وہ بچپن میں حفاظت کیا کرتی تھی ہر سرد و گرم سے اِس کو بچاتی تھی اس کو اسٹور روم میں چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ اُس کو کیوں مریم کی بدحواسیاں اُس کا اُلجھا پن نہیں ٹھٹکا۔ مائیں تو بیٹیوں کی چال سے اُن کی سمت کا اندازہ لگا لیتی ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کی نشست و برخاست سے لے کر بات کرنے کے انداز و اطوار میں چھپا ہوا خوف بھانپ لیتی ہیں۔ اُس کی گڑیا اتنے دنوں سے برزخ میں خود کو جھلسا رہی تھی اور وہ جان بھی نہیں پائی جو کوتاہی ہو چکی تھی وہ اُس کو نہیں دہرائے گی وہ اپنی گڑیا کی حفاظت ویسے کرے گی جیسے اپنی جان گڑیا کی حفاظت کرتی تھی ایک ہلکی سی چوک نے اشعر کو اُس کی بے جان گڑیا کو توڑنے کا موقع دیا تھا اور آج ہلکی سی کوتاہی نے یہی موقع صفدر کو فراہم کیا تھا کہ وہ گڑیا کو ہراساں کرے لیکن اب ایسا نہیں ہوگا اس نے خود سے مصمم ارادہ کیا اور گڑیا کو خود سے لپٹا لیا۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

سنبل

آنگن کی چڑیاں

دوسرا حصہ

''واہ! شاباش بیٹا شاباش ایک ہی ہفتے میں باپ کو سائیڈ پر لگا کر بیوی کی زبان بولنے لگے۔'' وہ طنز سے بولے۔ ''تو کیا آپ کی طرح بیوی کو سائیڈ پر لگا دوں۔'' وہ بھی انہی کا بیٹا تھا اسی طرح طنز سے بولا اور احسن سلطان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اصفہان کو......

''چل کر دیکھ نہیں لیتے...... آپ نے رشتہ ڈالنا ہے، کیونکہ ماریہ مجھے پسند ہے اور مجھے شادی اسی سے کرنی ہے۔'' اصفہان نے سختی لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا اور عائشہ احسن سلطان کو دیکھ کر رہ گئیں جو کسی گہری سوچ میں تھے۔

☆......☆......☆

پریشے کے آنے سے قبل وہ سب اُردو میں بات کر رہے تھے مگر اس کو آتا دیکھ کر سب سندھی میں گفتگو کرنے لگے۔ اسے سندھی سے تھوڑی بہت شدھ بدھ تھی مگر صرف شدھ بدھ وہ بھی میٹرک تک سندھی پڑھنے کی وجہ سے، مگر اتنی روانی سے بولنے کو وہ سمجھ تو سکتی تھی مگر خود بول نہیں سکتی تھی اور غالباً اس بات سے یہ سب ناواقف تھے۔ اسی لیے اپنا کوئی خاندانی مسئلہ بڑے زور و شور سے نمٹایا جا رہا تھا۔ اس کے قریب آنے پر اماں نے کہا۔

''آ جا پٹ آ جا! اچھا کیا جو یہاں آ گئی دل لگ جائے گا اندر اکیلے بیٹھی بیٹھی بور ہوتی ہوگی۔''

انہوں نے اس کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی۔

''ادی! بڑے جلدی اپنے پاس جگہ دے ڈالی اس جیسی لڑکی کو۔'' چچی نے سلگ کر کہا تو خالہ چچی نے بھی بڑی عجیب نظروں سے اماں کو دیکھا۔

''میرے بیٹے کی زال ہے اس کی جگہ میرے پاس ہی ہے۔'' اماں نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

''زبردستی کی زال۔'' وہ چچی ہی کیا جو چوک جائیں پریشے کو لگتا تھا کہ وہ منہ میں انگارے دبا کے بیٹھی تھیں اور وقتاً فوقتاً سامنے والے پر داغتی رہتی تھیں انہی کی وجہ سے وہ اکثر باہر نہیں نکلتی تھی وہ اکثر اُن کی باتوں کو پی جاتی تھی مگر اس وقت اسے غصہ آ گیا۔

''چچی! آپ مجھ سے اس طرح بات کیوں کرتی ہیں شادی ہوئی ہے میری اسامہ سے، میں بھاگ کر نہیں آئی ہوں۔'' وہ غصے سے بولی تو چچی کے چہرے پر مخصوص چڑانے والی مسکراہٹ آ گئی۔

’’کیسے آئی ہو ہمیں پتہ ہے کیسے زبردستی تمہارے پیو نے اسامہ کے سر تمہیں منڈھا ہے وہ تو خود اس شادی پر راضی نہیں تھا۔ ایسا کیا گناہ کیا تھا تم نے لڑکی۔‘‘ چچی کی زبان نے اس بار زہر نہیں تیزاب اگلا تھا جس نے اس کا وجود جھلسا کر رکھ دیا اسے ایسا لگا کہ جیسے کسی نے بھرے مجمعے میں اس کے سر سے چادر اُتار دی ہو اور وہ ایکدم جھٹکے سے کھڑی ہوئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

’’اور ہاں لڑکی! ہمارے ہاں بڑوں کی عزت کی جاتی ہے۔ اور جو زبانیں حد سے بڑھ جائیں انہیں ہم گدی سے کھینچ کر باہر نکال دیتے ہیں۔‘‘ بابا صاحب نے سرد لہجے میں کہا اور اس کے آنسو اس کے گالوں پر چھلکنے لگے اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور اس منظر کو اندر آتے اسامہ نے بڑے غور سے دیکھا۔

’’فاطمہ ما! کبھی تو اس غریب کو بیٹھنے دیا کر یہاں سب کے ساتھ۔‘‘ اماں کو ملال نے آ گھیرا۔

’’بڑی جلدی بھلا دیا ادی! تم نے سسی کو۔‘‘ خالہ چچی نے دکھ سے کہا۔

’’بھلایا نہیں ہے زینب! لیکن ایک بات سمجھ زینب! مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا بلکہ زندوں کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش کی جاتی ہے۔‘‘ اماں نے کہا اور چچی بڑی مزہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں بہوؤں کو دیکھ رہی تھیں۔ اور تبھی اسامہ ان تک پہنچ گیا۔

’’یہ پرشیے یہاں سے روتی ہوئی کیوں گئی ہے۔‘‘ اس نے آتے ہی سوال داغ دیا۔

’’کیوں؟‘‘ بابا صاحب نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

’’اس لیے کہ اگر آپ لوگوں کا رویہ اس سے درست نہیں ہوا تو میں اسے لے کر شہر شفٹ ہو جاؤں گا۔‘‘ وہ دوٹوک بولا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

’’دھمکی دے رہے ہو؟‘‘ اس کے بڑے بھائی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

’’نہیں اطلاع دے رہا ہوں۔‘‘ وہ بغیر مڑے بولا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ جانتا تھا کہ اس وقت وہ بڑے زور وشور سے رونے میں مصروف ہوگی۔ اور اُس کے وہ آنسو اب اِس کے وجود کو پگھلانے لگے تھے۔ سسی پرشیے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر وہ اس کی اولین عمر کی اس کی کچی عمر کی محبت تھی چاہت تھی جو اب تک پورے طمطراق سے اس کے اندر براجمان تھی مگر اب لگتا تھا کہ وہ محبت اس کے دل کے نہاں خانوں میں اترتی جا رہی ہے اور کوئی اور محبت بڑے دھڑلے سے بنا کسی اجازت کے اس کے دل پر قابض ہو چکی ہے۔ وہ اس طرف سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ سسی کی محبت کو پیچھے دھکیل کر پرشیے کی محبت پورے طمطراق سے اس کے دل پر قابض ہو چکی ہے۔ بلاشرکت غیرے...... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی اتری اور اس کے لبوں سے نکلا ’غاصب‘

☆......☆......☆

احسن سلطان اور عائشہ احسن سلطان کے چچا زاد بھائی کے بیٹے کی بیوی کے انتقال پر گئے تھے ابھی واپس آ کر بیٹھے تھے۔

’’بے چاری بڑی جلدی چلی گئی۔‘‘ عائشہ نے سرد آہ بھری۔

’’ہاں ہے تو مگر جو آیا ہے اس نے جانا تو ہے۔‘‘ احسن سلطان بھی دکھ سے بولے۔

’’اور دونوں بچے تو نیو بورن ہی ہیں۔‘‘

عائشہ کا دکھ کسی طرح کم ہو ہی نہیں رہا تھا۔ واصفہ کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی اور اس کے بعد کسی پیچیدگی کے باعث اس کا انتقال ہو گیا تھا بچے ابھی ہفتہ بھر کے ہی تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی جس گھر میں ہفتہ بھر پہلے جشن تھا وہاں اب سوگ تھا۔

''ہاں وقار کو جلد ہی اپنے لیے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' احسن سلطان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں واقعی بچے بہت چھوٹے ہیں بھابی کی تو اب عمر بھی ایسی نہیں رہی کہ بچوں کو سنبھال سکیں۔'' عائشہ نے کہا۔

''فی الحال تو کسی گورنس کا انتظام کر لیا ہے مگر سب یہی مشورہ دے رہے تھے کہ وقار کا جلد از جلد عقد ثانی ہو جانا چاہیے۔'' احسن سلطان نے بتایا۔

''ہاں یہ بہت ضروری ہے گورنس ماں تھوڑی ہوتی ہے۔'' عائشہ نے کہا۔

''مگر سوتیلی بھی ماں تھوڑی ہوتی ہے۔'' احسن سلطان نے طنزیہ کہا۔

''ماں ماں ہوتی ہے یہ سوتیلا سگا ہمارا ذہنی فتور ہوتا ہے۔'' عائشہ اُن کے طنز کو رد کر گئیں۔

اور فتور ہمیشہ سے عورت میں زیادہ ہے۔'' احسن سلطان استہزائیہ ہنسے اور عائشہ نے سوچا ہاں یہ بھی کسی مرد کا ہی قول ہوگا۔

☆......☆......☆

اور آج غالباً حمیران کو دیر ہو گئی تھی۔ شیلزے نے کلاس لیتے ہوئے سوچا شیلزے حمیران اور مانو وغیرہ سوفٹ ویئر انجینئرنگ پڑھ رہے تھے جبکہ روحیل MBA کا اسٹوڈنٹ تھا اور شیلزے کلاس لے کر نکلی ہی تھی کہ سامنے سے روحیل آتا ہوا نظر آیا۔

''کیا ہوا تمہاری کلاس نہیں تھی؟'' شیلزے نے پوچھا۔

''نہیں سر نہیں آئے۔ فری تھے اس وقت ہم۔'' اس نے خوشدلی سے کہا۔

''حمیران آ گیا۔'' دوسرا سوال روحیل کو کریلا چبانے پر مجبور کر گیا۔

''آ گیا ہے مانو کے ساتھ گپیں لگا رہا ہے۔'' اس نے خود کو کمپوز کر کے کہا اور اس کے ساتھ ہی شیلزے کے رُخ پر روشنی اتر آئی اور روحیل نے دانت پیسے۔

''لاؤ میں تمہاری کتابیں پکڑ لیتا ہوں۔'' روحیل نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر آفر کی۔ جو اس نے لائبریری سے ایشو کروائی تھیں اور شیلزے نے فوراً سے پیشتر وہ بکس اسے تھما دیں۔

''تھینکس......!'' ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کیا۔

''منشن ناٹ...... مجھے تمہارے کام آ کر خوشی ہوتی ہے۔ آئندہ بھی کبھی بھی کوئی بھی کیسا بھی مسئلہ ہو تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو مجھے تمہارے کام آ کر خوشی ہو گی۔'' وہ خوشدلی سے بولا۔

''تھینکس......! مگر یہ سب میں صرف حمیران سے شیئر کرتی ہوں۔'' وہ بولی اور روحیل کے منہ میں کونین کی گولی گھل گئی۔

''تمہاری مرضی......'' اس نے بے دلی سے کہا اور وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اپنے گروپ کی طرف آنے لگے۔

''ارے یہ شیلزے روحیل کے ساتھ کہاں؟'' مانو نے حیرت سے کہا تو حمیران نے سر اُٹھا کر دیکھا اور اس کے رخ پر ناگواری سی اتر آئی۔ جسے مانو نے خاصی دلچسپی سے دیکھا۔

''ارے! تم دونوں ایک ساتھ کیسے؟ کہاں

انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کہاں بزنس ایڈمن ڈپارٹمنٹ۔'' مصطفیٰ نے ان دونوں کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

''دیکھو نو کیئر کرنے والے کیسے کیسے پہاڑ سر کا لیتے ہیں۔'' روحیل نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ اور حمیران کے لب بھینچ گئے اور چہرے پر غصہ اتر آیا اور حمیران کا چہرہ ایک ساتھ دیکھتے ہوئے روحیل اور مانو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ اور وہ لوگ ان سب کے قریب آ گئے۔

''کیا ہوا ہے حمیران! کیا تمہاری کالی گڑی کھو گئی ہے اتنے اُداس کیوں ہو؟'' روحیل نے چوٹ کی۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی سر میں درد ہے۔'' وہ بے دلی سے بولا۔

''اوہ! مجھے دکھ ہوا۔'' روحیل مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''اور یہ لیجیے میڈم آپ کی بکس۔'' حمیران نے کہہ کر وہ شیلزے کی طرف مڑا جس نے فوراً اپنی کتابیں اس سے لینے کو ہاتھ بڑھائے اور حمیران نے سلگتی سی نگاہ بے خبر شیلزے پر ڈالی اور ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں چلتا ہوں۔'' وہ واپسی کے لیے مڑا تو شیلزے نے بھی اس کے ساتھ قدم بڑھائے۔

''کیا بہت زیادہ طبیعت خراب ہے میں چھوڑ دوں۔'' اس نے آفر کی۔

''گاڑی ہے میرے پاس میں چلا جاؤں گا تم دوستیاں نبھاؤ۔'' وہ درشتی سے بولا۔

''کیا ہوا ہے کیا بات ہے۔ میری کسی بات سے ناراض ہو۔'' وہ اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''نہیں دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔'' وہ جل کر بولا۔

''حمیران! مجھے بتاؤ گے تو مجھے پتہ چلے گا ورنہ خود اپنی جان جلاتے رہو گے۔'' وہ رسان سے بولی۔

''میں نے تمہیں منع کیا ہے ناں کہ اس شخص سے دور رہو۔'' وہ غصے میں مگر آواز دبا کر بولا۔

''وہ خود آیا تھا میں نہیں گئی تھی اس کے ڈپارٹمنٹ اور وہ دوست ہے ہمارا ہمارے گروپ میں ہے۔ میں اس سے مس بی ہیو کس طرح کر سکتی ہوں۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''مت کرو۔ مجھ سے قطع تعلق کر لو۔'' وہ بے رحمی سے بولا اور شیلزے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''حمیران! تم نے اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کر دی۔ تمہارا دل نہیں دکھا تمہیں درد نہیں ہوا۔'' وہ بے طرح رو دی۔

''دیکھو شیلزے! میں اپنی چیزوں کے بارے میں بہت پوزیسو ہوں خصوصاً تمہارے لیے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ روحیل ٹھیک لڑکا نہیں ہے۔ اس کے سائے سے بھی دور رہو پھر کیوں؟''

حمیران نے شیلزے کو کاندھوں سے تھام کر کہا۔

''میں کوشش کروں گی اس سے دور رہنے کی۔ تمہارا دل دکھا آئی ایم سوری۔'' شیلزے نے فوراً سوری کر لی اور حمیران مسکرا دیا۔

مانو اور روحیل دونوں کی نظریں انہی پر تھیں ان کے جانے کے دس منٹ بعد وہ دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے مخالف سمت چل پڑے۔

''ہمارا آدھا کام ہو گیا ہے حمیران کے دل میں شک پڑ گیا ہے۔ ویسے یہ مشن اتنا بھی

امپاسبل نہیں ہے۔ جتنا تم نے سمجھا تھا۔'' روحیل مسکرایا۔

''ہاں امپاسبل تو نہیں ہے مگر مشکل ضرور ہے اور حمیران کے دل میں شک نہیں پڑا ہے وہ اپنی چیزوں کے بارے میں پوزیسو ہے اور شیلزے کے لیے تو کچھ زیادہ...... اور وہ تمہیں بھی جانتا ہے، سو غصے میں ہے۔ مگر شک میں نہیں ہے۔ مانو نے کہا اس کی نظروں میں گہری سوچ تھی۔

☆......☆......☆

اس کے کمرے کا دروازہ کسی نے بہت ہولے سے ناک کیا تھا۔

''کون ہے اندر آجائیں۔'' وہ موٹی پتلے پڑھ رہی تھی اس نے کتاب پر نشان لگا کر کتاب بند کردی تو اندر اسامہ داخل ہوا اور اس نے پہلے سے ٹھیک دوپٹے کو مزید پھیلایا۔

''کیا ہو رہا تھا؟'' اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی مطالعہ کر رہی تھی۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''بور تو نہیں ہو جاتیں۔'' وہ بہت شائستگی سے پوچھ رہا تھا اور پرشیے نے نظر اُٹھا کر اس بے حد شاندار شخص کو دیکھا جو کہ اس کا شوہر تھا مگر اس سے صدیوں کی دوری پر کھڑا تھا۔ یہ تکلفات آپ جناب...... کبھی بے حد نرم اور شائستہ کبھی بے حد سخت اور روکھا۔

''بور تو ہو جاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''سب سے ملا کرو...... کمرے میں بند مت رہا کرو۔'' اس نے کہا۔

''سب سے ملوں اور یہ سنوں کہ میں زبردستی اس جگہ پر موجود ہوں جو میری جگہ ہی نہیں ہے جو کسی اور کی جگہ تھی جہاں میں قابض ہوگئی ہوں غاصبانہ طور پر۔'' وہ آزردگی سے بولی۔ اور اسامہ نے ہونٹوں پر بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے تیزی سے رخ بدلا۔

''غلط تو نہیں کہتے لوگ غاصب تو ہو تم۔'' وہ لبوں میں مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا اور پرشیے نے بے ساختہ اپنے لبوں کو کچلا۔

''ٹھیک کہا آپ نے غاصب تو ہوں میرے باپ نے میرا غاصبانہ قبضہ کروا دیا وہاں جہاں میری جگہ ہی نہیں تھی مگر آپ جب چاہیں خود کو اس قبضے سے آزاد کرا سکتے تھے کہ غاصبانہ قبضے ختم ہونے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔'' وہ دکھ سے بولتی چلی گئی۔

اور اسامہ نے بے اختیار آنکھوں کو سختی سے بند کرلیا اور اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی شعر کی گونج تھی۔

اتنے مانوس صیاد سے ہوگئے
اب رہائی ملے گی تو مرجائیں گے

لیکن اس نے دوسرے ہی لمحے خود کو کمپوز کرلیا۔

''بہرحال آپ کوئی اور مصروفیت تلاش کرلیں جیسے کہ اپنی تعلیم مکمل کرلیں۔'' وہ اس کی جانب مڑتے ہوئے سنجیدگی سے بولا اور پرشیے نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''آر یو سیریس۔'' وہ حیرت اور خوشی کی زیادتی سے بے حد Excited لہجے میں بولی۔

''یس آئی ایم۔'' وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ دونوں بازوؤں کو سینے پر لپیٹتے ہوئے بولا۔

''مگر ایک مسئلہ تمہیں فیس کرنا پڑے گا۔'' وہ بولا۔

''کون سا مسئلہ؟'' اس کے چہرے کی خوشی

مدھم پڑ گئی۔
''ارے کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے بس تم ریگولر نہیں پرائیویٹ پڑھ سکتی ہو یعنی تم یونیورسٹی نہیں جاسکو گی۔ پڑھنا بھی خود پڑے گا۔ ہاں اگر کوئی مسئلہ ہوگا تو میں ہوں، نیٹ ہے۔'' وہ اس کے چہرے کی مدھم پڑی خوشی سے بوکھلا کر جلدی سے بولا۔
''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' وہ جوش سے بولی۔
''میں خود ہی پڑھ لوں گی۔''
''ٹھیک ہے میں کل ہی تمہارا رجسٹریشن کروا کر تمہیں کتابیں لا دیتا ہوں۔'' وہ بولا۔
''جی......'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

☆......☆......☆

عائشہ اور احسن سلطان جس لڑکی ماریہ کو اصفہان کے لیے دیکھنے آئے تھے وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔
وہ لوگ انہی کی طرح اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ مگر اطوار کسی ایلیٹ کلاس کی طرح کے تھے۔ ماریہ کے تعارف کے ساتھ جو لڑکی سامنے آئی تھی وہ فان کلر کی اسکن ٹائٹ جینز اور ہڈ والی مجنڈا کلر کی اپر میں ملبوس تھی جس کی ہڈی پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اور وہ میک اپ اور جیولری سے آراستہ تھی وہ احسن سلطان اور عائشہ سے مل کر بڑی بے تکلفی سے اصفہان کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی اور وہ دونوں یوں باتیں کرنے لگے گویا ان دونوں کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود ہی نہ ہو۔ ایسے میں احسن سلطان نے گلا کھنکھار کر ماریہ کے والد امیر ارقم کو مخاطب کیا۔
''امیر صاحب! یہ تو آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ ہم کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔'' وہ متانت سے بولے۔
''جی جی ماریہ نے بتایا تھا مجھے۔'' وہ ہنس کر بولے۔
''انکل! ڈیڈ سے بات کرنے سے پہلے آپ میری ایک بات سن لیں۔'' ماریہ نے ان دونوں کی بات کاٹ کر کہا۔
''بولو......'' احسن سلطان نے ناگواری چھپاتے ہوئے کہا۔
''میں اس شادی پر اسی صورت میں راضی ہوں گی جب مجھے ماڈلنگ اور اداکاری سے روکا نہیں جائے گا ورنہ میری طرف سے ابھی انکار ہے۔'' وہ بڑی بے باکی سے بولی۔
''تم ماڈل اور اداکارہ ہو۔'' احسن سلطان نے ماریہ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے اصفہان کو دیکھا جو کہ مسکرا رہا تھا۔
''کیوں آپ ٹی وی نہیں دیکھتے۔'' مسز امیر نے طنزیہ پوچھا۔
''نہیں ہم ان خرافات سے دور ہیں۔'' احسن سلطان اب اپنی ناراضگی پر قابو نہ پاسکے۔
''حیرت ہے آپ ابھی تک اٹھارہویں صدی میں زندہ ہیں۔'' امیر صاحب نے بھی طنز کیا اور اس سے پہلے کہ احسن صاحب کوئی جواب دیتے ماریہ نے خاصی طنز سے اصفہان کو دیکھا۔
''تم تو کہتے ہو تمہارے گھر میں 42 انچ کی ایل سی ڈی ہے۔ تو کیا وہ صرف تکنے کے لیے ہے ایسا کرو اسے میوزیم میں رکھوا دو۔'' وہ طنزیہ بولی۔
''ڈیئر! وہ میرے اور ارمغان کے کمرے میں ہے بابا اور اماں نہیں دیکھتے۔'' اس نے گویا تسلی دی تو اس کا منہ 'اوہ' کے انداز میں کھل کر بند ہوگیا۔

''ہاں تو انکل! اگر آپ کو میری شرط منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میری طرف سے انکار ہے۔'' وہ برہم لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے ہم سوچ کر جواب دیں گے۔'' احسن صاحب نے بات سمیٹی۔

''سوچنا کیا ہے بابا! مجھے اس کی ماڈلنگ، اداکاری پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اصفہان نے خاصی بدتمیزی سے کہا اور احسن صاحب نے اسے دیکھا۔

''اور جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔'' مسز امیر نے طنز سے کہا اور عائشہ نے اور احسن سلطان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد مٹھائی سے منہ میٹھا کروا دیا گیا اور مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔

☆......☆......☆

''تم حمیران کی اتنی بدتمیزی کس طرح برداشت کر لیتی ہو وہ ہر بات پر منہ پھلا لیتا ہے اور تم اس کے پیچھے چل دیتی ہو۔'' وہ چیٹ روم میں تھی تبھی روحیل لاگ آن ہوا۔

''روحیل! تمہیں اپنی بات کرنی ہے تو کرو حمیران سے متعلق کوئی بات نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کیسی محبت ہے جس میں احترام ہی نہیں ہے وہ تمہاری عزت ہی نہیں کرتا۔'' روحیل اپنی بات پر مصر تھا۔

''روحیل! تمہیں اپنی بات کرنی ہے تو کرو ورنہ بائے۔'' وہ غصے میں آ گئی۔

''اپنی بات یہ ہے کہ میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں مگر میری پسند میں عزت ہے، احترام ہے، محبت ہے۔'' روحیل نے جال پھینکا۔

''روحیل! آج تو یہ بات کی ہے آئندہ کبھی مت کرنا۔ ورنہ وہ دن ہماری دوستی کا آخری دن ہوگا میں بھی تمہارا احترام و عزت کرتی ہوں مگر اس میں اس پسند اور محبت کا کہیں دخل نہیں ہے۔ جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔'' اس نے تیزی سے ٹائپ کیا۔

''تم نے میرا دل توڑ دیا ظالم حسینہ۔'' اس کی طرف سے جواب آیا۔

''پٹڑی سے مت اترو۔'' وہ جھنجلائی۔

''عجیب ہو نہ پٹڑی پر آنے دیتی ہو نہ اترنے دیتی ہو۔'' اس نے ذومعنی کہا۔

''تمہیں نیند آ رہی ہے جا کر سو جاؤ۔'' اس نے جواب دیا اور لاگ آف ہو گئی۔

☆......☆......☆

''آپ کو کیسی لگی ماریہ؟'' عائشہ نے احسن سلطان سے پوچھا۔

''کیسی لگنی چاہیے۔'' وہ عائشہ کو دیکھتے ہوئے بولے تو عائشہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''پھر بھی آپ نے رشتہ ڈال دیا۔'' عائشہ نے دکھ سے کہا۔

''رشتہ ڈالنے کی نوبت ہی کہاں آئی وہاں تو سب پہلے سے طے شدہ تھا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولے۔

''مگر آپ باپ ہیں انکار کر سکتے تھے۔'' وہ چڑ کر بولیں۔

''ہاں کر سکتا تھا مگر جوان اولاد ہے باغی ہو سکتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ بیٹوں اور بیٹیوں میں زیادہ فرق نہیں کرتے بیٹیوں پر زبردستی اپنا فیصلہ ٹھونس دیتے ہیں اور بیٹوں کی ہر بات مان لیتے ہیں۔'' وہ دکھی ہو کر بولیں۔

''ہاں تو پھر بیٹے میرا بازو ہیں اور بیٹیاں

جب سے پیدا ہوتی ہیں صرف خرچے لے کر آتی ہیں۔'' وہ تنفر سے بولے۔

''کتنی عجیب سوچ ہے آپ کی حالانکہ بیٹی کو رحمت کہا گیا ہے بیٹی کے باپ کا ذمہ خدا نے خود لیا ہے۔ بیٹیوں کے آنے سے حالات اچھے ہوتے ہیں جیسے ورشیے کے آنے سے ہمارے حالات ایکدم بدلے تھے۔'' وہ دلگرفتگی سے بولیں۔

''بس مجھے لیکچر نہیں چاہیے۔'' وہ قطعی لہجے میں بولے۔

''بہتر میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں حالانکہ دل میں طوفان مچل رہا تھا کہ آج احسن سلطان کو آئینہ دکھا دیں کہ کیا خرچے کیے تھے انہوں نے بیٹیوں کے لیے، انہوں نے تو بیٹیوں کی شادیاں بھی اس طرح کیں کہ کم سے کم خرچ ہو بلکہ نہ ہی خرچ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

''نہیں چائے بعد میں لانا پہلے میری بات سن لو۔'' انہوں نے کہا اور عائشہ بیٹھ گئیں۔

''وہ شہباز بھائی نے مجھ سے بات کی ہے علیشے کے سلسلے میں۔ وہ وقار کا عقد ثانی کرنا چاہ رہے ہیں۔'' احسن سلطان نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''اُن کا دماغ ٹھیک ہے میری بچی ابھی صرف سولہ سال کی ہے جبکہ وقار کی پہلی شادی ہی 38 سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اب تو وہ 42 سال کا ہے ابھی وہ بچی ہی ہے اس پر دو بچوں کی ذمے داری۔'' وہ غصے میں آ گئیں۔

''مرد کی عمر کون دیکھتا ہے اس سے زیادہ عمر کا فرق ورشیے اور ایبک میں ہے پھر بھی عیش کر رہی ہے وہ اپنے گھر میں۔'' وہ طنزیہ بولے۔

''جیسا عیش وہ کر رہی ہے مجھے پتہ ہے اور ورشیے اور علیشے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ورشیے اٹھارہ سال کی عمر میں بھی بہت سمجھدار بہت میچور، اپروچ رکھتی تھی جبکہ علیشے کا ذہن بچگانہ ہے اس میں بچپنا ہے وہ گزارہ نہیں کر سکے گی۔'' عائشہ رو سی دیں۔

''کر سکے یا نہ کر سکے اسے گزارہ کرنا پڑے گا۔'' وہ حتمی اور سرد لہجے میں بولے اس کے ساتھ ہی کچھ گرنے کی آواز آئی دونوں نے چونک کر مڑ کر دیکھا وہ علیشے تھی۔ جو کہ ہوش و حواس سے بیگانہ زمین پر پڑی تھی یعنی وہ سب سن چکی تھی۔

☆......☆......☆

''اماں لائیں میں آپ کے سر میں مالش کر دوں۔'' ورشیے نے اماں کو سر دباتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''نہ پٹ! وسائی سے جیراں سے مارو ہے کوئی بھی مالش کر دے گا اور سر بھی دبا دے گا یہ تیرے کرنے کے کام نہیں ہیں۔'' وہ محبت سے بولیں۔

''کیوں اماں! میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں۔'' اس نے بھی محبت سے کہا۔

''تو بیٹی ہے نوکرانی یا ماسی تھوڑی ہے دھی جو میں تجھ سے یہ کام کرواؤ تو تو ہماری حویلی کی ہماری نسل کی امین ہے۔'' وہ پیار سے بولیں اور وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

''کیا بات ہے دھی رانی! کوئی خوشخبری نہیں ہے اب تو چھ مہینے ہو گئے تمہاری شادی کو۔'' اور اس نے شرم سے زیادہ شرمندگی سے سر نفی میں ہلا یا۔

''چل کوئی بات نہیں پٹ (بیٹا) اللہ سائیں خیر کرے گا۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا

اور اس نے سوچا اللہ سائیں بلا وجہ خیر نہیں کرتا اس کے خیر کرنے کی کوئی وجہ بھی ہوتی ہے اور یہاں وہ وجہ ہی نہیں ہے۔ تبھی خالہ چچی اندر داخل ہوئیں اور اسے دیکھ کر اُن کے چہرے پر ناگواری آ گئی۔

''چل چھوری! باہر جا مجھے بات کرنی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولیں۔

''بری بات ہے فاطمی ما! وہ بہو ہے اس گھر کی زال (بیوی) ہے تیرے بھانجے کی اس سے ملازموں کے انداز میں بات مت کیا کرو۔'' اماں نے خالہ چچی کو سرزنش کی تب تک پر شئے کھڑی ہو چکی تھی۔

''میں چلتی ہوں اماں!'' کہہ کر وہ باہر نکل گئی مگر جاتے جاتے بھی کچھ جملے اس کے کانوں میں پڑ ہی گئے۔

''مجھے غصہ آتا ہے اسے دیکھ کر جی جی! یہ میری بیٹی کی جگہ قابض ہے۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''وہ اس کی جگہ قابض نہیں ہے اگر سسی زندہ ہوتی تو وہ ہی میری بہو ہوتی مگر وہ اب زندہ نہیں ہے وہ مر چکی ہے تو بھی تسلیم کر لے یہ بات پری اس کی جگہ نہیں ہے اور وہ جگہ خالی تھی وہ اس جگہ ہے۔'' اماں نے سمجھایا۔

''تو بڑی جلدی بھول گئی جی جی! میری بیٹی کو۔'' خالہ چچی رونے لگیں۔

''فاطمی ما! بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں اس حویلی میں تو یوں بھی صرف سسی ہی تھی۔ نوید اور شاہد دونوں کی بیویوں کبھی بیٹی بن کر نہ دیا یہ محبت سے ملتی ہے بات کرتی ہے تو میرے اندر سے بیٹی کی جو تشنگی ہے، پیاس ہے، وہ بجھتی ہے تو بھی اسے سسی کی جگہ پر رکھ کر سوچ تجھے یہ اچھی لگے گی۔'' اماں نے سمجھایا۔

''بس جی جی! تو خود مٹاتی رہے اپنے اندر کی پیاس میں کیوں رکھوں اسے اپنی سسی کی جگہ...... سسی سسی تھی اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔'' وہ بگڑ کر بولیں۔

''تو ماں تھی سسی کی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گی فاطمی ما! مگر تو اس سے ایسے بات کرتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے ایسے تو تو اس گھر کے ملازموں سے بھی بات نہیں کرتی۔'' اماں نے دکھ سے کہا۔

''پھر وہی بات جی جی! وہ میری بیٹی کی جگہ پر قابض ہے۔'' اور اماں کا دل چاہا وہ اپنا سر سامنے دیوار پر دے ماریں۔

☆......☆......☆

حمیران اور شیلزے دونوں کلاس لے کر ساتھ نکلے تھے مگر حمیران کسی کتاب کو ایشو کروانے لائبریری چلا گیا تھا اور اسے کینٹین جانے کو کہا اور کینٹین میں اس کے پاس آنے والا پہلا شخص روحیل تھا۔

''ہیلو پریٹی!'' وہ اس کی سامنے والی چیئر سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''ہیلو......'' اس نے بھی فارملیٹی نبھائی۔

''کل تم نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔'' اس نے سلسلہ کلام کل والی گفتگو سے ہی جوڑا۔

''کیوں کیا کل کچھ نشہ کر کے بیٹھے تھے۔'' وہ چڑ گئی۔

''کیوں تم میری محبت سے انکار کیوں کر رہی ہو۔'' وہ بھی جھنجلایا۔

''کیونکہ میں حمیران کو پسند کرتی ہوں اس سے محبت کرتی ہوں اور وہ ناپسند کرتا ہے میرا کسی سے بھی بے تکلف ہونا۔'' وہ سکون سے بولتی چلی

گئی۔

''وہ کچھ زیادہ کنزرویٹو نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ بولا۔

''ہاں ہے تو پھر اور مجھے اچھا لگتا ہے اس کا اپنے بارے میں کنزرویٹو ہونا۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

''ایسے لوگوں کے ساتھ زندگی مشکل گزرتی ہے۔'' وہ سمجھانے والے لہجے میں بولا۔

''میری گزرے گی ناں! فکر مت کرو میں تمہارے پاس فریاد لے کر نہیں آؤں گی۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''اوکے تمہاری مرضی۔'' وہ کہتا ہوا کھڑا ہوا اسی وقت حمیران اندر داخل ہوا اور روحیل اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

''یہ یہاں کیا کر رہا تھا۔'' وہ سرد لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''یہ کینٹین ہے حمیران! یہاں کوئی بھی کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' وہ چڑ کر بولی ابھی ایک شخص دماغ کی دہی بنا کر گیا تھا اور اب دوسرا......

''تو پھر تم یہاں کیا کر رہی تھیں واپس آجاتیں۔'' وہ اسی سرد لہجے میں بولا۔

''حمیران! تم بہت کنزرویٹو ہو۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ہم بعض اوقات غیر ارادی سامنے والے کی سنی باتیں دہرا دیتے ہیں۔

''ہاں ہوں۔ اور یہ بات ابھی سے جان لو بعد میں شکایت مت کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ غصے سے پلٹ گیا اور شیلزے نے اپنا سر پکڑ لیا۔

☆......☆......☆

شہباز صاحب اور وقار کے گھر والے باقاعدہ علیشے کے لیے رشتہ لے کر آئے ہوئے تھے وقار بہت خوش تھا دو بچوں کی موجودگی میں ایسی کم سن وخوبصورت لڑکی مل رہی تھی علیشے جب ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئی تو وہ خاصی بدحواس لگ رہی تھی۔ اندر آتے ہوئے وہ بری طرح ڈگمگائی تھی۔ ٹرالی میں رکھے ہوئے تمام برتنوں نے اُس کی ڈگمگاہٹ پر مکمل احتجاج کیا تھا۔ عائشہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر بیٹی کو دیکھا۔ اور علیشے کے آنسو بہنے لگے۔

''بابا! میں نے کچھ نہیں کیا میرا پاؤں مڑ گیا تھا۔'' وہ سِکی دباتے ہوئے بولی اور احسن سلطان نے محض 'ہنہ' پر اکتفا کیا۔ اور ٹرالی درمیان میں رکھ کر دبک کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

''پڑھتی ہو۔'' پہلا سوال مسز شہباز کی طرف سے آیا۔

''جی میٹرک کر رہی ہوں۔'' وہ بغیر نظریں اٹھائے بولی۔

''تو پھر یہ بھی جانتی ہوگی کہ مسلمان سب سے پہلے سلام کرتے ہیں۔'' وہ طنزیہ بولیں اور احسن سلطان نے قہر بار نظروں سے بیٹی کو دیکھا جبکہ پُرشوق نگاہوں سے علیشے کو تکتے وقار نے ناگواری سے ماں کو دیکھا۔

''جی ماما! اور اس کے لیے بڑے چھوٹے کی کوئی قید نہیں ہے۔'' وقار نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو مسز شہباز نے پُرسوچ نظروں سے شہباز اور علیشے کو دیکھا۔

اتنی کم سن لڑکی سے شادی نے بیٹے کو اُتاؤلا کر دیا تھا۔ گویا اس لڑکی سے شادی کا مطلب تھا بیٹا ہاتھ سے نکل جاتا اور انہوں نے ایسا ہونے نہیں دینا تھا۔

''تو یہاں میرے بیٹے کی شادی نہیں ہوگی۔'' انہوں نے فیصلہ کر لیا اور علیشے کو دیکھا جو مسلسل ہاتھوں کو ایک دوسرے سے دبانے کی

کوشش میں تھی۔

''اتنی نروس کیوں ہو کیا یہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں کوئی اور پسند ہے۔'' مسز شہباز نے جلتے لہجے میں کہا تو علیشے نے گھبرا کر پہلے باپ کو اور پھر خوفزدہ نظروں سے مسز شہباز کو دیکھا جو کہ طنزیہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''تو اتنی بڑی عمر کے دو بچوں کے باپ سے اتنی کم سن لڑکی کی شادی کی بات ہو گی تو وہ نروس ہی ہو گی یا خوشی سے چھلانگیں لگائے گی۔'' بہت دیر سے مسز شہباز کی گل افشانیاں سنتی پھوپی جان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''ہم تو اپنے بیٹے کے لیے لڑکیاں دیکھ ہی رہے تھے اُن سے بھی کہا تو یہ خود ہی چاروں ہاتھ پیروں سے راضی ہو گئے ہمارا کیا قصور ہے؟'' مسز شہباز جل ہی تو گئیں۔

''ویسے بھی وقار، ایک سے تو کم عمر ہے۔''

''ہمارے بھائی کو تو اپنی بیٹیوں سے کوئی ہمدردی سرے سے ہے ہی نہیں آپ تو سمجھدار ہیں شہباز بھائی خود بھی بیٹی والے ہیں آپ تو سوچیں اگر وقار کی شادی مناسب عمر میں ہوتی تو علیشے کی عمر کی خود اس کی اپنی بیٹی ہوتی۔'' پھوپی جان اب کسی کو بخشنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''احسن بھائی! اگر آپ کے اپنے گھر میں اس رشتے کے خلاف اتنے لوگ تھے تو آپ نے ہماری بے عزتی کرنے کے لیے ہمیں کیوں بلایا ہم کوئی آپ کے پیر نہیں پڑے تھے۔ لڑکا اچھا کھاتا کماتا ہو تو رشتے بہت۔'' مسز شہباز نے آگ اگلی۔

''بھابی! ان سب کو کہنے دیں۔ فیصلہ آخری میرا ہی ہوتا ہے۔'' احسن سلطان نے غصے سے بہن کو دیکھا۔

اور وہ ہمیشہ بیٹیوں کے خلاف ہوتے ہیں تم نے ہمیشہ بیٹیوں کے جذبات پر اُن کے دلوں پر قدم رکھے ہیں مت لو ان معصوموں کی آہ اُن کے دل سے نکلی بے لفظ و بے آواز بددعا تباہ ہو جاؤ گے۔'' پھوپی جان کہہ کر رکیں نہیں باہر نکل گئیں۔

''بھابی! آپ ان لوگوں کو کہنے دیں یہ سب احسن سلطان کے دامادوں سے جلتے ہیں میری بیٹی آپ کے گھر کی ہی بہو بنے گی۔'' انہوں نے دو ٹوک کہا اور مسز شہباز نے دل میں کہا۔

''کبھی نہیں۔'' اور کھانے کی چیزوں سے انصاف کرنے لگیں۔

☆......☆......☆

''احسن صاحب! میں نے ساری زندگی آپ سے کچھ نہیں مانگا صرف میری ایک بات پوری کر دیں۔'' عائشہ نے لجاجت سے کہا۔

''آج تک نہیں مانگا تو روایت مت توڑو۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولے۔

''مگر آج میری بیٹی کا معاملہ ہے میں چپ نہیں رہوں گی۔'' وہ دبے دبے غصے سے بولیں۔

''بول کر بھی میرا کیا بگاڑ لو گی میری بات حرفِ آخر ہے۔'' وہ طنزیہ بولے۔

''صاحب! علیشے بہ کم سن ہے۔ وہ جذباتی ہے وہ نہیں رہ سکے گی وہ مر جائے گی۔'' وہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

''مر جائے گی تو مر جائے...... خدا کی طرف سے اس کی زندگی اتنی ہو گی۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔

''مگر اس بار میں ایسا ہونے نہیں دوں گی وہ دونوں سمجھدار تھیں انہوں نے گزارہ کر لیا یہ نہیں کر سکے گی۔'' وہ رو رہی تھیں۔

''تم نے اگر رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو میں

تمہیں طلاق دے دوں گا۔ اور ہاں اس کے بعد بھی علیشے میرے پاس ہی رہے گی اور اس کی شادی وقار سے ہی ہوگی۔'' انہوں نے کہا تو ڈھے گئیں اور یہ ساری گفتگو علیشے نے بھی سنی اور اس نے سوچا نہیں میری وجہ سے میری ماں در بدر نہیں ہوگی۔

☆......☆......☆

پریشے نے سبجیکٹ کا انتخاب اسامہ کی پسند سے کیا تھا اس کی مجبوری تھی وہ جو سائنسٹسٹ بننا چاہتی تھی کامرس کی طرف آ گئی۔ اس وقت بھی وہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے پین اور رجسٹر سے اُلجھی ہوئی تھی مگر چہرے پر شدید پریشانی تھی۔

''کیا ہوا کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' اسامہ نے پوچھا وہ عموماً صرف رات میں اپنے کمرے میں جاتی تھی اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے کہا بھی ہے جو سمجھ نہ آئے مجھ سے پوچھ لیا کرو بہرحال تمہارا انٹرسٹ ان سبجیکٹ میں تھا نہیں۔'' اسامہ نے کہتے ہوئے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف کیا اور رجسٹر اور پین سنبھال لیا اور اگلے ہی لمحے پرابلم سولو تھی۔

''محترمہ! صرف ایک غلطی کی وجہ سے آپ ایک گھنٹے سے پریشان تھیں۔'' اس نے کہا۔

''جی......'' اس نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کوئی کہہ سکتا ہے محترمہ پریشے نے انٹر میں A+ لیا تھا'' وہ شرارت سے ہنسا۔

''نہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ محترمہ پریشے جو کہ نیوکلیئر فزکس پڑھنا چاہتی تھیں ایک گریٹ سائنسدان بننا چاہتی تھیں وہ پرافٹ اور لوس میں اُلجھ کر رہ گئی ہیں۔'' اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا اور ہولے سے مسکرائی اور اسامہ نے بغور

اسے دیکھ کر چہرے کا رخ بدل لیا۔ یہ لڑکی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے یہ مجھے دیوار سے لگائی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

''کچھ نہیں اگلے ہفتے سسی کی برسی ہے اس کی تیاری کرنی ہے۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکل گیا گویا وہ جو لائن کراس کرتی بڑی تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہی تھی لائن کے اس طرف دھکیل کر اس نے لائن دوبارہ واضح کر دی۔

☆......☆......☆

''بابا سائیں! میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔ اس لیے نہیں کہ وقار بھائی بہت بڑی عمر کے ہیں بلکہ اس لیے کہ میں ان دونوں بچوں سے انصاف نہیں کر سکوں گی۔ کیونکہ مجھے بھی کبھی انصاف نہیں ملا اور جنہیں خود انصاف نہ ملا ہو وہ کسی کے ساتھ انصاف کیا کریں گے۔'' وہ مسلسل سوچ رہی تھی اور اس کے آنسو بے تحاشا بہے چلے جا رہے تھے۔

''لیکن اگر میں نے بابا کی بات نہیں مانی تو وہ اماں کو اس عمر میں طلاق دے دیں گے اور وہ دربدر ہو جائیں گی پھر میں کیا کروں۔'' سوچ سوچ کر اس کے سر میں درد ہونے لگا۔

اور پھر فیصلہ ہو گیا اس نے سلائی کا ڈبہ اٹھایا اور اس میں سے بلیڈ نکالا اماں نے سلائیاں ادھیڑنے کے لیے یہ بلیڈ سلائی کے ڈبے میں رکھا ہوا تھا اور وہ بہت شارپ تھا اس نے بلیڈ نکال کر کلائی پر رکھا اور ہلکا سا دبایا تو شدید تکلیف کا احساس ہوا 'بہت تکلیف ہوگی' اس نے سوچا۔

''مگر زندگی سے زیادہ تو نہیں۔'' اس نے

بے دردی سے سوچا۔
''مگر کیا میں یہ تکلیف سہہ سکوں گی۔'' اس نے سوچا۔
''سہنی تو پڑے گی وقار یا موت...... اماں کی طلاق یا موت۔'' اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ کا دباؤ اس کے الٹے ہاتھ کی کلائی پر بڑھتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

''پرشے! تیار ہو جاؤ اسپتال چلنا ہے۔'' اسامہ نے اس کے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔
''کیوں خیریت۔'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔
''ہوں ہاں پتہ نہیں وہ اماں کا فون آیا تھا کہ علیشے اسپتال میں ہے۔'' اس نے چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔
''علیشے اسپتال، کیا ہوا ہے اسے۔'' وہ گھبرا کر اس کے مد مقابل آ کھڑی ہوئی۔
''پرشے! مجھے واقعی پتہ نہیں ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ وہاں چلتے ہیں تو پتہ چل ہی جائے گا۔'' اس نے تسلی دینے کی کوشش کی۔
''میں تیار ہوں بس چادر لے لیتی ہوں۔'' وہ تیزی سے چادر نکالتی ہوئی بولی۔
''اماں سے اجازت لے لی۔''
''ہوں۔'' اسامہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔
اسپتال میں مطلوبہ روم میں داخل ہوتے ہی وہ جان گئی کہ علیشے نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس کی بائیں ہاتھ کی کلائی پر بینڈج ہوئی تھی اور خون قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں اتارا جا رہا تھا اور اس کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا گویا جسم میں خون کا قطرہ بھی نہ ہو وہ بے ہوش تھی اور اماں بھیگی آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اور بچہ تو اسامہ بھی نہیں تھا۔ وہ بھی دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔
''اماں! کیا ہوا کیوں کیا ہے اس نے ایسا۔'' وہ بری طرح روتے ہوئے ماں کے گلے لگ گئی اور اسامہ انہیں بات کرتے دیکھ کر باہر نکل گیا۔
''کیا بتاؤں تمہیں وقار یاد ہے تمہارے بابا کا بھتیجا۔'' وہ بہتے آنسو پونچھ کر بولیں۔
''ہاں ہاں یاد ہیں کیوں کیا ہوا ہے انہیں۔'' وہ اماں کو دیکھ کر بولی۔
''اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے دو بچوں کی پیدائش کے دوران...... تمہارے بابا علیشے کی شادی وقار سے کروا رہے تھے۔'' اُن کے رکے ہوئے آنسو دوبارہ بہہ نکلے۔
''کیوں بابا کا دل نہیں بھرا دو بیٹیوں کو سولی چڑھا کر، بالکل ٹھیک کیا علیشے نے یہ بہادری ورشے آپی دکھا دیتیں تو ہم سب محفوظ ہو جاتے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔
''بری بات ہے پری! کسی کو سمجھانے کا یہ طریقہ غلط ہے۔ یہ حرام موت ہے، خدا ناراض ہوتا ہے معاف نہیں کرتا ہے زندگی ختم عاقبت برباد، اور یہ تم نے کیا کہا ہے کیا تم بھی اسامہ کے ساتھ ناخوش ہو۔'' وہ بے چینی سے بولیں۔
''نہیں اماں! اسامہ بہت اچھے ہیں مگر اُن کے گھر کا ماحول رہن سہن سب ہم سے جدا ہے۔'' اس نے دل میں اٹھتی ٹیس کو دبایا۔
''اچھی بیٹیاں ماحول میں ڈھل جاتی ہیں۔'' انہوں نے سمجھایا۔
''اماں! ہر فرض صرف بیٹیوں کا ہوتا ہے۔ ماحول میں ڈھلیں تو وہ، بے عزت ہوں تو وہ، ناانصافی ہو تو اُن کے ساتھ، استحصال ہو تو اُن کا، کسی بات پر بابا ناخوش، کسی بات پر خدا ناخوش وہ جائیں تو جائیں کہاں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔
''بیٹا' کفر مت بولو۔'' اماں نے کہا اور اسی وقت دروازہ کھلا اور ورشے اور حذیفہ اندر داخل

ہوئے اور پرشے اماں کے پاس سے اٹھ کر چیخ مارتی ورشے سے لپٹ گئی۔

''آپی! پورے سات سال بعد آپ کو دیکھ رہی ہوں کتنی کٹھور ہیں آپ آپ کو کبھی ہماری یاد نہیں آئی۔'' وہ روتے ہوئے ورشے سے بول رہی تھی۔

''پری! یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بندہ بھول جائے تم تینوں تو میرے دل میں رہتی ہو مجھے تمہاری فکر رہتی تھی۔ مگر یہ ہے ناں میرا بھائی تم سب کے حال واحوال سے مجھے آگاہ رکھتا ہے۔'' ورشے نے پیار سے حذیفہ کو دیکھا جس نے کان کھجایا۔

''اب مجھے اماں سے تو ملنے دو۔'' ورشے نے کہا تو اس نے انہیں چھوڑ دیا اور ورشے بھاگ کر ماں کے گلے جا لگی۔

''اماں! کیا ہوا ہے کیوں کیا اس نے ایسا؟'' ورشے نے پوچھا اور اماں نئے سرے سے بتانے لگیں۔

☆......☆......☆

اور واپسی کے سفر میں اسامہ بہت خاموش تھا پرشے نے اس کی خاموشی محسوس کی تھی۔ اماں نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ گھر چلے مگر اُس کا دل نہیں چاہتا تھا اس گھر میں جانے کو، سو اس نے سہولت سے انکار کر دیا تھا یوں بھی اب علیشے خطرے سے باہر تھی۔

''کیا بات ہے آپ بہت خاموش ہیں کیا کوئی بات بری لگی ہے۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''تم بہنوں میں ایسی کیا خرابی یا کیا برائی ہے کہ تمہارا باپ تم لوگوں پر ٹرسٹ کرنے کو تیار نہیں ہے۔'' وہ تلخ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''مطلب......؟'' وہ چونکی۔

''مطلب یہ کہ بڑی بیٹی کی کم سنی میں اپنے سے بھی بڑی عمر کے مرد سے شادی، تمہاری اور میری شادی بھی تمہارے سامنے ہے اور اب اتنی کم سنی میں چھوٹی بیٹی کی ایک اولاد والے مرد سے شادی اور اس کی سوسائیڈ کی کوشش......وہ شخص جو عورت کی اتنی عزت کرتا ہے انہیں آبگینہ کہتا ہے وہ تم لوگوں پر ٹرسٹ کیوں نہیں کرتا، کیا خرابی ہے تم بہنوں میں۔'' وہ بہت تلخی سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ بات آپ کو اپنے سر سے پوچھنی تھی ناں! جب وہ زبردستی مجھے آپ کے سر منڈھ رہے تھے۔'' وہ بھی تلخ ہوگئی۔

''وہ میرے لیے قابلِ عزت ہیں میں اُن کا احترام کرتا ہوں۔ مگر ایک بات یاد رکھنا جس دن بھی مجھے تمہارے کردار کی کسی خامی کا پتہ چلا میں اسی دن تمہیں اپنی زندگی سے خارج کر دوں گا تمہیں یاد ہے ناں! مجھے نقطے برابر بھی داغ گوارا نہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا اور پرشے نے ٹھنڈی آہ بھر کر اپنا سر سیٹ کی بیک سے لگا لیا اور اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''واہ بابا سائیں! واہ آپ شاید دنیا کے پہلے باپ ہیں جنہوں نے اپنی بیٹیوں کے بے داغ کردار کو لوگوں کے لیے سوالیہ نشان بنا دیا ہے مگر اسامہ شیرازی میں کبھی تمہیں اپنے کردار کی صفائی نہیں دوں گی کیونکہ میرا کردار صاف ہے اور آئینے کی طرح نظر آتا ہے اگر تمہیں نظر نہیں آتا تو یہ تمہاری کم نظری ہے۔

☆......☆......☆

''مبارک ہو عائشہ بیگم! تم اور تمہاری بیٹی جو چاہتی تھیں وہ ہوگیا۔'' وہ پھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوئے عائشہ علیشے کو سوپ پلا رہی تھیں

دونوں نے سہم کر احسن صاحب کو دیکھا۔

''بھابی نے وقار سے علیشے کے رشتے کے لیے انکار کر دیا ہے وہ کہتی ہیں ایسی نفسیاتی مریضہ کو گھر لے جا کر انہیں گھر جہنم نہیں بنانا ہے۔'' وہ غصے سے چیخے اور اُن کی بات پر علیشے اور عائشہ کے چہروں پر سکون اتر آیا۔

''لیکن ایک بات یاد رکھنا اس لڑکی کو گھر لاؤ تو اس کو سمجھا دینا کہ اب میرے سامنے نہ آئے ورنہ پہلے تو اس نے خودکشی کی تھی۔ اب میں اُس کا گلا گھونٹ کر اس کو مار ڈالوں گا۔'' وہ جس طرح تن فن کرتے آئے تھے اسی طرح چیزوں کو ٹھوکریں مارتے باہر نکل گئے اور عائشہ پھر سے علیشے کو سوپ پلانے لگیں۔

☆......☆......☆

شیلزے کلاس لے کر باہر نکلی تو سامنے سے روحیل آتا نظر آیا اور شیلزے کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بکس کو زور سے سینے سے بھینچ لیا اور ایسا ظاہر کرتے ہوئے جیسے اس نے روحیل کو دیکھا نہ ہو اس کی مخالف سمت میں چل پڑی۔ مگر وہ بھی روحیل تھا اگلے ہی لمحے وہ اس کے مقابل تھا۔

''میم! آپ نے واقعی مجھے نہیں دیکھا یا آپ کے رومیو کا حکم ہے۔'' وہ جھلسے ہوئے لہجے میں بولا۔

''روحیل! پلیز مائنڈ یور لینگویج۔'' وہ تپ کر بولی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ دیکھ کر اگنور کیوں کیا؟'' اس کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''اس لیے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم روزانہ میرے ڈپارٹمنٹ کے پھیرے لگاؤ اور سب میرے بارے میں غلط انداز سے سوچیں۔'' وہ تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اچھا اور حمیرا ان کے حوالے سے موضوع گفتگو بننے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں نہیں ہے میری اس سے کمٹمنٹ ہے اور تقریباً سب جانتے ہیں اس بارے میں مگر میں ہر دوسرے دن کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ نظر آؤں گی تو یہ چیز میرے کیریکٹر کے لیے نقصان دہ ہے۔'' وہ برہم لہجے میں بولی۔

''اوہ کم آن! ہم دونوں دوست بھی تو ہیں۔'' روحیل نے پینترا بدلا۔

''ہاں دوست ہو تو دوستوں کی طرح رہو۔ کبھی تم نے مصطفیٰ یا علی کو میرے گرد اس طرح منڈلاتے ہوئے دیکھا ہے اور حذیفہ تو آپی کا کزن ہے مگر اس نے بھی کبھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی میرے گرد منڈلاتا نہیں ہے۔'' وہ بری طرح سے چڑ گئی تھی۔

''ان سب کے دل میں بہرحال وہ جذبات نہیں ہوں گے جو میرے جو میرے ل میں ہیں بہرحال I Like You ۔''اس نے جذبات سے پُر لہجے میں کہا۔

''روحیل! آئی اسٹرکلی وارن یو اگر تمہارا رویہ نہیں بدلا تو پھر سوری ہماری دوستی بس یہیں تک تھی Good Bye Forever۔'' وہ بول کر اس کے پاس سے نکل کر چلی گئی۔ اور روحیل طنزیہ ہنسا۔

''میم! یہ تو وقت بتائے گا۔''

☆......☆......☆

''اسامہ! پلیز مجھے یہ سوال سمجھ میں نہیں آ رہا سمجھا دیں۔'' پرشیے نے رجسٹر اس کے سامنے رکھا۔

"سوری میں تھکا ہوا ہوں خود ہی کوشش کر کے دیکھ لو۔" وہ روکھے لہجے میں بولا۔

"اسامہ! یہ میرے سبجیکٹ نہیں ہیں میں خود سے نہیں سمجھ پاتی۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"نہیں سمجھ پاتیں تو پڑھنا چھوڑ دو مگر میں اب تمہارے ساتھ اور دماغ ماری نہیں کر سکتا۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"اور اج پر شیے کو لگا کہ وہ درمیان کا راستہ جو اس نے بمشکل پاٹا تھا وہ پھر درمیان میں آ گیا ہے۔ وہ آج بھی دونوں اسی ایک سال پہلے والی جگہ پر کھڑے ہیں اتنے ہی اجنبی اور اتنے ہی بدگمان اسے اب یہ فکر بھی لاحق ہو گئی تھی کہ وہ پیپرز دے بھی سکے گی یا نہیں۔ پتہ نہیں سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان تھا۔ مگر میں اپنی تیاری تو پوری رکھوں چانس تو لینا پڑے گا کیا پتہ......

کچھ دن پہلے ہی اسے اسامہ نے فیس بک آئی ڈی بنا کر دی تھی۔ اس پر اس کی ایک دوست شازلی ایڈ تھی۔ اس کے پاس بھی کامرس تھی اس نے اس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا اور مسئلہ آدھے گھنٹے میں سولو ہو چکا تھا۔

دوسری جانب اس سے اس طرح بات کر کے اسامہ بھی ڈسٹرب تھا۔ وہ بہت کم وقت میں اس سے محبت کرنے لگا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اس کی شفاف آنکھوں، معصوم چہرے اور بے ریا انداز اور پُرسکون رویے پر اعتبار کرے یا اپنے باپ جیسے پروفیسر کے بی ہیویئر کو دیکھے وہ جو عورت کا اتنا احترام کرتے تھے اور اسے بھی یہی درس دیتے تھے۔ اُن کا رویہ اپنی ہی بیٹیوں کے سلسلے میں اگر اس قدر خراب ہے تو خرابی یقیناً اُن کی بیٹیوں میں ہی ہوگی۔ اُن کا لہجہ کس قدر دل نشین ہوتا تھا عورت کے بارے میں بات کرتے ہوئے کیا وہ جھوٹ تھا، یا یہ جھوٹ ہے یا خدا! کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔

☆......☆......☆

اصفہان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی تھی۔ علیشے اب اپنے کمرے تک ہی محدود ہو چکی تھی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ احسن صاحب کے سامنے نہ آئے کھانا بھی وہ کمرے ہی میں کھالیتی تھی۔ شادی کے لیے بھی اس نے کچھ نہیں بنایا تھا جو اماں نے بنادیا بس پہنادیا۔ بری تمام ماریہ کی پسند اور مرضی سے بنی تھی۔ اور اس نے سوچا یہ ہوتی ہے شادی جس میں سب سے زیادہ پُرجوش دلہا اور دلہن ہی تھے۔ بابا نے اُن کے لیے اوپر فرسٹ فلور پر بنے ہوئے دونوں کمرے مختص کیے تھے۔

اور پھر ماریہ شادی ہو کر اُن کے گھر آگئی اور یہ شادی کے ایک ہفتے بعد کی بات ہے عائشہ اور علیشے ناشتا بنا رہی تھیں۔ تب ہی اوپر سے اصفہان اور ماریہ کی آمد ہوئی ماریہ بلو جینز پر سرخ ٹاپ میں ملبوس تھی۔ احسن صاحب نے دیکھا تو ہتھے سے اکھڑ گئے۔

"یہ کس قسم کا واہیات لباس پہنا ہوا ہے تم نے۔" وہ غصے سے چلائے۔

"فادر ان لاء۔" وہ کافی چبا چبا کر بولی۔

"حیران تو آپ اس طرح ہو رہے ہیں جیسے مجھے پہلی بار اس قسم کے لباس میں دیکھا ہے اور محترم میں نے پہلے ہی آپ پر واضح کر دیا تھا کہ میں ماڈل اور اداکارہ ہوں اور یقیناً ماڈلنگ اور اداکاری شٹل کاک برقعہ پہن کر نہیں ہوتی ہے۔" اس کا لہجہ خاصا گستاخانہ تھا اور احسن صاحب جنہوں نے شروع سے عورت پر حکمرانی کی تھی وہ تو

غصے سے بالکل ہی آؤٹ ہوگئے۔
''اصفہان! دیکھ رہے ہو تم اپنی بیوی کو۔'' وہ غصے سے چنگھاڑے۔
''اسے بھی دیکھ رہا ہوں اور آپ کو بھی۔ ایک ہی ہفتے میں آپ کے اعتراضات بھی شروع ہوگئے۔'' وہ بھی سرد لہجے میں بولا۔
''واہ! شاباش بیٹا شاباش ایک ہی ہفتے میں باپ کو سائیڈ پر لگا کر بیوی کی زبان بولنے لگے۔'' وہ طنز سے بولے۔
''تو کیا آپ کی طرح بیوی کو سائیڈ پر لگادوں۔'' وہ بھی انہی کا بیٹا تھا اسی طرح طنز سے بولا اور احسن سلطان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اصفہان کو دیکھا اُن کا بیٹا جس کے لیے انہوں نے ہمیشہ اپنی بیٹیوں کا استحصال کیا تھا۔
''اور ہاں بابا! ماریہ میری بیوی ہے اس پر روک ٹوک اور اعتراض کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔ اور میں یہ حق اور کسی کو نہیں دوں گا کہ وہ اس کی بے عزتی کرے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔
''تمہاری شوٹنگ کس وقت شروع ہوگی۔'' اس نے ماریہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''تین فون آچکے ہیں اب تک کہ میں لوکیشن پر پہنچ جاؤں۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔
''تو پھر چلو ناشتہ باہر سے ہی کر کے میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں پھر میں آفس چلا جاؤں گا۔'' وہ بولتے ہوئے باہر نکل گیا پیچھے پیچھے ماریہ تھی اور عائشہ نے احسن صاحب کو دیکھا جو کہ سن بیٹھے تھے۔

☆......☆......☆

''یار! مانو میں تو اس سچویشن سے بور ہوگیا ہوں۔ شیلزے بی بی ایک سال ہوگیا پٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتیں۔ حمیران صاحب اُن سے کتنا ناراض ہوجائیں بے عزتی کرلیں یہ بی بی اُن کے آگے پیچھے ہی رہتی ہیں۔'' روحیل نے تپ کر کہا۔
''تو کیا ہوا ابھی ایک سال اور ہے ہمارے پاس پتھر پر بھی قطرہ قطرہ پانی گرے تو اس میں بھی سوراخ کردیتا ہے اور یہاں تو حمیران جیسا پوزیسو اور کنزرویٹو مائنڈ بندہ ہے اگر تم اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکے تو یہ تمہاری صلاحیتوں کی ہار ہے۔'' مانو نے اسے جوش دلایا۔
''اگر مزید ایک سال بھی یہ دونوں اپنی جگہ سے نہ ہلے تو کیا کریں گے۔'' وہ اس سچویشن سے کچھ زیادہ ہی بیزار ہو چکا تھا۔
''تو پھر وہ ترکیب کرنی پڑے گی جسے میں نے آخری حل کے طور پر رکھا ہوا ہے اور جس کا میں استعمال فی الحال کرنا نہیں چاہتی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔
''میں اس ترکیب کو فول پروف بنانے کے امکانات دیکھتی رہتی ہوں۔''
''مجھے بتانا پسند کریں گی۔'' وہ چڑا۔
''ضرور بتادیتی مگر اگر دیواروں کے کان ہوتے ہیں تو یقیناً درختوں کے بھی ہوتے ہوں گے۔'' وہ مسخرے پن سے بولی۔
''اگر تمہیں حمیران سے محبت تھی تو اس سے کہہ کیوں نہیں دیا یوں بھی چچازاد ہے تمہارا حق پہلا ہے۔'' روحیل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے مانگ کر لینا اچھا نہیں لگتا مجھے بھیک میں ملی محبت گوارا نہیں ہے۔ شیلزے نے میری محبت پر شب خون مارا ہے اسے سزا ضرور ملے گی۔'' وہ پھنکاری اور روحیل کو اس وقت وہ نفسیاتی مریضہ لگی۔
''اور چھیننے کے بارے میں تمہارا کیا خیال

ہے۔'' روحیل نے پوچھا۔

'' محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔'' وہ بولی۔

''ہوں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

☆......☆......☆

رات کے دو بجے تھے اور ابھی اصفہان کی واپسی ہوئی تھی۔ ماریہ کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئے۔ تو احسن صاحب ایزی چیئر پر براجمان مطالعہ کررہے تھے۔

''اوہ! آپ کی واپسی ہوگئی۔'' انہوں نے طنزیہ کہا۔

''کیوں آپ کے کیا ارادے تھے ہم رات باہر ہی گزاریں۔'' ماریہ نے بدتمیزی سے کہا۔

''میرے نہیں یہ تو آپ کے ارادے تھے اور تم نے کیا بیوی کے سیکریٹری کی جاب کرلی ہے جو رات کے دو بجے چلے آرہے ہو آفس وافس نہیں جانا۔'' وہ غصے سے بولے۔

''جاب میں نے چھوڑ دی ہے بابا! اور سیکریٹری تو نہیں، ماریہ کے مقابل ہیرو آرہا ہوں جلد ہی۔'' وہ بیوی کو دیکھ کر ایک ادا سے مسکرایا۔

''شٹ اپ! ایسا ہماری سات پشتوں میں کبھی نہیں ہوا۔'' احسن صاحب غصے سے آؤٹ ہوگئے۔ اور عائشہ دہل کر باہر نکل آئیں۔

''اور بھی بہت کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ سات پشتوں سے آپ کے خاندان، میری مثال سامنے ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسی۔

''تم چپ کرو میں تم سے نہیں اپنے بیٹے سے بات کررہا ہوں۔'' وہ پھنکارے۔

''ضرور کریں مگر کیپ ان یور مائنڈ آپ کا بیٹا میرا شوہر ہے اور میں آپ کو چیلنج کرتی ہوں دیکھتے ہیں وہ کس کی بات مانتا ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسی اور احسن صاحب نے بے یقینی سے بیٹا کو دیکھا۔

''آف کورس ڈارلنگ! تمہاری...... قسمت سے ایک موقع ملا ہے۔ وہ میں ضائع کیوں کروں؟'' وہ دوٹوک بولا اور ماریہ نے سُسر کو دیکھا تو اس کی نگاہوں میں تمسخر ہی تمسخر تھا۔

''ویسے ایک بات ہے Father In Law میری ساس سے زیادہ آپ میری ساس کا کردار نبھا رہے ہیں وہ تو بچاری اللہ میاں کی گائے ہیں جدھر رخ کردو وہیں چل پڑتی ہیں۔'' وہ تمسخر سے بولی۔

''جوتا جسے کاٹ رہا ہوتا ہے اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ جوتا کہاں اور کیسے کاٹ رہا ہے۔'' وہ بولے۔

''واقعی جوتا جسے کاٹ رہا ہوتا ہے اسے ہی پتہ ہوتا ہے کہ جوتا کہاں کاٹ رہا ہے۔'' وہ چبا چبا کر بولتی واپسی کے لیے مڑ گئی۔

''بابا سائیں! آپ ماریہ کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''میں زیادتی کرتا ہوں میں۔'' اُن کی آواز اور آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

''جی آپ! آپ نے ہر عورت کو اماں، آپی، پریشے اور علیشے سمجھنا شروع کردیا ہے ہر عورت آپ سے ان چاروں کی طرح نہیں دبے گی۔ ان چاروں کو آپ نے شروع سے دبا کر رکھا ہے یہ عادی ہیں مگر ماریہ ان میں شامل نہیں ہے۔ وہ روک ٹوک کی عادی نہیں ہے وہ آزاد اور خود مختار زندگی گزارتی ہے اور میں اس پر کوئی روک ٹوک برداشت بھی نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گیا اور احسن صاحب نے غصے سے کتاب سامنے میز پر ماری۔

☆......☆......☆

وہ بڑی سی اجرک میں خود کو چھپائے پچھلے حصے میں موجود عورتوں کے لیے مخصوص گارڈن میں ٹہل رہی تھی اور اسامہ نیچے اسٹڈی میں موجود تھا۔ مگر پریشے اس بات سے بے خبر تھی اور اسٹڈی کی کھڑکیاں اسی باغ میں کھلتی تھیں۔ وہ کافی دیر سے ٹہل رہی تھی اور اتنی ہی دیر سے وہ اسامہ کی نظروں کے حصار میں تھی۔ تب ہی اسے وسائی آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے فائنل پیپرز ہو چکے تھے۔

''بی بی جی! کیا بات ہے مہینہ ہو چلا ہے۔ آپ ایک ہی وقت کا کھانا کھاتے ہو اگر کوئی بات ہو گئی ہے تو مٹی پاؤ جینے کی کرو جینے کی۔'' وسائی کی آواز آئی تو اسامہ نے بغور اسے دیکھا۔ واقعی وہ کمہلا گئی تھی شہابی رنگت کی جگہ زردی نے لے لی تھی۔ اور آنکھوں میں حلقے تھے۔

''جینے ہی کی کر رہی ہوں وسائی! تبھی تو بے غیرت بن کر ایک ٹائم کا زہر مار کر ہی لیتی ہوں تبھی سانس کی ڈوری زندگی سے اب تک جڑی ہے غیرت مند ہوتی تو کھانا چھوڑ دیتی اور سانس کی ڈوری کو زندگی سے آزاد کر دیتی۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''کسی کو کوئی فرق پڑے گا بی بی؟'' وسائی نے پوچھا۔

''نہ پڑے اب تک بھی کسے فرق پڑا ہے؟'' وہ بہت تلخ ہو رہی تھی۔

''پھر اپنا نقصان کرنے کا فائدہ؟'' وسائی نے اسے دیکھا۔

''کوئی نقصان نہیں ہوگا نہیں مروں گی بے فکر رہو بہت ڈھیٹ ہوں۔ جب اپنے باپ کو جھیل لیا تو ان کو بھی جھیل لوں گی۔ ویسے تمہارا شکریہ کہ تم میرے بارے میں سوچتی ہو میرا خیال کرتی ہو۔'' اس نے تشکر سے کہا۔

''میرے علاوہ بھی کوئی ہے جو آپ کا خیال کرتا ہے فکر کرتا ہے۔'' وسائی نے کہا تو اسے بڑی آس سے اسے دیکھا۔

''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''بڑی بی بی جی! اسامہ سائیں کی اماں صاحب وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔'' وسائی نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر وسائی کے ساتھ اندر کی جانب چل دی اور اسامہ نے کرسی کی پشت سے سر لگا لیا۔

☆......☆......☆

ماریہ نے اصفہان کو ہی کام نہیں دلایا ارمغان کو بھی اس کی خواہش پر کام دلوایا دونوں بھائی ایک ہی سیریل میں ایک ہی ساتھ جلوہ گر ہوئے اور قدرت ان پر مہربان تھی پہلی ہی سیریل سے انہیں ملک گیر کامیابی اور شہرت حاصل ہوئی اور ارمغان نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ ارمغان کی فینز میں ایک کروڑ پتی باپ کی اکلوتی، لاڈلی اور بگڑی ہوئی بیٹی بھی شامل تھی۔ جس نے فیس بک پر پہلی ہی سیریل کے بعد اسے پروپوزل کر دیا اور ارمغان نے مثبت جواب دے کر احسن صاحب سے بات کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''ایک ہی کافی ہے عذاب اس گھر پر اب مزید نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولے۔

''میں چاہتا تھا کہ باہمی رضا مندی سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ورنہ کورٹ میرج کی راہیں کھلی ہیں۔'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

''دھمکی دے رہے ہو۔'' وہ غرائے۔

''نہیں آگاہ کر رہا ہوں کیونکہ ٹینا کے ڈیڈ کو کوئی اعتراض نہیں ہے کورٹ میرج کی بھی ضرورت نہیں ہے بھائی اور بھابی میرے ساتھ ہیں۔''

(تیسری اور آخری قسط ماہ دسمبر میں ملاحظہ فرمائیں)

ناولٹ

فرح اسلم قریشی

لگام

''ابا......آپ کتنے شوق سے پرانی فلمیں دیکھتے ہیں کیا آپ کو نہیں پتہ کہ بارش کا جتنا اثر لڑکیوں پر ہوتا ہے اتنا لڑکوں پر نہیں ہوتا؟ کیا آپ نے کبھی زیبا اور شمیم آراء کی بجائے محمد علی اور ندیم کو بارش میں مٹکتے دیکھا ہے؟'' ابا کا جواب تو بعد میں آتا کہ......

موسم نے یکلخت انگڑائی لی تھی۔ سفید جھاگ جیسے بادلوں نے آناً فاناً پیراہن بدلا اور ہر طرف سیاہی چھا گئی' اور ایسے موسم کی تو وہ دیوانی تھی' اُس کا ہم مزاج موسم گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔

اُس نے اپنی نشست چھوڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اور موسلا دھار ترچھی گرتی بارش کے نیچے کھڑی ہوگئی پرانی طرز کے بنے اِس بڑے سے گھر کے وسیع صحن میں جہاں دور تلک منظر تیز بارش کی وجہ سے دھندلا گیا تھا۔

یاسمین نے دالان سے بیٹی کو بارش میں بھیگتے دیکھا تو چیخ و پکار مچادی۔

''اری کمبخت اندر آ...... بے شرم کہیں کی، کوئی لفنگا، بدمعاش چھت سے نہ دیکھ رہا ہو۔''

مگر اماں کی آواز چھم چھم برستی بارش سے زیادہ سریلی تو نہ تھی جو وہ اِدھر دھیان دیتی۔

اُس نے اپنا سفید چنری والے دوپٹے کو سر پر کلغی بنا کر تانا اور مست ہو کر چکریاں بھرنے لگی۔

پھر بھی جی نہ بھرا تو تائی اماں کی محبت سے سجائی چوڑی کیاری کے کیچڑ میں پاؤں ڈال کر گوکھرو کے چوڑے پتوں سے پھسلتی بوندوں کو چلو میں بھرنے لگی تھی۔

تب ہی تائی اماں نے دور سے اپنی ہوائی چپل سے نشانہ لیا جو ہمیشہ کی طرح خطا ہو گیا اور وہ کلکاریاں بھرتی کیچڑ بھرے پیروں سمیت اندر دوڑتی چلی گئی اماں اور تائی اماں کے واویلے سے بہت دور......

☆......☆......☆

کتنی غلط بات ہے......لڑکیاں ایسی حرکتیں کرتی کوئی اچھی لگتی ہیں؟'' ابا نے عیشاء کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ بچی شرمندہ ہے اس لیے لہجے میں حتی المقدور مٹھاس گھول لی، ورنہ اپنی شریکِ حیات اور بڑے بھیا شمیم احمد کی شریکِ زندگی کی لمبی چوڑی شکایت کے بعد اِن کا پورا ارادہ تھا کہ آج عیشاء کی خوب کلاس لیں گے۔

''یعنی لڑکے ایسی حرکتیں کریں تو چلے گا؟''
''بارش میں نہانا لڑکیوں کے لیے جرم اور لڑکوں کے لیے جائز۔'' جھٹکے سے سر اٹھا کر عیشاء نے سوال داغا تھا، لمحے بھر کو وسیم احمد بھی ٹپٹا گئے۔
''ابا...... آپ کتنے شوق سے پرانی فلمیں دیکھتے ہیں کیا آپ کو نہیں پتہ کہ بارش کا جتنا اثر لڑکیوں پر ہوتا ہے اتنا لڑکوں پر نہیں ہوتا؟ کیا آپ نے کبھی زیبا اور شمیم آراء کی بجائے محمد علی اور ندیم کو بارش میں مٹکتے دیکھا ہے؟''
ابا کا جواب تو بعد میں آتا کہ وہ پہلے اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے مگر پیچھے سے اماں نے سر پر زوردار چپت لگا کر کرارا جواب پیش کر دیا۔
''کیسے بے شرمی سے باپ کے سامنے واہیات باتیں کر رہی ہے اور کوئی باپ ہوتا تو زبان کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دیتا۔''
''اب کون سی بے ہودہ بات کی میں نے؟'' اماں کے تھپڑ پر عیشاء تلملا کر رہ گئی۔
''یہ مٹکنے ٹھمکنے کی باتیں کوئی باپ کے سامنے کرتا ہے کیا؟'' اماں نے دوبارہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر عیشاء کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر ابا نے فوراً انہیں گھور کر اپنے ارادے سے باز رکھا۔
''آپ ہی نے سر چڑھایا ہے اسے...... غضب خدا کا، کبھی پتنگ کاٹنے چھت پر دوڑ جاتی ہے تو کبھی کیریاں توڑنے درخت پر چڑھ جاتی ہے۔ کبھی بارش میں چھلانگیں لگاتی پھرتی ہے...... لڑکی ہے یا آفت کی پرکالا...... ناک کٹوا کے رکھ دی ہے اس نے سب کے سامنے۔''
''بس کر دیں اماں...... اپنی چھوٹی سی ناک کا سارا الزام ہمیشہ میرے ہی سر دیتی ہیں۔'' اُس کے جواب پر اماں نے تلملا کر اُسے مکا لگانا چاہا مگر وہ ہنسی ضبط کرتے اپنے ابا کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔
ہنسی روکنے کی وجہ سے وسیم احمد کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا تب ہی عیشاء بول پڑی۔
''کھل کر ہنس لیں ابا...... مت ڈرا کریں اماں سے اتنا میری اماں زبان کی تیز ہیں مگر دل کی بہت نرم ہیں۔'' اُس نے جھٹ اُٹھ کر اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ جسے اماں نے غصے میں جھٹک دیا۔
''دفع دور...... ڈرامے باز نہ ہو تو...... ٹھیک کہتی ہیں بھابی فتنہ ہے فتنہ۔''
''کیوں ایسی فضول باتیں منہ سے نکال رہی ہو...... خدا نہ کرے جو میری بیٹی فتنہ ہو۔'' بیوی کی بات پر وسیم احمد کے تیور بگڑ گئے تھے۔ یاسمین نے بھی جتانا ضروری سمجھا۔
''وہ کہتی ہیں تو کہتی رہیں...... وہ عیشاء کی تائی ہیں، ماں نہیں ہیں آئندہ میں تمہاری زبان سے ایسی غلط بات نہ سنوں اپنی بیٹی کے لیے......''
''بیٹی کو بھی سمجھائیں کہ لوگوں کو بولنے کا موقع نہ دیا کرے...... اس سے پوچھیں، اس کی حرکتوں کی وجہ سے مجھے روز بھابی سے کتنی باتیں سننی پڑتی ہیں۔'' یاسمین روہانسی ہو گئیں۔
''بری بات ہے عیشاء کیوں ایسے کام کرتی ہو کہ تائی اماں کو غصہ آ جائے دیکھو، ثناء بھی تو ہے، تم سے ایک سال ہی تو بڑی ہے مگر کیسے گھر میں رہتی ہے کہ اس کی آواز تک نہیں آتی۔''
وسیم احمد نے بیوی کو جذباتی دیکھ کر بیٹی کو سمجھانا ضروری سمجھا۔
''ثناء کی آواز اس لیے نہیں آتی ابا کہ تائی اماں کبھی خاموش ہی نہیں ہوتیں...... وہ چپ ہوں گی تو ثناء بولے گی ناں۔ اور تائی اماں کو تو عادت ہے وہ جب تک دن میں دس دفعہ مجھے ڈانٹ نہیں

لیتیں اُن کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔'' عیشاء کا انداز شکایتی تھا۔

'' ایسی چھوٹی موٹی باتوں کا برا نہیں مانتے...... وہ کوئی غیر تھوڑی ہیں تائی اماں ہیں تمہاری، کیا ہوا اگر ڈانٹ دیتی ہیں۔ ساتھ رہتے ہوئے یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نظر انداز کر دینے میں ہی رشتوں کا حسن برقرار رہتا ہے...... سمجھیں......؟''

'' وہ ہی تو...... مجھے برا نہیں لگتا ابا پر اماں کو لگتا ہے۔ آپ انہیں سمجھائیں ناں......'' عیشاء نے منمنا کر کہا تو وسیم احمد نے ہنستے ہوئے اسے اپنے سے لگالیا۔ وہ جانتے تھے اُن کی اکلوتی بیٹی کتنی فراخ دل ہے۔

☆......☆......☆

'' میں تو کہتی ہوں شمیم صاحب...... اگر ابھی بھی لگام نہ لگائی تو یہ لڑکی چاند چڑھائے گی۔ اکلوتی اکلوتی کہہ کہہ کر ماں باوا نے سر پر چڑھا رکھا ہے...... بھلا بتاؤ، یہ کوئی طریقہ ہے کہ جوان جہان لڑکی کھلے صحن میں بارش میں چوکڑیاں مارتی پھرے...... ہماری ثناء بھی تو ہے...... مجال ہے جو کبھی ایسی اوچھی حرکتیں کی ہوں۔'' عیشاء کی تائی اماں فردوس بیگم اپنے حصے میں آ کر میاں کے سامنے خوب واویلا مچا رہی تھیں۔

شمیم صاحب نے اخبار کا کونا موڑ کر انہیں دیکھا اور چائے کا کپ اُٹھا کر بولے۔

'' ذرا یہ کپ تو اپنے سر پر رکھو...... ساری چائے ٹھنڈی برف ہو چکی ہے۔''

'' ہائیں...... سر پر کیوں رکھوں؟'' فردوس بیگم کو اچھنبا ہوا۔

'' گرم کرنے کے لیے اور کیوں...... کھوپڑی اتنی گرم ہے تو چائے بھی گرم ہو جائے گی۔'' شمیم صاحب نے از راہ تفنن کہا تھا۔

اندر کمرے میں موبائل کی اسکرین دیکھتی ہوئی ثناء اپنے بابا کی بات پر بے ساختہ مسکرا دی وہ جانتی تھی اُس سمیت گھر کا کوئی بھی فرد عیشاء کے معاملے میں اُس کی امی کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔

اور امی کو بھی پتہ نہیں عیشاء سے اتنی چڑ کیوں تھی۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ وہ شروع سے ایسی ہی ہنگامہ خیز فطرت کی مالک لڑکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

☆......☆......☆

'' تائی اماں...... یاسر بھائی نے سامان بھیجا ہے کہاں رکھوں؟'' عیشاء اونچی آواز لگاتی اُن کی طرف آئی تھی۔ فردوس بیگم نے باورچی خانے سے جھانکا اور جلدی سے باہر آ گئیں۔

'' یہ سامان کس کے ہاتھ بھجایا سر نے اور خود کہاں رہ گیا؟''

'' شاید کچھ بھول گئے تھے...... دوبارہ لینے گئے ہیں۔'' عیشاء نے سودا سلف کا تھیلا زمین پر رکھا اور لمبی سی سانس لے کر وہیں بیٹھ گئی۔

'' چہ...... دیکھو ذرا میرے بچے کو دو چکر لگانے پڑ گئے...... ایک تو اس کے دوست بھی بائیک لے جاتے ہیں تو واپس دینا تو جیسے بھول ہی جاتے ہیں۔''

فردوس بیگم حسب عادت بول رہی تھیں مگر عیشاء کے کان کھڑے ہو گئے، کیونکہ ثناء اور یاسر کے معاملے میں وہ ویسے بھی بہت زیادہ حساس تھی اب ایسے میں یہ پتہ چلنا کہ یاسر کو بائیک نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ مارکیٹ پیدل جانا پڑا عیشاء کے لیے یہ بات ناقابل قبول تھی۔

وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور اندر جانے لگی تھی کہ

فردوس بیگم نے تنگ کر پوچھا۔

''اندر کہاں جا رہی ہو...... ثناء پڑھائی کر رہی ہے۔ بعد میں آنا۔'' مگر وہ بھی عیشاء بھی دروازے پر پڑتے ٹی وی کے عکس کو دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ ثناء ٹی وی دیکھ رہی ہے۔

''ثناء تو ٹی وی دیکھ رہی ہے تائی اماں...... میں ابھی آئی۔'' یہ کہتی یہ جا اور وہ جا...... فردوس بیگم پیچھے سے بل کھاتی رہ گئیں۔

''کیسی ڈھیٹ لڑکی ہے...... یہ نہیں کہ برا مان کر ہی واپس چلی جائے پہنچ گئی اندر ثناء کے پاس۔''

''تمہیں پتہ ہے تائی اماں مجھے بھگانے کے چکر میں تھیں۔'' ثناء کے پاس گھس کر بیٹھتے ہوئے اُس نے آنکھ کا کونا شرارت سے دبایا تو ثناء بے ساختہ ہنس دی۔

''سچ بتاؤ عیشاء...... تمہیں امی کی باتوں کا بالکل بھی برا نہیں لگتا؟'' ثناء نے اس کے صبیح چہرے پر جھولتی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے پیار سے پوچھا تھا۔

''اوہوں......'' عیشاء نے آرام سے ناں میں گردن ہلائی۔

''تائی اماں کی تو عادت ہے ناں...... اب عادت اچھی ہو یا بری اُس کا کیا برا ماننا...... اچھا چھوڑو...... میں تمہیں ایک خاص بات بتانے آئی تھی۔'' ثناء کی طرف رازداری سے جھکتے ہوئے عیشاء نے کہا تو ثناء چوکنی ہوگئی کیونکہ عیشاء کے راز کافی خطرناک ہوتے تھے۔

''تائی اماں بتا رہی تھیں یاسر بھائی کے دوست بائیک لے جاتے ہیں تو واپس ہی نہیں کرتے...... تمہیں پتہ ہے آج بھی یاسر بھائی کو پیدل دو مرتبہ مارکیٹ جانا پڑا...... چپس کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ اطمینان سے بول رہی تھی۔ ثناء نے چونک کر پوچھا۔

''تو......؟''

''تو کیا......؟ آئے کوئی بائیک واپس کرنے...... دیکھنا کیسی کھری کھری سناتی ہوں میں۔''

''عیشاء نہیں...... بھائی تمہیں جان سے مار دیں گے۔'' ثناء کی سانس رُک گئی تھی۔

''کیوں مار دیں گے......؟ میں کوئی غلط بات تھوڑی کروں گی۔'' عیشاء کے اطمینان میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

''مگر...... تمہیں ضرورت ہی کیا ہے؟ بھائی جانیں اُن کے دوست جانیں۔'' ثناء نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''جانیں گے تو اُن کے دوست تب...... جب انہیں بتایا جائے گا۔'' اس سے پہلے کہ ثناء مزید کوئی بات کرتی ڈور بیل کی آواز پر عیشاء دروازے کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ ثناء نے اپنا سر پکڑ لیا وہ جانتی تھی عیشاء جو کہتی ہے وہ کر کے رہتی ہے۔

مگر یاسر بھائی اُس کی اِس حرکت پر کیا ردِعمل دیں گے اِس بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کو اور اُن کے غصے کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

عیشاء نے دھاڑ سے دروازہ کھولا تو سامنے یاسر کی بائیک پر غالباً اُس کا کوئی دوست ہیلمٹ لگائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں سودے کا شاپر تھا جو عیشاء کے دروازہ کھولتے ہی اُس نے آگے بڑھایا تھا۔

''آپ کو شرم نہیں آتی...... دوسروں کی چیزوں پر قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر اتنی

ضرورت ہے بائیک کی تو خود کیوں نہیں خرید لیتے اب یاسر بھائی دوسروں کے محتاج بنے رہیں اور آپ ٹھاٹ سے اُن کی بائیک چلائیں۔''

بائیک سوار نے ایک جھٹکے سے ہیلمٹ اُتارا تھا اور عیشاء کا سانس جیسے سینے میں رُک گیا، بائیک پر کوئی اور نہیں یاسر ہی تھا۔

''یاسر بھائی آپ؟'' بوکھلاہٹ میں بس اتنا ہی منہ سے نکلا۔

''میرے پیچھے آؤ ذرا......'' یاسر اُسے حکم دیتا آگے بڑھ گیا اور وہ کسی معمول کی طرح سر جھکائے اُس کے پیچھے چل دی۔

یاسر نے مہمانوں والی بیٹھک کا دروازہ کھولا اور اندر جا کر اسے بھی اندر آنے کا اشارہ دیا۔

عیشاء اندر داخل ہوگئی۔

''بیٹھو یہاں......'' یاسر کی آواز میں سختی تھی۔

عیشاء کی بولتی بند ہو چکی تھی وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''اب بتاؤ مجھے...... آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہو کہ روزانہ ڈانٹ پڑے۔ آخر تم کب سدھرو گی؟ ابھی اگر سچ میری جگہ میرا کوئی دوست ہوتا تو وہ کیا سوچتا کہ کیسی لڑکیاں ہیں اس گھر کی جنہیں عزت اور ذلت کا کوئی خیال نہیں ہے۔ بے باکی سے دروازے پر پہنچ گئیں کسی کے بھی منہ لگنے کے لیے۔''

عیشاء نے تڑپ کر سر اٹھایا تو آنکھیں ڈھیروں ڈھیر پانیوں میں تیر رہی تھیں۔ یاسر کا دل بھی آنکھوں کے ساتھ ڈوبنے کو تھا۔

''میں کیا کروں...... آپ کو یا ثناء کو...... ذرا سی بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' عیشاء نے بدقت کہا تھا۔

''محبت میں عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے سمجھیں...... آئندہ خیال رکھنا۔'' یاسر نے نرم لہجے میں بس اتنا ہی کہا تھا۔

وہ تو بیٹھک سے چلا گیا مگر عیشاء کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی روتی رہی پتہ نہیں اُس کی باتوں کو سب اتنا غلط کیوں لیتے تھے۔ جب دل کا غبار آنسوؤں میں بہہ گیا تو دوپٹے سے چہرہ رگڑ کر کھڑی ہوگئی۔

ویسے بھی اب رونے کا کیا فائدہ نادانی تو اُس سے ہو ہی چکی تھی۔

ابھی تو رونے کا دوسرا اسٹیشن بھی ہونا تھا جب یاسر بھائی تائی اماں کو جا کر بتائیں گے اور تائی اماں مشکل ترین محاوروں سے سجا کر اُسے ایسے طعنے دیں گی کہ اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگے گا۔

لہٰذا اُس نے اپنے آنسو آنے والے وقت کے لیے بچا کر رکھے اور اپنے پورشن میں واپس آگئی۔ مگر پھر حیرت انگیز بات ہوگئی تائی اماں کے کانوں تک یہ بات پہنچی ہی نہیں اور اُس کے اندر پہلی بار یہ خوش کن احساس جاگا کہ محبت کی خاردار راہوں پر وہ اکیلی محوِ سفر نہیں ہے۔

عیشاء کا شمار تو ویسے بھی اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو زندگی کے کارزار میں خوش ہونے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اور وہ جی بھر کے خوش ہوئی اتنی کہ اپنے آپ سے وعدہ کرنا ہی بھول گئی کہ آئندہ کوئی طعنے سننے والی حرکت نہیں کرے گی۔

☆......☆......☆

ثناء اپنے موبائل میں لگی ہوئی تھی، سامنے کتابیں دھری تھیں، فردوس بیگم نے دور سے دیکھا ثناء کتاب سے کچھ دیکھ کر موبائل میں ٹائپ کر رہی تھی۔ انہوں نے طمانیت سے لبریز لمبی سانس کھینچی اور سبزی کا طشت اٹھائے اپنی دیورانی یاسمین کی طرف آ گئیں۔

''ارے یاسمین...... کچھ کام کر رہی ہو گیا؟''
باورچی خانے سے آتی کھٹر پٹر کی آوازوں پر انہوں نے اسی طرف منہ کر کے تان لگائی۔

''بھابی آپ بیٹھیں میں بس ابھی آئی۔''
حسب توقع باورچی خانے سے یاسمین کا جواب آیا تھا۔

''آتے وقت چھری اٹھا لانا...... ڈھیروں ساگ لے آئے تمہارے بھائی میں نے سوچا تمہارے ساتھ مل کر بنوا لوں گی۔''

دالان میں پڑے تخت پر بیٹھ کر انہوں نے تنقیدی نگاہ سے اردگرد کا جائزہ لیا تو دالان کے آخری سرے پر طوطے کے پنجرے کے پاس کسی کام میں تندہی سے مشغول عیشاء پر نظر پڑ گئی۔ وہ طوطے پر اسپرے کر کے غالباً اُسے غسل دے رہی تھی اور طوطا ٹیں ٹیں چیختا پنجرے میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔

فردوس بیگم کے ابرو تن گئے۔ لیکن اس بات پر خوشی بھی تھی کہ عیشاء کو دو چار باتیں سنانے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔

''چہ چہ چہ...... تمہیں کوئی عقل وقل ہے یا نہیں؟ سارا دن فضول کاموں میں لگی رہتی ہو......''

''یہ فضول کام نہیں ہے تائی اماں...... میرا مٹھو نہانے سے بہت خوش ہوتا ہے ابھی آپ دیکھنا کیسے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر خوشی کا اظہار کرے گا۔'' عیشاء نے گویا انہیں بڑے کام کی بات بتائی تھی، انداز تو ایسا ہی تھا مگر تائی اماں فردوس بیگم کے ماتھے کے بلوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''اپنی مرضی کے احساسات خوب مل جاتے ہیں تمہیں...... ہونہہ خوشی کا اظہار کرے گا، موا طوطا نہ ہوا کوئی دل پھینک قسم کا سڑک چھاپ عاشق ہو گیا جو تمہاری ان حرکتوں پر خوش ہوگا۔''

عیشاء لمحے بھر کو ٹھٹک سی گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے طوطے کے پنجرے کے سامنے سے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا کہ تائی اماں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا وہ طوطے کے ساتھ ہی اُس کا افیئر چلوا دیتیں۔ یہ سوچ کر مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتی وہ مزید کوئی جواب دیے وہاں سے رفو چکر ہونے ہی لگی تھی کہ تائی اماں نے اس کے ارادے بھانپ کر اپنے دل کی تسلی کا مزید انتظام کیا۔

''ثناء بتا رہی تھی تمہارے امتحان ہونے والے ہیں...... تیاری ہو گئی تمہاری؟ سارا دن تو تم اول جلول کاموں میں لگی رہتی ہو کبھی پڑھائی میں بھی دیدہ لگا لیا کرو...... شاباش ہے تمہاری ماں کو...... بڑی ڈھیل دے رکھی ہے تمہیں؟''
یاسمین کو آتا دیکھ کر فردوس بیگم کی توپوں کا رخ اب دیورانی کی طرف ہو گیا تھا۔

عیشاء نے ماں کے چہرے کو بجھتے دیکھا تو اُس کے چہرے کی جوت بھی ماند پڑ گئی۔ پتہ نہیں تائی اماں ہمیشہ اس کے ماں باپ کو درمیان میں کیوں لے آتی تھیں۔

مگر ہمیشہ کی طرح اُس نے مجرموں کی طرح سر جھکایا اور خاموشی سے اندر چلی گئی۔ وہ چاہے جیسی بھی تھی مگر کبھی ادب و آداب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا اسی لیے اس کے ماں باپ کو بھی یقین تھا کہ اُن کی بیٹی باادب ہے تو بانصیب بھی ہوگی۔

☆......☆......☆

ہائے ثناء تمہاری تصویریں کتنی اچھی آئی ہیں۔ اپنے سارے گروپ میں سب سے پیاری لگ رہی ہو تم......'' ثناء کا ٹیبلیٹ ہاتھ میں لیے وہ

اُسے سچے دل سے سراہ رہی تھی۔
ثناء کے کالج کی تصویریں تھیں جس میں تمام لڑکیوں کے درمیان ثناء یقیناً نمایاں نظر آ رہی تھی۔
ثناء نے مسکرا کر عیشاء کے پُر خلوص چہرے کی جانب دیکھا۔
''اگر ان تصویروں میں تم بھی ہوتیں تو یہی بات میں تمہارے لیے کہہ رہی ہوتی...... مگر تم تو ساتھ گئی ہی نہیں...... کتنا اصرار کیا تھا میں نے......''
''سچ ثناء...... میرا بھی بہت دل چاہ رہا تھا تمہارے ساتھ کالج فنکشن اٹینڈ کرنے کا مگر اماں کی طبیعت بھی تو اس دن کتنی خراب تھی۔'' عیشاء کے لہجے میں تاسف تھا۔
''گھر میں سب موجود تھے عیشاء...... مگر تم تو اپنے سے منسلک رشتوں کے معاملے میں کسی پر بھروسہ ہی نہیں کرتیں۔''
ثناء کا لہجہ شکایتی تھا اور اُن ہر دل عزیز رشتوں میں تم بھی شامل ہو...... عیشاء محبت سے پُر لہجے میں بولی تھی۔
ثناء سوچتی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔
''کیا ہوا...... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' عیشاء اُس کے تعجب پر متعجب تھی۔
''کچھ نہیں بس ایسے ہی......'' ثناء بات ٹال کر کتابیں سمیٹنے لگی جو بیڈ پر بکھری ہوئی تھیں۔
عیشاء نے جھٹ کتابوں کے درمیان سے گلابی جلد والی شاعری کی کتاب اٹھالی۔
''صرف تم......'' کاشی چوہان...... عیشاء نے باآواز بلند پڑھا تھا۔
''اوہو...... شاعری پڑھی جارہی ہے اور وہ بھی کورس کی کتابوں کے ساتھ......''
''لاؤ مجھے دو...... میری دوست کی ہے خراب ہوجائے گی۔'' ثناء نے جلدی سے کتاب ہاتھوں سے اُچک لی۔
''اچھا سنو...... امی کے سامنے مت کہنا...... تم جانتی ہو ناں......'' ثناء نے لجاجت سے کہا تو عیشاء کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ثناء کے موبائل پر میسیج ٹون بجی تھی۔ عیشاء نے جھٹ فون اٹھالیا۔
''میں بھی تو دیکھوں میرے علاوہ اور کون چاہنے والا ہے تمہارا؟'' ثناء ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر سرعت سے فون عیشاء کے ہاتھ سے لے کر بولی۔
''تم مجھ سے باتیں کرنے آئی ہو یا الٹی سیدھی چیزوں میں وقت ضائع کرنے......؟ چلو آؤ چھت پر چلتے ہیں اتنا پیارا موسم ہورہا ہے۔''
مجبوراً عیشاء کو ثناء کا ہم قدم ہونا پڑا۔ ورنہ آج کل تائی اماں کے تبدیل ہوتے تجزیے نے اُسے تھوڑا محتاط پسند بنادیا تھا۔ پہلے وہ تائی اماں کی نظروں میں محض بدتہذیب اور پھوہڑ تھی اور شاید نالائق بھی......
مگر اب اُن کے تجزیے میں یہ بات بھی شامل ہوچکی تھی کہ عیشاء جان بوجھ کر ایسے کام کرتی ہے تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ تائی اماں 'لوگ' کسے کہتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے عیشاء کے مٹھو (طوطے) کو انہوں نے 'لوگ' میں شامل کردیا تھا۔
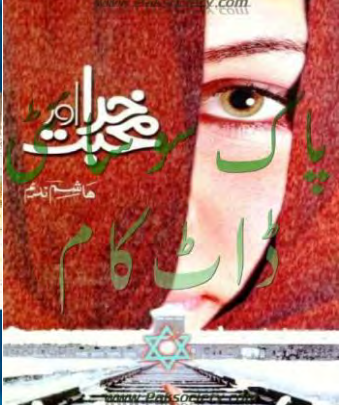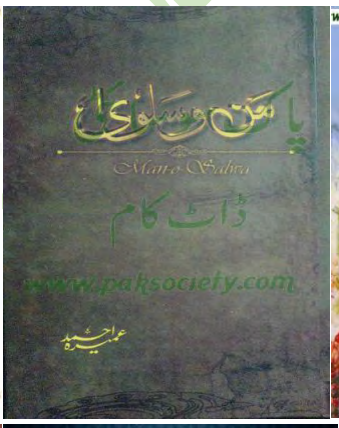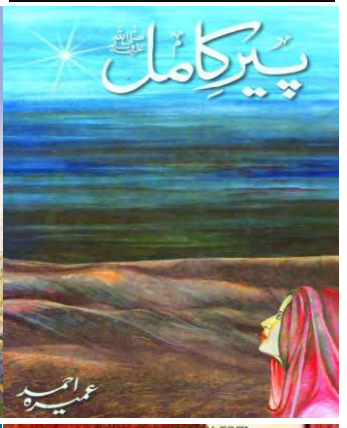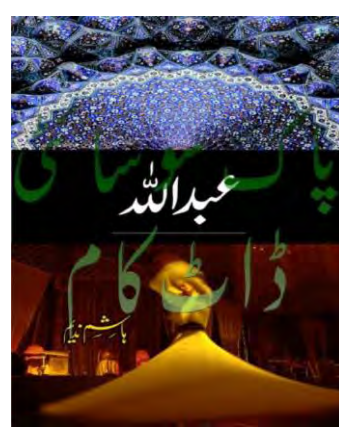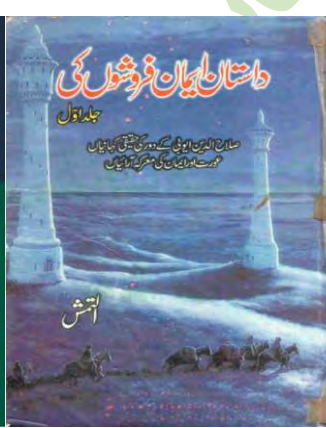
☆......☆......☆

''عیشاء...... یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ تم جھنڈیاں لگانے چھت کی دیواروں پر چڑھی تھیں؟'' یاسمین ابھی ابھی فردوس بیگم کی طرف سے آئیں تھیں۔
''کچھ نہیں ہوتا اماں......'' بچے ثناء کھڑی تھی،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اگر میں گرتی تو وہ مجھے تھام لیتی۔'' عیشاء نے شہد رنگ بالوں کی چوٹی گوندھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''میں گرنے کی وجہ سے نہیں کہہ رہی ہوں لڑکی...... چھت کی منڈیروں پر چڑھتے ساری دنیا نے دیکھا ہوگا۔ اچھی لگتی ہیں لڑکیاں اس طرح دیواروں پر چڑھتی ہوئی...... کچھ تو اپنی عزت کا خیال کر۔''

''عزت کا ہی تو خیال تھا...... راجو نے اپنا جھنڈا اتنا اونچا کر کے لگایا تھا اس لیے مجبوراً مجھے بھی چھت کی ٹینکی پر چڑھنا پڑا۔ اب ہمارا جھنڈا سب سے اونچا لہرا رہا ہے۔ عیشاء کی آنکھوں میں چمک در آئی۔

''تُو چھت کی ٹینکی پر بھی چڑھی تھی؟'' یاسمین نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''راجو بارہ سال کا بچہ ہے عیشا تُو بیس سال کی ہوچکی ہے کچھ تو شرم کر...... اب تو محلے کے بچوں سے مقابلہ کرے گی؟''

''بیس سال کا ہونے پر وطن سے محبت ختم تو نہیں ہو جاتی اماں...... اور قسم سے مجھے کسی نے اوپر چڑھتے نہیں دیکھا۔''

''کسی نے نہیں دیکھا مگر بھابی نے دیکھ لیا ہے...... اور برابر والی نجمہ تک پوری کہانی پہنچا بھی دی ہے۔ وہ ابھی آ کر مجھے یہی سنا رہی تھی کہ ''بیٹی کو قابو میں کرو...... فردوس آپا کی ثناء بھی تو ہے...... وغیرہ وغیرہ......''

''اور ٹھیک کہتی ہیں بھابی...... ثناء کو دیکھا ہے کبھی ایسی حرکتیں کرتے...... کتنی تہذیب اور شائستگی ہے اُس کے اندر...... ہر کوئی تعریف کرتا ہے اُس کی۔''

''ایک تم ہو...... نہ اٹھنے کا سلیقہ نہ بیٹھنے کی تمیز...... سارا دن ایک پائنچا اوپر تو دوسرا نیچے...... دوپٹہ پیروں میں جھولتا رہتا ہے۔ کوئی ایک گھنٹہ تمہیں بیٹھ کر غور سے دیکھے تو یہی کہے گا کہ ذرا سی بھی تمیز اور سلیقہ نہیں ہے لڑکی میں......''

اماں کے طول دیتے طعنے اُسے اکتا گئے اور آخری والی بات تو بالکل بھی ہضم ہونے والی نہیں تھی بھلا کوئی کیوں اسے غور سے دیکھے اس لیے اب بولنا ضروری ہو گیا تھا۔

''کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہر وقت میرا مشاہدہ کرتا رہے...... انسان کی ذاتی زندگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے اماں...... انسانی جسم کا پہلا غلاف وہ لباس ہوتا ہے جسے ذاتیات کہتے ہیں اور کسی کے ذاتی لباس میں چھید کر کے جھانکنے والے لوگ مجھے زہر لگتے ہیں۔''

''کیسے سمجھاؤں تجھے عیشاء......'' اماں بیزار ہوگئیں۔

''ایسے ہی سمجھائیں جیسے سمجھاتی ہیں مگر دوسروں کی نظروں سے تول کر نہیں جن کی نظروں میں ہمیشہ جھول ہوتا ہے۔ تائی اماں مجھے آپ سے اور ابا سے زیادہ بہتر تو نہیں جانتی ناں......؟''

عیشاء کی بات میں وزن تھا مگر اُسے یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ اُسے اپنی زندگی کے طور طریقے دوسروں کے لیے بھی پسندیدہ بنانے ہیں۔

''لیکن میری چندا...... میں چاہتی ہوں میری بیٹی کی بھی ایسے ہی تعریف ہو جیسے ثناء کی ہوتی ہے۔ تیرا دل نہیں کرتا کہ سب تیری تعریف کریں کیسا اچھا محسوس ہوتا ہے اپنے بارے میں اچھی رائے سن کر۔''

''زیادہ تعریفیں جذبات پر ہی نہیں عقل پر بھی اثر ڈالتی ہیں اماں آپ کیا چاہتی ہیں...... میری رہی سہی عقل بھی ختم ہو جائے۔'' عیشاء کے سوال نے

یاسمین کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

"اس لڑکی کا واقعی کچھ نہیں ہوسکتا...... اور اب وقت تھا کہ یاسمین ایک دفعہ پھر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائیں اور انہوں نے یہی کیا۔

☆......☆......☆

میری ثناء...... ماشاءاللہ...... ایسی سلیقہ مند ہے کہ پوچھو مت...... میری بچی کے دو ہی شوق ہیں یا تو پڑھائی...... یا پھر میرے ساتھ گھر کا کام کروانا...... مجال ہے جو میری ثناء کسی الٹے سیدھے کاموں میں پڑی ہو...... ورنہ آج کل کی لڑکیاں الامان الحفیظ......"

فردوس بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور یاسمین کو اندازہ ہوگیا کہ اب اگلا جملہ عیشاء کے حوالے سے ہوگا اور وہ دل میں شرمندگی محسوس کرنے لگیں۔ جبکہ فردوس بیگم اُن کے جذبات سے بے خبر پڑوسن کو اپنے خیالات سے نوازتی رہیں۔

"اب ہمارے ہی گھر میں دیکھ لو...... عیشاء صاحبہ صحن کے پچھواڑے حصے میں محلے کی بچیوں کے ساتھ پہل دوج کھیل رہی ہیں...... ارے میں تو دس دفعہ شمیم صاحب سے کہہ چکی ہوں کہ دیواریں اونچی کروادیں۔ دوسرے گھروں سے سامنا پڑتا ہے کسی کو کیا پتہ کہ ہماری بیٹی ہے یا اِن کی بیٹی ہے۔ مگر ناں جی...... نہ تو اس گھر کے مردوں کو اس بات کا احساس ہے اور نہ یاسمین بیگم بیٹی کو کمرے تک محدود کرتی ہیں۔ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو آپ ہی بھگتیں گے۔"

"ایک میری ثناء ہے مجال ہے جو کام نمٹا کے اِدھر اُدھر گھومے...... اپنے کمرے میں رہتی ہے وہ بھی پردے ڈال کر......" احساسِ تفاخر اُن کی رگ رگ سے پھوٹ رہا تھا۔

"شیطان کا وار تنہائی میں ہی چلتا ہے بھابی۔" نہ جانے کیسے یاسمین کی زبان سے پھسل گیا۔

"مجھ پر طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے بی بی...... رسوائی سے تنہائی بھلی کیوں غلط کہہ رہی ہوں۔"

پڑوسن سے تصدیق کروا کے فردوس بیگم کینہ پرور نظروں سے یاسمین کو گھور رہی تھیں اُس نے نظریں چرالیں۔

☆......☆......☆

عیشاء کالج سے لوٹی تو اماں کو مسہری پر لیٹا دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

"اماں...... ایسے کیوں لیٹی ہیں...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟"

"کچھ نہیں عیشاء بس ذرا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا تمہارے ابا دوا دے کر گئے ہیں تم پریشان مت ہو...... اور ہاتھ منہ دھو کر ذرا کپڑوں کا بیگ تیار کردو ہمیں حیدرآباد جانا ہے۔"

"حیدرآباد...... خیر تو ہے، یوں اچانک......"

عیشاء مزید پریشان ہوگئی۔

"تمہاری نانی کی طبیعت خراب ہے تمہارے ماموں نے فوراً بلایا ہے۔" بولتے بولتے اماں کی آواز رندھ گئی۔

"کچھ نہیں ہوگا نانی کو...... دیکھنا آپ کو دیکھتے ہی کھڑی ہوجائیں گی۔" عیشاء نے ہلکے پھلکے انداز میں ماں کو دلاسا دینا چاہا تھا مگر حقیقتاً وہ خود بھی اندر سے بے چین ہوگئی تھی اس لیے فوراً حیدرآباد جانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔

"ابا بھی ساتھ جائیں گے؟" کپڑے رکھتے رکھتے اُسے خیال آیا۔

"ہاں بیٹا...... وہ ہمیں اکیلا تھوڑی جانے دیں گے۔" عیشاء نے اثبات میں گردن ہلا کر اُن کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

☆......☆......☆

چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہی اُس کی نظر ٹیبل پر رکھی ایک زبردست سی مردانہ گھڑی پر پڑی تو وہ ماں سے پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''یہ کس کی گھڑی ہے کون لایا؟'' ثناء نے تجسس میں گھڑی اٹھا کر دیکھا جس کے ڈائل پر مشہور کمپنی کا نام لکھا تھا۔

''میری ہے...... بابا نے گفٹ دیا ہے......'' یاسر کف کے بٹن لگاتے ہوئے کرسی پر بیٹھا تھا۔

''کیوں بہن کو تنگ کر رہا ہے......'' فردوس بیگم نے پیار سے بیٹے کو گھر کا یاسر کے کسی دوست نے تحفہ دیا ہے۔ امی نے وضاحت دی مگر ثناء کی تسلی نہ ہو سکی۔

''سچ بتاؤ بھائی...... بابا نے ہی دلائی ہے ناں...... میں بابا سے سخت ناراض ہو جاؤں گی۔'' وہ سچ مچ رو دینے کو تھی۔

''ارے بھئی...... بابا سے کیوں ناراض ہو جائے گی ہماری بیٹی۔ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔'' شمیم صاحب آتے ہوئے بولے۔

''یاسر نے اس سے یہ کہا ہے کہ یہ گھڑی آپ نے اسے دلائی ہے اس بات کا قلق ہو رہا ہے آپ کی بیٹی کو......'' فردوس بیگم نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''قلق نہیں امی...... حسد ہو رہا ہے اسے۔'' یاسر نے لقمہ دیا۔

''گھڑی تو واقعی لاجواب ہے۔'' بابا نے ستائشی انداز میں سراہا۔

''میرے دوست نے دی ہے بابا وہ کل ہی دبئی سے آیا ہے۔'' یاسر نے مسکراتے ہوئے سچ بتانے سے پہلے ثناء کو دیکھا تو وہ ناک سکیڑ کر رہ گئی۔

''اتنا مہنگا تحفہ دے کر تو اُس نے واقعی میں ہمیں مرعوب کر دیا ہے۔'' شمیم صاحب نے ازراہِ تفنن کہا تھا۔

''مہنگے تحفے کی یہی تو خوبی ہوتی ہے لوگ امپریس ہو جاتے ہیں۔'' یاسر مسلسل ثناء کو جلا رہا تھا مگر ثناء کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔ اس کے ذہن میں یاسر کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''مہنگے تحفے کی یہی تو خوبی ہوتی ہے لوگ امپریس ہو جاتے ہیں۔'' کیا واقعی کسی کو امپریس کرنے کے لیے قیمتی تحفہ دینا کارگر ثابت ہوتا ہے۔ ذہن میں اٹھتا یہ سوال پورے منظر پر حاوی ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

''امی...... چچی لوگ کب آئیں گے حیدرآباد سے؟'' ثناء نے ماں کے ساتھ مٹر چھیلتے ہوئے پوچھا تھا۔ لہجے میں بوریت نمایاں تھی۔

''میرا خیال ہے کل یا پرسوں تک واپسی ہوگی۔ یاسمین خوامخواہ روتی پیٹتی گئی، اُن کی اماں تو خیر سے پھر جاتے جاتے واپس آ گئیں۔''

''ایسے تو مت کہیں امی۔'' ثناء کو اچھا نہیں لگا تھا۔

''ارے میں تو مذاق کر رہی تھی...... اچھا ہاں یاد آیا...... صبح جاتے وقت یاسر اپنی گھڑی ڈھونڈ رہا تھا تم نے تو نہیں رکھ دی کہیں؟''

''میں نے...... نہیں تو۔'' ثناء کے کورے جواب پر فردوس بیگم تردد میں پڑ گئیں۔

☆......☆......☆

''بیٹا میں نے تو پورا گھر چھان مارا...... مجھے تمہاری گھڑی نہیں ملی اور نہ ثناء نے رکھی...... مجھے لگ رہا ہے تم پہن کر گئے تھے کہیں گرا آئے۔'' فردوس بیگم پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''ہو سکتا ہے...... لیکن اُس کا کہیں (ڈبہ) بھی نہیں مل رہا ہے اگر میں گھڑی پہن کر گیا تھا تو ڈبہ تو

گھر میں ہونا چاہیے تھا ناں یاسر ابھی بھی تذبذب میں تھا۔
''ڈبہ تو خالی تھا اس لیے میں نے پھینک دیا۔'' ثناء اندر آتے ہوئے یاسر کی بات سن کر بولی تھی۔
''یہ دیکھیں...... مجھے لگ رہا ہے اس نے گھڑی سمیت ڈبہ پھینک دیا ہے۔'' یاسر کو غصہ آ گیا تھا۔
''بھائی میں پاگل ہوں جو بغیر چیک کیے ڈبہ پھینک دوں گی۔ آپ خود کہیں گرا کر آئے ہوں گے۔'' ثناء کے صاف جواب پر یاسر بھی چپ ہو گیا مگر اندر سے ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ گھڑی ہاتھ سے گر گئی۔

☆......☆......☆

ارادہ تھا کہ پیچھے سے جا کر چپکے سے ثناء کو ہاؤ کہہ کر چونکا دے گی اس لیے عیشاء دبے قدموں سے فون پر بات کرتی ثناء کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔
''لیکن میں دوبارہ نہیں مل سکتی...... مجھے ڈر لگتا ہے...... اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو......'' ثناء کی سراسیمہ سی آواز میں جذبات کی نئی آنچ دہک رہی تھی۔ عیشاء تھوڑی دیر کے لیے سن ہو گئی۔
یہ ثناء کن راہوں پر چل نکلی تھی۔ عیشاء نے کچھ سوچا اور پھر ایک قدم آگے ہو کر ثناء کے سامنے آ گئی۔
''تت...... تم......'' ثناء کے گھبراہٹ میں ہاتھ سے فون گر گیا۔
''عیشاء...... تم...... کب آئیں......'' ثناء کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔
''مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرے نہ ہونے سے اتنا کچھ ہو جائے گا۔'' عیشاء کی آواز میں بے پناہ فکر تھی ثناء کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔
''اتنا کچھ نہیں...... بہت کچھ ہو گیا ہے

عیشاء...... میں بہت دور نکل گئی ہوں لوٹنے کے لیے مت کہنا پلیز......'' عیشاء کے دونوں ہاتھوں پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
''کون ہے وہ؟'' عیشاء کے انداز میں روکھا پن آ گیا تھا۔
''میری کلاس فیلو...... سبین کا بھائی...... ولید......'' نام لیتے ہوئے ثناء کے لہجے میں صرف محبت کی آنچ تھی۔
''میں اُس کے بغیر مر جاؤں گی عیشاء......'' اُس کے صادق جذبے عیاں ہو رہے تھے۔
''اگر اُس کے ساتھ جینا ہے تو اُس سے کہو شرافت سے رشتہ بھیجے۔'' عیشاء ایک دم بڑی بن گئی تھی ثناء کو تو ایسا ہی لگا۔
''میں تمہیں اُس سے ملانا چاہتی ہوں۔'' ثناء نے جیسے اُسے عزت بخشی تھی۔
''مگر میں نہیں ملنا چاہتی۔'' عیشاء نے صاف گوئی سے کہا تھا۔
''میری خاطر پلیز......'' ثناء گڑگڑائی۔
''جب فیصلہ کر چکی ہو تو پھر......'' عیشاء نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔
''ابھی صرف محبت کی ہے۔'' ثناء جلدی سے بولی تھی۔
''اُس کے بغیر جینے سے انکار نہیں کیا؟''
''وہ دل کی مجبوری ہے فیصلہ نہیں۔''
''اگر میں نے اُسے ریجیکٹ کر دیا تو پیچھے ہٹ جاؤ گی؟'' عیشاء اُسے آزمانے پر تلی ہوئی تھی۔
''تم اُسے ریجیکٹ نہیں کر سکتیں۔ اُس کی بولی تو مصر کے بازار میں لگ جائے۔''
''زلیخا مت بنو...... تائی اماں کو اپنی تربیت پر نازاں رہنے دو۔'' عیشاء نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گئی۔

''اچھا...... تم اُس سے مل کر صرف اتنا کہہ دو کہ وہ دیر نہ کرے جلد میرا ہاتھ مانگ لے۔ اتنا تو کر سکتی ہو ناں؟'' ثناء لجاجت پر اُتر آئی۔

''تم خود بھی تو کہہ سکتی ہو۔'' عیشاء چڑ گئی۔

''اپنا آپ بے مول نہیں کیا جاتا۔'' وہ سسکنے لگی تو عیشاء کا دل موم ہو گیا۔

''کب اور کہاں؟''

''کل رات...... گھر کی چھت پر......'' ثناء نے اُس کے سر پر گویا بم پھاڑ دیا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' وہ بھڑ گئی۔

''میں دل کی دسترس میں ہوں...... دماغ میرا رقیب ہے۔'' ثناء نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور عیشاء ہمیشہ کی طرح محبت کے آگے مجبور ہو گئی بھول گئی کہ یاسر نے کہا تھا کہ محبت میں عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

☆......☆......☆

رات کا پچھلا پہر تھا۔

عیشاء بے تابی سے کروٹیں بدل رہی تھی اور شدت سے متمنی تھی کہ ثناء کی خواہش بھی کروٹ بدل لے...... اور آج کی یہ رات ویسی بالکل بھی نہ ہو جیسی ثناء چاہتی تھی۔ عیشاء لاکھ لاابالی سہی مگر اپنے بڑوں کو دھوکا دینا...... یہ خیال ہی اس کے لیے جان لیوا تھا۔

مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ آئندہ ثناء کو ایسی کوئی حرکت کرنے نہیں دے گی اور اُس لڑکے سے بھی کہے گی کہ شریفوں کی طرح رشتہ بھیجے...... یوں چور راستے اختیار کر کے اپنی اور ثناء کی عزت کو داؤ پر نہ لگائے۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آہٹ اُس کی سوچوں کو متزلزل کر چکی تھی۔ ولید آ چکا تھا اور شاید اب دونوں کا رخ اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف تھا۔

عیشاء وعدہ نبھانے کی پابند تھی اور پابند بھی کس کی؟ اپنی بہن جیسی کزن کی۔ اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے اپنی دونوں ٹانگوں میں رعشہ محسوس کیا تھا۔

حسب توقع ثناء اوپری سیڑھی پر کھڑی اُس کی آمد کی منتظر تھی۔ عیشاء کو اوپر آتا دیکھ کر اُس نے شکر کے انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

''ولید مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ بس تم چند منٹ یہاں ٹھہرو پھر میں تمہیں ولید سے ملواؤں گی۔'' چھت پر ایک طرف ادھورے کمرے کی دیواروں کی آڑ میں وہ دونوں راز و نیاز میں مشغول ہو چکے تھے۔

یقیناً ہر محبت کرنے والے کی طرح ثناء کے لیے بھی یہ پل زندگی کے حسین ترین پل تھے، مگر عیشاء کے لیے تو جیسے ہر گزرتا پل جان لیوا تھا۔

ہوا کی سرسراہٹ سے لے کر پتے کی کھڑکھڑاہٹ تک ہر آہٹ اُس کی رگوں میں موت بن کر اتر رہی تھی۔ اُسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ چند لمحے پل صراط کا سفر بن جائیں گے۔ وہ گویا جان کنی کی حالت میں تھی۔

اُس نے ایک پل کے لیے بھی اپنی نظریں اوپر آتی سیڑھیوں سے نہیں ہٹائی تھیں تب ہی اُس کی پشت پر قدموں کی آہٹ ابھری اور وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

''آرام سے عیشاء اوپر تو ہم ہیں۔'' ثناء کی آواز دھیمی مگر چہکدار تھی۔ عیشاء مسکرا بھی نہ سکی اس نے بدقت ثناء کی محبت کی طرف دیکھا جو گدلے اندھیرے کے باعث ممکن نہ ہو سکا۔ مگر ابھی دیکھنے دکھانے کا وقت نہیں تھا لہٰذا عیشاء فوراً مطلب کی بات پر آ گئی۔

ثناء کو اپنی انا اور خوداری عزیز تھی اس لیے وہ

ٹہلتی ہوئی دوبارہ اُس طرف چلی گئی جہاں وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

''ثناء بتا رہی تھی کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' سناٹے میں بھاری مردانہ آواز عیشاء کو صورِ اسرافیل لگی۔ پھر بھی اُس نے جلدی جلدی وہ سب کہنا شروع کر دیا جو وہ سوچ کر آئی تھی اُس کا انداز روکھا، مروت سے عاری اور کسی حد تک درشت تھا۔ مقابل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی مگر اگلے ہی لمحے وہ سرعت سے دوڑتا ہوا زینہ اترتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی سمجھتی تایا ابا کا ہاتھ اُس کے سر سے ذرا نیچے گردن پر تھا۔

انہوں نے پوری قوت سے اُس کی چوٹی کو نیچے دھکیلا تھا۔

''کون تھا یہ؟ کس کے ساتھ ملنے آئی اوپر؟'' تایا ابا کی دھاڑ نے گھر کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

عیشاء نے گھبرا کر اُس سمت دیکھا جہاں ثناء کھڑی تھی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُس نے چاہا ثناء کو آواز دے کر بلائے مگر تایا ابا کے زوردار تھپڑ نے اُس کی زبان کو گنگ کر دیا۔

یکے بعد دیگرے سب گھر والے چھت پر آنے لگے مگر ثناء کو نہ دیوار کی آڑ سے باہر آنا تھا نہ آئی...... وہ یہ بھی فراموش کر گئی کہ عیشاء پر یہ مصیبت صرف اسی کی وجہ سے آئی ہے۔

اماں، ابا پر سکتہ طاری تھا۔ اور یاسر...... وہ ناقابلِ بیان اذیت آنکھوں میں سمیٹے ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے حوالے سے تائی اماں کے تمام خدشات رنگ لے آئے تھے اس لیے عیشاء صرف 'دیکھا میں نہ کہتی تھی' کی گردان سن رہی تھی آگے کے الفاظ نہ وہ سننے کی کیفیت میں تھی اور نہ الفاظ اس قابل تھے کہ انہیں سنا جائے۔

پھر جب تایا ابا اُسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لے گئے تب ثناء کپکپاتا وجود لیے کسی گہرے راز کی طرح خاموشی سے زینہ اُتر گئی اُس نے اپنی ماں کی تربیت پر تو کوئی آنچ نہ آنے دی لیکن عیشاء کی ساری زندگی کو آگ کی نذر کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ اُس کی زندگی کی پہلی صبح تھی جب ماں باپ ماتھا چوم کر اُسے جگانے نہیں آئے تھے حالانکہ وہ سوئی نہیں تھی۔

تایا ابا اسے کمرے میں دھکیل کر کہہ کر گئے تھے کہ صبح دس بجے کوئی فیصلہ کیا جائے گا اور پھر صبح کے ساڑھے دس بجے اُس کے اعمال کو جانچنے اور سزا سنانے کا وقت آ گیا۔

پورا گھر اس وقت ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ تایا ابا اور تائی اماں منصف بنے بیٹھے تھے اور وہ کٹہرے میں تھی۔ اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے اماں ابا کی طرف دیکھا مگر وہ ایک مجرم کے ماں باپ تھے پھر بھلا سر اٹھانے کی سکت کہاں تھی، یاسر بھی کمرے میں موجود تھا مگر وہ بیٹھا نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر نظریں گاڑھے کھڑا تھا۔

''لڑکے کا نام بتا...... کون تھا وہ؟'' تایا ابا کی گرجدار آواز نے اس کے وجود پر کپکپی طاری کر دی۔

''نام بتا لڑکی اپنے عاشق کا جس کے ساتھ منہ کالا کرنے گئی تھی چھت پر...... یہ میسنا پن اب نہیں چلے گا بہت دیکھ لیے تیرے ڈرامے......'' تائی اماں اُسے مہلت دینے کو تیار نہ تھی اُن کے الفاظ پر عیشاء نے تڑپ کر ابا کی طرف دیکھا کہ شاید وہ تائی اماں کو ایسے الفاظ بولنے سے روکیں مگر اُن کا زمین کو چھوتا سر اور لرزتا وجود عیشاء کے لیے امتحان بن گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''میرا کوئی قصور نہیں ہے...... میں بے قصور ہوں۔''

''اِس فتنہ کے ڈرامے پھر شروع ہوگئے۔ ٹھہر جا...... تیرے تو اچھے بھی بتائیں گے کہ کس کے ساتھ آدھی رات کو رنگ رلیاں منا رہی تھی۔'' تائی اماں اُٹھ کر اُس کے پاس آگئیں اور پھر کئی تھپڑ اُس کے رسید کرکے اس سے ایک ہی سوال پوچھنے لگیں کہ

''وہ لڑکا کون تھا؟''

وہ کیسے بتاتی کہ وہ کون تھا...... اُسے تو اب اُس کا نام بھی بھول گیا تھا۔

''میں قسم کھاتی ہوں تائی اماں...... مجھے اس کا نام نہیں معلوم...... ثناء کو معلوم ہے۔'' یہ الفاظ کہنے تھے کہ تائی اماں آپے سے باہر ہوگئیں۔

''میری بچی کو پھنسانے کی کوشش کررہی ہے، بے ناں آخر فتنہ گر، مگر میں تو تیرا خون پی جاؤں گی۔ اب اگر اپنی گندی زبان سے میری پاک دامن بیٹی کا نام لیا ہو تو......''

تائی اماں کی نہ زبان رُکتی تھی اور نہ ہاتھ وہ لڑکھڑا کر دو قدم دور کھڑی ماں کے شانے سے جا لگی' مگر ابا نے اُسی وقت اماں کو کھینچ کر اُس سے دور کیا تھا اور یہ منظر موت سے کہیں زیادہ جاں گسل تھا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

ثناء کسی پارے کی مانند مضطرب، بے قراری سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی ہر گزرتے پل اُسے لگتا ابھی اُسے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے لیے بلایا جائے گا۔ رات سے اب تک ولید نے کئی فون کرلیے تھے مگر اُس کی ہمت نہیں تھی کہ اس کا فون ریسیو کرتی اُس نے اپنا فون 'خاموش' کررکھا تھا۔ ولید کے تمام پیغامات مٹا دیے مبادا اُس کا فون تفتیش کے لیے نہ چلا جائے۔ وہ محبت جس کے لیے وہ زندگی ہارنے کو تیار بیٹھی تھی اب اُس سے انحراف اس کی زندگی کی فتح بن چکا تھا۔ جذبات کی یہ تبدیلی اُس کے لیے حیران کن ضرور تھی لیکن ناقابلِ قبول ہرگز نہیں۔

ولید کا پیغام آیا تھا۔

''اگر تم نے مجھ سے بات نہ کی تو میں ابھی تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا میں بزدل نہیں ہوں...... میں نے تم سے سچی محبت کی ہے۔'' پیغام پڑھتے ہی ثناء بری طرح گھبرا گئی۔ لیکن وہ کسی بھی قیمت پر اس وقت ولید سے بات کرنے کو تیار نہ تھی۔ عیشاء کا حال دیکھ کر اُس کی ساری محبت دم توڑ چکی تھی۔

☆......☆......☆

تائی اماں اُسے مار مار ہانپ چکی تھیں۔ مگر وہ نہیں کیسے اُس کا اتا پتا بتاتی جسے وہ خود نہیں جانتی تھی اور ثناء کا نام سننے کو وہ تیار نہیں تھیں۔ کوئی تو اُس کی بات سنتا...... اُس پر یقین کرتا...... مگر یہاں تو سارے چاہنے والے دشمن ہوچکے تھے۔ یاسر نے اس پورے وقت میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا تھا مگر اس کی آنکھیں تھیں کہ عیشاء پر سراسر الزام تراشیاں کررہی تھیں۔

ابا کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے وہ سارے رنگ تھے جو غلیظ ترین چیز کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

وہ کس کس بات کو روتی؟
ثناء کی دھوکے بازی کو؟
یاسر کے خاموش الزامات کو؟
یا ماں باپ کی نفرت کو؟
سب متنفر تھے سب کو یقین تھا کہ وہ قصوروار ہے
کون تھا جو اُس کے کردار کی گواہی دیتا؟
اُس کے گفتار پر یقین کرتا۔
اور اس کے ساتھ کھڑا ہوتا۔

کوئی بھی نہیں...... ایک بھی نہیں......
ایک بھی نہیں...... وہ اُس 'ایک' کو کیسے بھول گئی۔ وہ جو یکتا تھا...... مایوسی اور ناامیدی کے گھٹا گھوپ اندھیرے میں امید کی کرن روشن ہوئی تھی۔ یقیناً وہ اُس کا سب سے بڑا گواہ تھا۔
جو سب سچ جانتا تھا۔
''کیسی ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہوئی تھی اس پر...... وہ وہیں زمین پر پڑے پڑے سجدے کی حالت میں چلی گئی۔
''اس سے کہو یہ ناٹک ختم کرے...... ورنہ ابھی کسی راہ چلتے کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھما کر نکال دیں گے۔'' تایا ابا کی دھمکی نے اُسے سرتاپا دہلا دیا۔
''نام بتا دے بدبخت...... اور کتنا ذلیل کروائے گی ہمیں......'' ابا کی درشت مگر گلوگیر آواز اس کے دل کو ریزہ ریزہ کر گئی تھی۔ شاید باہر کی ڈور بیل بجی تھی۔ یاسر لہو رنگ آنکھیں اُس پر جماتا ہوا باہر گیا تھا۔
''اِسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ یہ دن دکھایا تو نے ہمیں لڑکی...... تجھے ہمارا ذرا خیال نہ آیا۔'' اماں اُسے جھنجھوڑ رہی تھیں اور اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔ اُس کے جھکے ہوئے سر نے دوسے زیادہ قدموں کو اندر آتے دیکھا تھا اُس نے بے چارگی سے سر اٹھایا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں، سنجیدہ بردباری اور عین اُن کے پیچھے وہی تھا جو اس سارے واقعے کا ذمہ دار تھا۔ عیشاء کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت لیکن ولید کی آنکھوں میں استعجاب تھا وہ تحیر سے زمین پر بے بسی کی تصویر بن کے بیٹھی عیشاء کو دیکھ رہا تھا۔
ثناء نے ولید کو آتا دیکھ لیا تھا۔ اُس کے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ سارے ثبوت عیشاء کے خلاف تھے ثناء کو کسی نے وہاں نہیں دیکھا تھا۔ اُس لیے اس محبت سے مُکر جانا ہی بہتر تھا اپنے باپ اور بھائی کے تیور وہ دیکھ چکی تھی ایسے میں ولید کی محبت پر ثابت قدم رہنا کم از کم اس کے لیے ممکن نہیں تھا اُس نے بہت سوچا...... اور فیصلہ کر لیا کہ وہ ولید کو جانتی تک نہیں ہے۔

☆......☆......☆

ولید کے آتے ہی تایا ابا نے اُسے زمین سے ہاتھ کھینچ کر یوں کَٹرا کر کے دور ہوئے تھے جیسے کیچڑ سے پیر نکالا ہو۔
''اسی لڑکی کی خاطر آئے ہو نا تم...... بیٹھو اور ابھی نکاح کی تاریخ طے کرو۔'' تایا ابا ولید سے مخاطب تھے جو شش و پنج میں گرفتار غالباً بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
لیکن میں اِس سے شادی کیوں کروں؟'' ولید کے چہرے پر حیرانگی تھی۔
''اسی سے تعلق جوڑا تھا ناں...... چھت پر آدھی رات کو اسی سے ملنے آئے تھے؟'' تایا ابا اُسے یاد دلانے کی کوشش میں زچ ہو کر بھڑک گئے تھے۔
''ہرگز نہیں...... میں نے تو کل رات سے پہلے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں تو ثناء سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ولید کے الفاظ تھے یا بم کا گولہ جس نے سب کی سوچ کے چیتھڑے اڑا دیے۔
''اے...... نامراد...... خبردار جو میری بیٹی کا نام بھی لیا۔ اپنی معشوقہ کو بچانے کے لیے تجھے میری ہی بیٹی نظر آئی تھی۔'' تائی اماں غصے میں کف اڑاتے ہوئے چنگھاڑی تھیں۔
خاتون حیرانگی سے کبھی ولید کو تو کبھی تائی اماں کو دیکھ رہی تھیں۔
''ولید...... بیٹا یہ سب کیا ہے؟'' اُس سے رہا نہ گیا۔
''دیکھیں بہن...... میں مانتی ہوں کہ میرے

بیٹے نے بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن وہ اپنی نادانی پر شرمندہ ہے اور اسی لیے مجھے یہاں لے کر آیا ہے ہم آپ سے معافی مانگتے ہیں اور...... چاہتے ہیں کہ بچوں کو اُن کی خوشیاں دے دی جائیں۔ میرا بیٹا آپ کی بیٹی ثناء کو پسند کرتا ہے اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''ارے ارے...... کیا تم لوگوں نے ثناء ثناء لگا رکھا ہے اُس کا نام ثناء نہیں عیشاء ہے تائی اماں نے عیشاء کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔

''آنٹی...... آپ ثناء کو بلائیں...... آپ کو سب یقین آجائے گا۔'' ولید نے تحمل سے کہا تھا۔

''تمہاری سمجھ میں بات نہیں آتی...... زبان کاٹ کے ہاتھ میں رکھ دوں گا اگر میری بہن کا نام بھی لیا تو......'' یاسر تلملا کر ولید پر جھپٹا تھا۔ تایا ابا نے فوراً اُسے کھینچ کر پیچھے کیا۔

''ہم اس لڑکی کو اب یہاں نہیں رکھنا چاہتے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ فضول کے ڈرامے ختم کرو اور اِس سے نکاح کر کے یہاں سے لے جاؤ۔ اب کے تایا ابا نے بھی ضبط سے کام لیا تھا شاید یہ ثناء کا نام آجانے کا نتیجہ تھا۔

''خدا کے واسطے انکل...... آپ ایک بار ثناء کو بلا دیں۔'' ولید بڑی لجاجت سے بولا تھا۔

''ٹھیک ہے اس کا یہ شوق بھی پورا کر دیتا ہوں...... لیکن یاد رکھنا اگر میری بہن نے تجھے پہچاننے سے انکار کیا تو پھر یہاں سے اپنے قدموں سے چل کر نہیں جائے گا۔ یاسر انگلی اٹھا کر بولا تھا اور غصے میں کمرے سے باہر نکل گیا چند لمحوں بعد ہی وہ ثناء کا ہاتھ تھامے دوبارہ آیا تھا۔

''ثناء...... پلیز اِن لوگوں کی غلط فہمی دور کرو۔ میں اپنی امی کو لے کر آیا ہوں۔'' ولید سرعت سے کھڑا ہوا تھا۔ تائی اماں نے ولید کو پیچھے سے کھینچا۔

''دور ہو کے بات کر......''

''ثناء...... تم جانتی ہو اِسے؟'' تایا ابا کا لہجہ قہر آلود تھا۔ ثناء نے نفی میں گردن ہلانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اور عیشاء کو لگا اس کی زندگی تمام ہو گئی اُس نے بے بسی سے ثناء کو دیکھا تھا جو گردن ہلا ہلا کے کہہ رہی تھی میں اسے نہیں جانتی۔

عیشاء کے قدموں سے جان نکل چکی تھی وہ دھڑام سے زمین پر آ گری ولید نے ایک نظر ثناء کو اور پھر عیشاء کو دیکھا اور اپنی ماں سے بولا۔

''چلیں امی...... اب یہاں رُکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''اِسے بھی لے کر جاؤ یہاں سے......'' تائی اماں دھاڑ کر بولیں۔

''بھابی...... وہ میری بیٹی کے لیے نہیں آیا تھا......'' یاسمین سے اب اور برداشت نہ ہوا بیٹی کی حالت دیکھ کر اُن کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ وہ بے قصور ہے۔

''بس کرو بی بی...... یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ آج اگر بیٹی کو لگام ڈال کر رکھتیں تو یہ گل نہ کھلاتی۔ میں سب سمجھتی ہوں تم دونوں ماں بیٹیاں اور یہ لڑکا ملے ہوئے ہو اور میری بیٹی کو پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن اب تمہاری کوئی چال نہیں چلے گی۔ چل بھئی قاضی کو لا نکاح پڑھوا اور لے کے جا اسے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر ولید سے مخاطب تھیں۔

''میں یہاں سے لے کے تو کسی کو نہیں جاؤں گا۔ البتہ کچھ واپس کرنا ہے آپ کی بیٹی کو......'' ولید اب دانت کچکچا کے بولا تھا۔ ثناء کی بے وفائی نے اس کے دل پر چوٹ لگائی تھی۔

اتنا کہہ کر اس نے جیب سے ایک گھڑی کی ڈبیا نکالی اور میز پر ڈال کر بولا۔

''جب مجھے جانتی ہی نہیں ہو تو پھر تمہارا دیا ہوا

تحفہ میں کیوں رکھوں؟'' اتنا کہہ کر وہ اپنی ماں سمیت گھر سے چلا گیا۔

تایا ابا' یاسر اور تائی اماں نے جھٹکے سے اس ڈبے کو پہچانا تھا۔ یہ وہ ہی گھڑی تھی جو یاسر کے دوست نے دی تھی اور جو کھو چکی تھی۔ جس کے ڈبے کے بارے میں ثناء نے کہا تھا کہ وہ پھینک چکی ہے۔

یاسر نے غضبناک نظروں سے ثناء کو دیکھا جو سچ سامنے آ جانے پر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور عیشاء اس گواہی پر حیران تھی جو اللہ کی طرف سے آئی تھی۔ عیشاء کے ماں باپ سکتے کی کیفیت میں تھے۔ اچانک تایا ابا اٹھے اور ثناء پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

''اب بتا سچ کیا ہے......'' اور پھر ثناء نے روتے روتے سارا سچ سب کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ کبھی عیشاء کو پکارتی تو کبھی اپنے اماں ابا کو...... اور تائی اماں اچانک بازی پلٹ جانے پر صوفے پر ڈھے سی گئی تھیں۔ اُن کا چہرہ تاریک اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''آپ کی لگام کیسی کچی نکلی بھابی...... بیٹی کو گرفت بھی نہ کر سکی۔'' اب بولنے کی باری یاسمین کی تھی۔

''آپ نے سنا......؟ میری بیٹی نے آپ کی بیٹی کو روکا تھا۔ منع کیا تھا اُس نے...... وہ عزت سنبھالنے کے لیے اس کے ساتھ چھت پر گئی تھی۔ تاکہ آپ کی بیٹی کو رسوائیاں نہ ملیں...... مگر آپ نے میری بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' وہ بولتے بولتے رو پڑیں۔

''کیا کچھ نہیں کہا آپ نے میری بیٹی کو...... آوارہ، بے لگام، فتنہ...... اب اگر یہی سب میں ثناء کے لیے کہوں تو کیسا لگے گا آپ کو......؟ بیٹیاں تو سانجھی ہوتی ہیں بھابی...... میری بیٹی کی بدنامی کیا آپ کی بدنامی نہ ہوتی۔''

عیشاء نے سسکیاں بھرتی ماں کو تھام لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے مگر لب خاموش تھے۔

عیشاء کے ابا نے بیٹی کو نم آنکھوں سے دیکھا اور بیوی اور بیٹی کو بازوؤں کے گھیرے میں لیے وہاں سے نکل ہی رہے تھے کہ تائی اماں راستے میں ہاتھ جوڑے کھڑی ہو گئیں۔

''مجھے معاف کر دو...... میرے کیے کی سزا مجھے مل چکی ہے۔''

''ابھی تو ایک سزا اور باقی ہے۔ میرا بیٹا اس سارے واقعے میں جس اذیت سے گزرا ہے مجھے نہیں لگتا کہ وہ مجھے معاف کرے گا۔'' عیشاء نے چونک کر اُن کی بات سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں نہیں چاہتی تھی کہ عیشاء میرے گھر میں بہو بن کر آئے...... اپنے بیٹے کی آنکھوں میں عیشاء کا خواب میں پڑھ چکی تھی۔ اسی لیے میں...... ہر وقت عیشاء کو برا بھلا کہتی تھی...... کہ شاید اس طرح یاسر عیشاء کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے مگر...... بہتے ہوئے پانی پر بند باندھنا آسان نہیں ہوتا...... مجھے لگا قدرت نے مجھے عیشاء سے چھٹکارے کا موقع فراہم کر دیا ہے یہ نہیں پتہ تھا کہ عیشاء پر پھینکی گئی کالک میرے اپنے چہرے کو کالا کر دے گی۔''

''مجھے میرے کیے کی سزا مل چکی ہے یاسمین اب تم میرے بیٹے کو سزا نہ دینا...... میں تمہارے آگے جھولی پھیلاتی ہوں...... مجھے نامراد مت لوٹانا...... تمہاری ہاں ہی اب مجھے اس پچھتاوے کے عذاب سے نکال سکتی ہے۔ عیشاء نے گھبرا کر یاسر کی طرف دیکھا جو شاید ضبط کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا اُس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ عیشاء نے گھبرا کر نظر پھیر لی کہ ابھی خوشیوں پر فوراً اعتبار کرنا ذرا مشکل تھا۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

مہتاب خان

محبتوں کی راہ گذر

"ویسے آپ اتنے برے نہیں جتنا میں آپ کو سمجھتی تھی۔" "شکر ہے کہ آپ کی رائے میرے بارے میں اچھی ہوئی۔" "پتا ہے جب دادا جان نے پورشن کرائے پر دیا تھا تو میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے کہ پتا نہیں کون ہے؟ کیسا ہے؟ ہمیں کسی انجان......

دادا جان یوں تو گھر سے بہت کم ہی باہر جاتے تھے مگر اس روز مرزا صاحب نے انہیں بطورِ خاص فون کر کے بلایا تھا۔ آخر کیوں نہ بلاتے موقع تھا اُن کی پوتی رمشہ کے رشتے کے طے کیے جانے کا اور دادا مرزا صاحب کے دیرینہ دوست تھے لنگوٹیے یار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور اتفاق سے اس دن مہرمہ بھی چھٹی لے کر چلی گئی تھی اس کے کوئی رشتے دار گاؤں سے آئے ہوئے تھے۔ یوں علیزہ گھر میں اکیلی تھی۔ ہاں ایک اطمینان اسے تھا کہ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔

دادا کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تو ٹی وی دیکھتی رہی پھر جب بوریت شروع ہوئی تو وہ ٹی وی بند کر کے اُٹھ گئی۔ اچانک ایک زوردار آواز سے وہ چونک گئی۔ یہ بادل کے گرجنے کی آواز تھی اس نے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکا تو دیکھا موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی۔

ابھی شام کے پانچ ہی بجے تھے مگر بارش کی وجہ سے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی وہ کچن میں چلی آئی پھر سوچا کہ کیوں نہ پکوڑے بھی بنا لیے جائیں۔ اس نے جلدی جلدی پکوڑے تلے اچانک اسے دادا جان کی ہدایت یاد آ گئی کہ کچھ بنایا کرو تو سرمد کو ضرور بھیج دیا کرو پتا نہیں بے چارا کیا کھاتا پیتا ہوگا۔ اکیلا رہتا ہے ہوٹل کا کھانا کھا کر اُکتا جاتا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے فریزر سے فریز کیے ہوئے سموسے اور شامی کباب بھی نکال کر فرائی کر لیے۔ چائے وہ پہلے ہی بنانے کے لیے رکھ چکی تھی۔

تمام چیزیں قرینے سے ٹرے میں سجا کر ٹرے کور کر کے اس نے اپنے لباس کی شکنیں درست کیں اور باہر نکل آئی۔ باہر گھن گرج کے ساتھ بارش جاری تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اپنے گھر کے اس پورشن میں آ گئی جو دادا نے سرمد کو کرائے پر دیا ہوا تھا۔

وہ پورا پورشن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

"سرمد نے لائٹس آن کیوں نہیں کیں۔ شاید وہ گھر پر نہیں ہے۔" یہ سوچ کر وہ واپسی کے لیے

پلٹنے ہی والی تھی کہ اس کے کمرے سے آتی مدھم روشنی دیکھ کر وہ اس کے کمرے کی طرف آ ئی کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا تمام لائٹس آف تھیں صرف بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا لیمپ روشن تھا اور سرمد بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دروازے کی طرف اُس کی پشت تھی وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

اس کی آواز سن کر علیزہ کا دستک دیتا ہاتھ بے ساختہ رُک گیا۔

''یار خرم تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مجھے کتنی بڑی کامیابی ملی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں ملک الموت بن کر اس کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ جب چاہوں گا اس خبیث کی گردن مروڑ دوں گا۔ کچھ دیر سرمد دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر گویا ہوا۔

''نہیں یار کسی اور کے ہاتھوں اسے قتل کروانے میں مجھے وہ خوشی نہیں ملے گی جو اپنے ہاتھوں اسے تڑپا تڑپا کر مارنے میں ملے گی۔ میرا انتقام اسی وقت پورا ہوگا جب وہ میرے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچے گا۔

پھر کچھ دیر وہ خرم کی بات سنتا رہا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔

''نہیں یار تم بے فکر رہو مجھے کوئی خطرہ نہیں میرا پورا منصوبہ بے داغ ہے۔ اسی لیے میں ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔ اس کے گھر کے پاس ہی مجھے ایک گھر کرائے پر مل گیا ہے۔ ایک بے وقوف سے بڑے میاں ہیں اور اُن کی ایک پوتی ہے۔ اس نے کچھ ہوشیار بننے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اُسے بھی شیشے میں اُتار لیا ہے۔ مجھ پر کوئی شک نہیں کرے گا بس میں اُس کا کام تمام کرتے ہی یہاں سے رفو چکر ہو جاؤں گا۔''

اتنی خوفناک باتیں سن کر اور سرمد کا یہ سفاک روپ دیکھ کر علیزہ سرتا پا کانپنے لگی۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک چھناکے کے ساتھ زمین پر گر پڑی۔ سرمد نے ایک دم گردن موڑی وہ تیزی سے مڑی مگر ایک قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ سرمد اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پیچھے سے علیزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر گھسیٹا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی تھی۔ بارش اور بادلوں کی گھن گرج میں اس کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔

وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتا ہوا گھسیٹ کر کمرے میں لے آیا تھا کمرے میں لا کر اس نے ایک زوردار جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی۔ اسے اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ سرمد نے دروازہ لاک کر کے کھڑکی بھی بند کر دی۔ اسے کھڑکی اور دروازے لاک کرتے دیکھ کر وہ جلدی سے سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔

اپنی طرف قدم بڑھاتے دیکھ کر اس کا دل خوف سے بند ہونے لگا۔ یہ وہ سرمد تو نہیں تھا جو نرم اور شیریں لہجے میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ جس کی آنکھوں میں اس کے لیے پیار ہوا کرتا تھا۔ یہ تو کوئی اور شخص تھا۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری...... اس کی آنکھوں میں تو اس وقت شعلے سے لپک رہے تھے۔ اُس کا یہ سفاک روپ علیزہ نے پہلی بار دیکھا تھا وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ بے اختیار پیچھے کی طرف کھسکنے لگی۔

''سرمد پلیز مجھے جانے دیں۔'' اس کی کمر دیوار سے ٹکرائی تھی۔ وہ خود کو اس سے بچانے کے لیے مزید پیچھے نہیں جا سکتی تھی۔ وہ ایک ایک قدم بڑھاتا اس کے بہت قریب اس کے عین سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

''کیا سنا ہے تم نے؟'' سرمد کا سفاک لہجہ اس

کی جان نکال رہا تھا۔
''کک...... کچھ نہیں سنا میں نے مجھے جانے دیں۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''اسے قتل کرنے کے ساتھ ساتھ میں تمہیں بھی قتل کرسکتا ہوں۔ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔'' وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر غرایا۔ اس کے ہاتھوں کی آہنی گرفت سے علیزہ کے جسم میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی تھی۔
اسے ایسا لگا جیسے وہ اسے ابھی قتل کردے گا۔ علیزہ نے زور سے چلانے کے لیے منہ کھولا مگر وہ اس کا ارادہ پہلے ہی بھانپ چکا تھا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ چکا تھا۔ وہ بری طرح مچلی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس ہاتھا پائی میں اس کا دوپٹہ سرمد کے قدموں میں گر پڑا۔
سرمد نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور بولا۔
''اگر اب چلانے کی کوشش کی تو گلا دبا دوں گا۔'' علیزہ جیسی پھول سی نازک لڑکی کو کانٹوں پر گھسیٹا جارہا تھا۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔
''سنو اس وقت تو میں تمہیں جانے دے رہا ہوں مگر کان کھول کر سن لو اگر تم نے کسی کو بھی اس بارے میں بتایا تو میں تمہاری اور تمہارے دادا جان کی جان لے لوں گا۔ میں تم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا کام ختم کرکے چپ چاپ یہاں سے رخصت ہوجانا چاہتا تھا۔ لیکن تم نے میرا سارا کھیل بگاڑ دیا ہے۔ اگر تم نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں تمہیں ختم کردوں گا جاؤ اب۔'' وہ دہاڑا۔
وہ ساری تکلیفیں بھلا کے دیوانہ وار بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ سرمد کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازے کا لاک کھول کر وہ اندھادھند باہر بھاگی۔
گھر آکر وہ لاؤنج میں صوفے پر سر تھامے بیٹھی تھی۔ پورے گھر میں سناٹا طاری تھا۔ دادا شاید ابھی تک نہیں آئے تھے۔ سرمد سے وابستہ کئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔

☆......☆......☆

''آج کل کسی کا کوئی بھروسہ ہے دادا...... ایسے کسی پر آنکھیں بند کرکے اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ ایک سے ایک مکار اور چالباز لوگ دنیا میں پڑے ہیں۔ پتہ نہیں کون ہے یہ کہاں سے آیا ہے؟ آپ سب کو اپنے جیسا سیدھا، سچا اور مخلص سمجھتے ہیں، پتہ نہیں اس کے کیا ارادے ہیں کیا پتہ ہمیں اکیلا سمجھ کر بری نیت سے آیا ہو۔'' وہ دادا کے سامنے بیٹھی پُرتشویش انداز میں بولے جارہی تھی۔
''ہم اکیلے کہاں ہیں ہم دو ہیں اور وہ ایک ہے۔'' دادا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اور پھر تم ہی نے تو کہا تھا دادا جان جلدی کرائے دار ڈھونڈیں خالی گھر عجیب سا لگ رہا ہے۔''
''ہاں تو میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ کسی بالکل انجان اور اکیلے آدمی کو کرائے پر دے دیں۔ ہم کسی جان پہچان والی فیملی کو کرائے پر دے سکتے تھے۔''
''وہ بااخلاق، پڑھا لکھا اور اچھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اس عمر میں اگر میں اس قابل نہیں کہ لوگوں کو پرکھ سکوں تو سوائے افسوس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔''
''اس نے میٹھی میٹھی باتیں کی ہوں گی اور آپ پگھل گئے ہوں گے۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔
''اسے کوئی مجبوری نہیں جو مجھ سے میٹھی میٹھی

باتیں کرتا۔ لاہور کا ایک بڑا بزنس مین ہے اور اب یہاں کراچی میں اپنے بزنس کو بڑھا رہا ہے۔ اس کے لیے دفتر وغیرہ دیکھنے آیا ہے۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولے۔

''میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔ میں اسٹیٹ ایجنٹ سے کرائے دار کے لیے کہنے گیا تھا وہاں سرمد سے ملاقات ہوئی جسے کرائے کے لیے ایک دو ماہ کے لیے گھر چاہیے تھا۔ اس نے مجھ سے یہاں رہنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ میں نے ہی اُسے آفر کی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔''

''آپ کے کام آپ جانیں مجھے تو یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''تم فضول باتیں سوچ رہی ہو علیزے...... وہ یہاں مہمان بھی ہے کراچی میں اُس کا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں ہے۔ پھر مہینے دو مہینے کی تو بات ہے۔ وہ بہت ویل مینرڈ اور خاصا امیر ہے۔ اسے نہ تو ہم سے کوئی لالچ ہے نا دشمنی۔ تم نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ اس لیے اس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہی ہو۔''

دادا کے سمجھانے پر وہ خاموش تو ہوگئی تھی مگر اس کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔ یہاں ان دونوں کے علاوہ صرف دو ملازمین تھے جو بابا کے زمانے کے اور بہت قابلِ بھروسہ تھے۔ بابا نے بڑے دل سے یہ کوٹھی بنوائی تھی اور اس میں ایک الگ پورشن بھی بنوایا تھا کیونکہ بابا کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا اور وہ بڑے دوست نواز تھے اپنے شہر کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی ان کے کئی دوست رہا کرتے تھے۔ وہ جب بھی کراچی آتے اُن کا قیام ان کے گھر کے اسی پورشن میں ہوا کرتا تھا۔

علیزہ کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ یوں وہ دادا اور بابا کے پُرشفقت سائے میں پروان چڑھتی رہی۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا ابھی وہ میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ ایک دن اچانک بابا کو سیریس ہارٹ اٹیک ہوگیا اور اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں ہی اُن کا انتقال ہوگیا تھا۔

جوان بیٹے کی اچانک موت سے علیزہ کے دادا واحدی صاحب کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ لیکن جب انہوں نے علیزہ کو تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے اور بے حال ہوتے ہوئے دیکھا تو خود کو سنبھالا۔ اس عمر میں اُن پر دہری ذمہ داری پڑ گئی تھی۔ ایک اس گھر کو چلانے کی اور دوسری علیزہ کی پرورش کی۔ انہوں نے ہمت سے کام لیا اور اب تک تمام معاملات انہوں نے اللہ کے حکم سے خوش اسلوبی سے سنبھال لیے تھے۔

گریجویشن کے بعد علیزہ نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب وہ دادا کے ساتھ گھر پر ہی ہوتی تھی۔ ڈپازٹ کی رقم اور پورشن سے آنے والے کرائے سے اُن لوگوں کی گزر بسر بخوبی ہو رہی تھی۔ بس اب واحدی صاحب کو ایک ہی فکر تھی علیزہ کے ہاتھ پیلے کرنے کی۔

زندگی بڑی پُرسکون گزر رہی تھی کہ دادا جان نے وہ پورشن ایک اکیلے شخص کو جس کا تعلق اس شہر سے بھی نہیں تھا کرائے پر اٹھا دیا تھا گو وہ خود بھی کرائے داروں کے جانے کے بعد سے یہی چاہ رہی تھی مگر اس طرح نہیں۔

ان کا گھر کافی بڑا تھا جو ان دادا پوتی کی ضرورت سے بھی بہت زیادہ تھا۔ پورشن کی تو بات ہی کیا۔ یہ پورشن گھر سے الگ تھلگ حصے پر بنایا گیا تھا۔ بعد میں کرائے پر دینے کے خیال سے کچھ تبدیلیاں دادا نے بھی کروائیں تھیں۔ تین

کمروں اٹیچڈ باتھ روم اور ایک کچن پر مشتمل یہ پورشن پوری طرح آراستہ تھا اور گھر سے جدا تھا بس مین گیٹ ہی مشترک تھا۔

الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے کرائے پر دینے کے لیے پرائیویسی وغیرہ کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے دادا کے ہر کسی پر جلدی اعتبار کر لینے کی عادت سے شدید اختلاف تھا۔ بہرحال جو بھی تھا اب تو وہ آ گیا تھا۔ اس کی ناپسندیدگی کے باوجود......

اگلے روز وہ ٹیبل پر دوپہر کا کھانا لگواتے ہوئے مہرو (ملازمہ) سے بولی۔

''دادا جان کو بلا لاؤ۔''

''وہ تو کرائے دار کی طرف گئے ہیں۔ کافی دیر ہوگئی۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔ ابھی وہ مہرو سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دادا جان چھڑی ٹیکتے ہوئے بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے نظر آئے۔

''کیا دادا آپ بھی وہاں جا کر بیٹھ ہی گئے اتنی بھوک لگی ہے۔'' انہیں اندر آتا دیکھ کر علیزہ بولی۔

''گیا تو جلدی آنے کے لیے ہی تھا کہ چلو پوچھ آؤں اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ مگر اس نے بٹھا لیا تو باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں لگا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

علیزہ نے ان کی باتوں پر کوئی تبصرہ کیے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ دادا خود بہت اچھے اور مخلص ہیں اسی لیے وہ دنیا کو بھی مخلص اور ایماندار سمجھتے ہیں۔

رات کے کھانے پر دادا جان نے مہرو کے ساتھ مل کر کھانے پر بڑا اہتمام کروایا تھا۔ وہ کرسی ڈالے کچن میں ہی بیٹھے رہے تھے اور بار بار مہرو کو ہدایت دے رہے تھے۔ وہ دادا کو یہ اہتمام کرتے خاموشی سے دیکھتی رہی اور ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ تمام چیزیں تیار ہوگئیں تو وہ بھی علیزہ کے پاس آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

''خیریت تو ہے دادا کیا کوئی خاص مہمان آ رہا ہے؟''

''ہاں......'' انہوں نے مختصر جواب دیا اور گھڑی کی طرف نظر دوڑائی۔

ٹی وی دیکھنے کے دوران بھی انہوں نے کئی دفعہ دروازے کی طرف اور کئی مرتبہ گھڑی کی طرف نظر دوڑائی تھی۔

''دادا جان آپ کے مہمان تو ابھی تک نہیں آئے دس بج گئے ہیں۔''

''ہاں مجھے بھی حیرت ہے وہ آیا کیوں نہیں؟'' اسے جواب دیتے ہوئے انہوں نے مہرو کو آواز دی۔

''جاؤ سرمد کو دیکھو جا کر...... اُن سے کہنا کھانے پر ہم لوگ اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔''

اُن کا پیغام سنتے ہی وہ چلی گئی۔

تقریباً دس منٹ بعد مہرو کی واپسی ہوئی تھی۔ اسے اکیلا آتے دیکھ کر دادا جان کو حیرت ہوئی تھی۔

''میں نے اتنی زور زور سے دروازہ پیٹا مگر انہوں نے دروازہ نہیں کھولا شاید وہ گھر پر نہیں ہیں تمام بتیاں بھی بند تھیں۔ ویسے گاڑی تو اُن کی کھڑی تھی شاید پیدل ہی کہیں گئے ہیں۔''

''تم نے چوکیدار سے پوچھا؟''

''نہیں! اُس سے تو نہیں پوچھا۔''

''بےوقوف......'' وہ جھنجلا کر بولے تھے۔

وہ ایک دم افسردہ سے ہوگئے تھے کتنے اہتمام سے انہوں نے تمام چیزیں تیار کروائیں

تھیں۔ اور وہ جو پہلے ہی دادا کو اُداس دیکھ کر اور مہرو کا جواب سن کر غصے میں آ گئی تھی۔

''آپ کو بڑا شوق ہے ہر ایرے غیرے کو انوائٹ کرنے کا...... ٹھیک ہے پورشن کرائے پر دیا ہے اب اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے کوئی رشتہ بھی استوار کر لیا جائے۔ سیدھا سادے ایک مالک مکان اور کرائے دار کے جیسے تعلقات رکھنے چاہیے تھے آپ کو، دیکھ لیا نا اپنے خلوص کا انجام، اس نے آنا تو درکنار معذرت کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔'' وہ نان اسٹاپ بولنے میں مصروف تھی اور دادا اُسے اشاروں میں پیچھے دیکھنے کو کہہ رہے تھے۔ لیکن وہ اپنی بات مکمل کر کے ہی چپ ہوئی تھی۔ جبکہ مہرو کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

''السلام علیکم!'' اپنے پیچھے سے ابھرتی ہوئی اس مردانہ آواز کو سن کر وہ بے ساختہ مڑی تھی۔

دادا اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے صوفے پر سے اٹھ گئے تھے اور اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام چکے تھے۔ مہرو آتے ہوئے دروازہ بند کر کے نہیں آئی تھی اور وہ کھلے ہوئے دروازے سے سیدھا اندر آ گیا تھا۔ دونوں نے اسے دیکھ لیا تھا مگر علیزہ اپنی پشت اس کی طرف ہونے کی وجہ سے اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔

''آئی ایم سوری آپ لوگوں کو میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی۔ پتہ نہیں کیسے اچانک آنکھ لگ گئی ۔ابھی دروازہ بجنے کی آواز سے ہی اٹھا ہوں۔'' وہ دادا جان سے مخاطب تھا۔

اور دادا جان کچھ دیر پہلے کی کوفت بھلا کر مسکرا رہے تھے۔

''کوئی بات نہیں بیٹا زحمت کیسی...... آؤ اب مزید دیر کیے بغیر کھانا کھا لیتے ہیں۔'' وہ پُر خلوص انداز میں اس سے کہہ رہے تھے۔ پھر کچھ خیال آنے پر وہ آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئے اور اس سے کہا۔

''ارے میں تم لوگوں کا تعارف کروانا تو بھول ہی گیا۔ یہ علیزہ ہے میری پوتی، گریجویشن کیا ہے اسی سال، اور علیزہ یہ سرمد صاحب ہیں۔ باقی اپنا تفصیلی تعارف یہ خود ہی کروائیں گے۔''

وہ جو اپنی کچھ دیر پہلے کی باتوں پر شرمندہ تھی سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکی۔ لیکن اپنی اس حرکت پر اسے بعد میں دادا جان سے ایک طویل لیکچر سننا پڑا تھا۔

وہ نہ تو بدتمیز تھی نہ منہ پھٹ مگر اس شخص پر وہ اپنا کچھ ایسا ہی ایمپریشن ڈال چکی تھی۔ کھانے کی میز پر دادا جان اور سرمد ہی باتیں کر رہے تھے جبکہ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ چپکے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے مطمئن انداز میں دادا جان سے باتیں کرتا نظر آیا تھا۔ ایسا لگ تو نہیں رہا تھا کہ اس نے کوئی بات مائنڈ کی ہے۔ شاید اسے اپنے چہرے کے تاثرات دوسروں سے چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کے ساتھ مزید بیٹھنا اور باتیں کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر دادا جان نے اسے ایک طویل لیکچر دے ڈالا تھا۔ وہ اسے اخلاقیات کا سبق پڑھا رہے تھے۔ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں سے شروع ہوتا یہ لیکچر بابا کی ملنساری اور مہمان نوازی پر ختم ہوا تھا۔ اس نے بڑے صبر سے اُن کی باتیں سنی تھیں۔

رات وہ ساری کھڑکیاں دروازے چیک

کرتی رہی کہ ٹھیک سے بند ہیں پھر بیرونی گیٹ دیکھنے کے لیے باہر نکل آئی۔ بابا کی وفات کے بعد وہ بہت ڈرپوک اور عدم تحفظ کا شکار ہوگئی تھی۔ وہ بیرونی گیٹ دیکھ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر پورشن کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں لائٹس روشن تھیں اور وہ باہر ستون سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا وہ نہ جانے کن سوچوں میں غرق تھا وہ مسلسل ایک ہی زاویے سے کھڑا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اور اپنے گردوپیش سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ اس نے علیزہ کو نہیں دیکھا تھا۔ کل تو شرمندگی میں وہ اسے سرسری طور پر ہی دیکھ سکی تھی آج جو بغور اسے دیکھا تو احساس ہوا وہ خاصا خوش شکل اور ہینڈسم تھا۔

سرمد کی شخصیت میں سب سے خاص چیز اُس کی آنکھیں تھیں۔ کل کھانے کی میز پر جب ایک لمحے کے لیے ان کی نظریں ٹکرائی تھیں تو اس نے سوچا تھا کہ اس کی شہد رنگ والی آنکھیں کس قدر منفرد اور مقناطیسی کشش رکھتی ہیں۔ اسے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا اسرار چھپا نظر آیا تھا۔

صبح کا وقت ان کے گھر کا سب سے اچھا وقت ہوا کرتا تھا وہ اور دادا صبح جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کر باہر لان میں چہل قدمی کرتی۔ اپنے لگائے ہوئے پھولوں اور پودوں کا جائزہ لیتی اتنی دیر میں اخبار آ جاتا تھا وہ وہیں بیٹھ کر تازہ ہوا میں اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑاتی اور پھر اندر آ جاتی تھی جبکہ دادا جان نماز سے فارغ ہوکر دیر تک خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

اس دن بھی وہ سرسبز گھاس پر چہل قدمی کرتی وہ خود کو بڑا فریش محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنے لگائے ہوئے پودوں کا جائزہ لینے اس پورشن کی طرف آ گئی تھی۔ پورشن کے سامنے کے اس حصے میں اس نے پھولوں اور سبزیوں کے پودے لگائے ہوئے تھے۔ وہ وہاں بیٹھی اپنے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر نہال ہو رہی تھی کہ کسی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”لگتا ہے گارڈننگ سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے؟“

وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا بول رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر بری طرح چونکی اس کے چونکنے پر وہ بولا۔

”آپ شاید ڈر گئیں؟“

”نہیں ڈری تو نہیں لیکن میں سوچ رہی تھی آپ ابھی سو رہے ہوں گے، اسی لیے آپ کی آواز سن کر چونک گئی تھی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”واہ امرود......“ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی باسکٹ کو دیکھ کر بولا۔ جس میں اس نے کچھ دیر قبل ہی پکے ہوئے امرود توڑ کر رکھے تھے۔

”جی ہاں تازہ پھلوں کا مزہ ہی الگ ہوتا ہے۔“

”دیکھیں ذرا اس کا ذائقہ کتنا مختلف ہے۔“ وہ اس سے پوچھے بغیر ٹوکری میں سے ایک امرود اُٹھا کر کھانے لگا۔

”آپ کا جب دل چاہے، تازہ پھل توڑ کر کھا سکتے ہیں مجھے ہرگز کوئی اعتراض نہیں۔“ کہتی ہوئی وہ تیزی سے مڑی تھی۔

اس دن مرزا صاحب اپنی پوتی رمشہ کو لے کر ان کے گھر آئے تھے۔ مرزا صاحب اور دادا جان تو اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے جبکہ وہ رمشہ کو لے کر باہر لان میں آ گئی تھی ارادہ تھا کہ چائے وہ لوگ باہر لان میں ہی پئیں گے۔ کچھ دیر پہلے مہرو چائے و دیگر لوازمات اُن کے سامنے رکھ گئی تھی۔

''کون ہے یہ اسمارٹ بندہ؟'' اس نے رمشہ کی نظروں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں تو اسی مخصوص ستون سے ٹیک لگائے اس نے سرمد کو دیکھا۔ اس نے بھی ٹھیک اسی لمحے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔

سرمد نے اسے دیکھ لیا تھا مگر نہ تو وہ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرایا تھا نہ اور کوئی تاثر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑے ناقابل فہم قسم کے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں اجنبیت لیے اس نے علیزہ کو دیکھا تھا۔

''گڈ لکنگ ہونے کے ساتھ ساتھ پراؤڈ بھی لگتا ہے۔'' رمشہ نے کہا تو اسے بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ کچھ دن گزرے تھے گھر کے کاموں میں لگ کر وہ وقتی طور پر اس کے رویے کو بھول گئی تھی۔ اس صبح وہ معمول کے مطابق واک کر رہی تھی جب اس نے سرمد کی آواز سنی تھی۔ اسے گیٹ سے داخل ہوتے وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی اور دیکھ کر بغیر کوئی تاثر دیے آگے بڑھ گئی تھی۔

''آپ روزانہ صبح اتنی ہی جلدی اٹھتی ہیں؟'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''جی......'' وہ مختصر جواب دے کر چپ ہو گئی۔ اس کا اس طرح اپنے ساتھ چلنے پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتا اس طرح اس کے ساتھ چل رہا تھا کہ جیسے یہ اس کا روز کا معمول ہو۔ علیزہ کا دل چاہا کہ وہ اسے کوئی سخت سا جملہ کہہ دے مگر خود پر ضبط کیے وہ چپ رہی پھر گیٹ کی طرف دیکھا جہاں اخبار پڑا تھا۔ وہ تیزی سے اخبار اٹھانے گئی اور یہ سوچتی ہوئی گھر کے اندر آ گئی۔ بڑا آیا۔ جب مرضی ہو گی بات کریں گے اور جب مرضی ہو گی اجنبی بن جائیں گے۔

دوسرے دن مہرو نے اسے سرمد کے آنے کا بتایا تو وہ اس کی آمد کی وجہ سوچتی ہوئی لاؤنج میں آ گئی تھی۔

''دادا جان تو گھر پر نہیں ہیں۔'' سلام ودعا کے بعد پہلی بات علیزہ نے یہی کی تھی۔

''کوئی بات نہیں آپ تو ہیں نا۔'' وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کو بیٹھتا دیکھ کر مجبوراً علیزہ کو بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھنا پڑا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ وہ یہاں آیا ہے تو آنے کی کوئی وجہ تو ہو گی اس نے سوچا۔

''فرمائیں کیسے آنا ہوا؟'' جب دو تین منٹ یونہی خاموشی سے گزر گئے تو وہ بالآخر تنگ آ کر بولی۔

''چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔ اس لیے سوچا کہ کیوں نا آپ کے ہاں بن بلایا مہمان بنا جائے۔'' وہ بڑے سکون سے بولا۔ نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کیے ہوئے وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کی بات سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ اس سے اس قسم کی بے تکلفی کی اسے بالکل توقع نہیں تھی۔

دروازے سے اندر داخل ہوتے دادا جان کو دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ اسے سمجھ نہیں پائی تھی۔ سرمد کو دیکھ کر دادا جان بڑے خوش ہوئے۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کو دوبارہ بلانے کے لیے دعوت دینی پڑے گی۔'' انہوں نے سرمد سے مصافحہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''علیزہ تم نے سرمد کی کچھ خاطر مدارت کی؟'' انہوں نے علیزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جی دادا جان میں مہرو سے چائے کا کہنے ہی والی تھی۔‘‘ وہ فوراً بولی۔

’’مہرو سے نہیں تم خود بنا کر لاؤ۔‘‘ انہوں نے اعتراض کیا۔

اُسے پتا تھا چائے کے ساتھ وہ دیگر لوازمات بھی چاہتے ہیں، اس لیے وہ بغیر کچھ کہے کچن میں آ گئی۔ مہرو کے ہاتھ چائے اور لوازمات بھیج کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

دوسرے دن صبح وہ حسب معمول واک کر رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے سرمد کو گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا وہ تیزی سے مڑی اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

’’سنیں......‘‘ اس نے آواز دی تو علیزہ کو رُکنا پڑا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً جاگنگ کرنے گیا تھا۔ ٹریک سوٹ میں اُس کا کسرتی جسم نمایاں تھا۔

’’آپ کچھ ناراض سی لگ رہی ہیں۔‘‘

’’جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘

’’اگر میری کسی بات پر خفا ہیں تو میں معافی چاہتا ہوں۔‘‘

’’میں نے کہا نا کوئی بات نہیں۔‘‘

’’اگر ایسی بات نہیں تو آئیں میرے ساتھ کافی پئیں۔‘‘

’’اس وقت میرا کافی پینے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔‘‘

’’پھر کولڈ ڈرنک پی لیں آئس کریم کھا لیں اس نے تجویز پیش کی۔‘‘ وہ اصرار کر رہا تھا۔

’’آپ مجھے بلانے پر اتنے بضد کیوں ہیں۔‘‘ اس نے تعجب سے کہا۔

’’اور آپ انکار پر اتنی بضد کیوں ہیں۔‘‘ وہ بغیر جواب دیے کندھے اچکاتی اس کے پورشن میں آ گئی۔

’’آئیں بیٹھیں۔‘‘ وہ اسے کمرے میں بٹھا کر باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ٹرے ٹیبل پر رکھ کر ایک کولڈ ڈرنک اسے پکڑائی اور دوسری خود لے کر بیٹھ گیا۔

’’لاہور میں آپ کہاں رہتے ہیں؟‘‘ کچھ دیر بعد علیزہ نے اس سے پوچھا۔

’’میں آپ کے دادا کو کرایہ ایڈوانس میں دے چکا ہوں۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ وہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائی تھی۔ جبکہ وہ چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں شرارت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

’’آپ اپنا انٹرویو جاری رکھیں۔‘‘ وہ شوخی سے بولا۔

’’آپ کا خیال ہے میں آپ کا انٹرویو لے رہی ہوں؟‘‘

’’مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ ابھی تو آپ کو بہت سے بنیادی سوال پوچھنے ہیں۔ مثلاً کہاں، کب اور کیوں پیدا ہوا، پسندیدہ رنگ پھول وغیرہ......‘‘ وہ اُسے چڑا رہا تھا۔

’’مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔‘‘ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی خالی کولڈ ڈرنک اس نے ٹرے میں رکھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

’’آپ ناراض ہو کر تو نہیں جا رہی نا......‘‘ وہ اس کے ساتھ دروازے تک آتے ہوئے بولا۔

’’آپ بہت عجیب ہیں پہلے الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں پھر معصوم بن کر پوچھتے ہیں کہ ناراض تو نہیں۔‘‘ وہ اس کے انداز پر ہنس پڑا۔

’’چلیں معاف کر دیں آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔‘‘ وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔

بڑا ہی عجیب بندہ ہے اپنے پورشن میں داخل ہوتے ہوئے علیزہ نے سوچا لیکن عجیب ہونے کے ساتھ منفرد بھی ہے، ذہین بھی ہے۔ دو تین دن گزرے تھے وہ اور دادا لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

''میں ذرا سرمد کی خیریت معلوم کر آؤں۔'' دادا نے کتاب پڑھتی علیزہ سے کہا۔

''کیوں انہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ بے خیالی سے بولی۔

''وہ کل سارا دن گھر پر رہا اور آج بھی صبح سے کہیں نہیں گیا، خدانخواستہ کہیں اس کی طبیعت خراب نہ ہو۔'' وہ فکرمندی سے بولے۔

''افوہ دادا آپ بھی حد کرتے ہیں وہ بھی کہے گا اچھے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ باہر نہیں گیا میری مرضی انہیں کیا تکلیف ہے؟''

''وہ اتنا بدتمیز نہیں ہے۔'' دادا خفگی سے کہتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ گئے۔ اور وہ کتاب پڑھتے پڑھتے صوفے پر ہی سو گئی۔ پھر اذان کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ دادا ابھی تک نہیں آئے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ چائے کا کپ لیے لاؤنج میں آ گئی۔ اسی وقت دادا اندر داخل ہوئے۔

''اچھا ہوا جو میں چلا گیا۔ بے چارہ شدید بیمار ہے۔'' اس کے استفسار پر وہ بولے۔

''صبح سے بھوکا پیاسا پڑا تھا۔ ایسا بھی ساتھ رہنے کا کیا فائدہ کہ بندہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام نہ آئے۔ میں نے مہرو سے چائے بنوا کر اسے پلوائی اور دوا کھلائی پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا رہا تا کہ اس کا دل بہل جائے۔'' وہ فکرمند لہجے میں بولے۔

پھر رات میں اس کے لیے سوپ وغیرہ تیار کروا کر ٹرے سجا کر علیزہ سے کہا۔

''اُسے کھانا دے آؤ اور اپنے سامنے کھلانا بیمار آدمی کا ویسے بھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہتا۔''

وہ ٹرے لے کر گئی اور دروازے پر دستک دی۔ وہ کچھ ہچکچا رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور علیزہ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''زہے نصیب آیئے تشریف لایئے۔'' اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے وہ شوخی سے بولا تھا۔

ٹرے اسے تھماتے ہوئے وہ بولی۔

''دادا جان بتا رہے تھے کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔''

''اتنا خاص بیمار تو نظر نہیں آ رہا۔ دادا جان تو خوامخواہ فکرمند ہو جاتے ہیں۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''جی بیمار ہوں ابھی بھی بخار ہے۔ آپ نے زحمت کی مہرو کے ہاتھ بھیج دیتیں۔''

''آپ کھانا کھائیں دادا جان کی خاص ہدایت ہے کہ اپنے سامنے آپ کو کھانا کھلاؤں۔''

''میں کھا لوں گا آپ بیٹھیں۔''

''نہیں میں چلتی ہوں۔'' وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑی۔

''ارے اتنی جلدی کیا ہے بیٹھیں نا۔'' وہ اصرار کرنے لگا۔ علیزہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے سر اُٹھا کر اپنے عین مقابل بیٹھے سرمد کو دیکھا تو وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھا۔

''کل تو مجھے بہت تیز بخار تھا۔'' وہ بولا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے کہ دادا جان کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر دونوں اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''بیٹا اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' دادا نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں انکل پہلے ہی میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی ہے۔ میں پہلے سے بہتر ہوں۔ بخار بھی کم ہوگیا ہے۔''

''تکلیف کیسی بیٹا تم یہاں اکیلے ہو گھر والوں سے دور ہو۔ کیا تمہارے گھر والے یہاں ہوتے تو تمہارا خیال نہیں رکھتے؟''

''آپ اتنی تکلیف نہ کیا کریں مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔''

''تکلف تو تم برت رہے ہو۔ اس گھر کو اپنا گھر ہی سمجھو۔''

☆......☆......☆

چند دن گزرے تھے۔ اس شام وہ رمشہ کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی۔ واپسی میں رمشہ جب اسے چھوڑنے گھر آئی تو علیزہ نے اسے چائے کے لیے روک لیا۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنستی ہوئی گیٹ سے اندر داخل ہوئیں تو دیکھا لان پر کرسیوں پر دادا جان اور سرمد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دادا اور سرمد سے سلام دعا کے بعد علیزہ رمشہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

''کیا ہینڈسم اور گڈ لکنگ بندہ ہے یار مجھے تو رشک آتا ہے تمہاری قسمت پر۔'' رمشہ بولی۔

''کیا بکواس ہے۔''

''ویسے سچ سچ بتاؤ کیا چکر ہے تمہارے دادا جان بھی ہر وقت سرمد سرمد کرتے نظر آتے ہیں۔ اور تمہارا چہرہ بھی اسے دیکھ کر لال گلال ہوجاتا ہے۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''رمشہ تم پٹو گی مجھ سے۔''

''ویسے ایسا کچھ ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے تو وہ بندہ بہت ہی اچھا لگا۔'' وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔

''بہت بے ہودہ ہوگئی ہو۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ہر بات میں کوئی نہ کوئی چکر نظر آتا ہے بیوقوف۔'' رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو رمشہ کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ سرمد کا خیال اپنے ذہن سے جھٹکنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ اس کے حواسوں پر چھاتا جارہا تھا۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ اتوار کو ناشتے پر وہ خاص اہتمام کرتی تھی۔ حلوہ پوری کے ساتھ آلو کی ترکاری اور بھنا ہوا قیمہ بنایا تھا۔

''بھئی بڑی اشتہا انگیز خوشبو آرہی ہے۔ علیزہ جاؤ سرمد کو بلا لاؤ ناشتہ ساتھ کریں گے۔''

''ہوسکتا ہے وہ ناشتہ کر چکے ہوں۔''

''تم کہہ کر تو آؤ اگر کر چکا ہوگا تو کوئی بات نہیں۔'' اُن کا جواب سن کر وہ باہر نکل گئی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

''آپ نے ناشتہ کرلیا یا ابھی کریں گے؟'' سلام دعا کے بعد اس نے فوراً پوچھا۔

''آپ اندر تو آئیں۔'' وہ دروازے کے سامنے سے ہٹتا ہوا بولا۔

''نہیں میں بیٹھنے نہیں آئی دادا جان نے کہا ہے کہ اگر آپ نے ناشتہ نہیں کیا تو آجائیں حلوہ پوری تیار ہے۔''

''اچھا تو دادا جان بلا رہے ہیں اور آپ......؟''

''میں نے اُن کا پیغام پہنچا دیا آپ آرہے ہیں یا نہیں......؟''

''ہاں آپ چلیں میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔''

اپنے وعدے کے مطابق وہ پانچ منٹ میں

آ گیا تھا۔ وہ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔

''سب کچھ بہت لذیذ بنا ہے۔''

''ہماری علیزہ کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔'' دادا جان نے قیمہ کی ڈش اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''واقعی ماننا پڑے گا۔'' ناشتے کے بعد وہ دیر تک بیٹھا دادا جان سے باتیں کرتا رہا اور وہ لان میں بیٹھ کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔ اخبار اس نے اپنے چہرے کے سامنے پھیلایا ہوا تھا۔

''اخبار پڑھ چکی ہوں تو ذرا اِدھر بھی دیکھ لیں۔'' سرمد نہ جانے کب سے اس کے قریب کھڑا تھا۔

''مجھے کیا پتہ تھا اتنا اچھا گھر کرائے پر ملنے کے ساتھ ساتھ اتنے اچھے کھانے بھی ملیں گے وہ بھی مفت۔'' وہ ہنس پڑی اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی سکون سے مسکراتا ہوا اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ویسے آپ اتنے برے نہیں جتنا میں آپ کو سمجھتی تھی۔''

''شکر ہے کہ آپ کی رائے میرے بارے میں اچھی ہوئی۔''

''پتا ہے جب دادا جان نے پورشن کرائے پر دیا تھا تو میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے تھے کہ پتا نہیں کون ہے؟ کیسا ہے؟ ہمیں کسی انجان شخص کو رکھنا چاہیے یا نہیں ہم بھروسہ کر کے غلطی تو نہیں کر رہے۔'' وہ اس کے چہرے پر پھیلتے تاثرات سے بے نیاز بول رہی تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے سرمد کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر سمجھ میں نہ آنے والے تاثرات تھے۔

''میں چلتا ہوں۔'' وہ ایک دم کرسی سے اٹھ گیا۔ علیزہ اس کے اس طرح چلے جانے پر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

اور اسی رات وہ ہو گیا جو علیزہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا دادا جان مرزا صاحب کے گھر گئے ہوئے تھے اور علیزہ پر قیامت ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے بدترین اندیشے صحیح ثابت ہو گئے تھے۔

وہ صوفے پر سر تھامے بیٹھی تھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ چلا چلا کر لوگوں کو بلالے اور کہے مجھے بچالو۔ پورے گھر میں سناٹا تھا اور وہ اکیلی تھی اور باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ نہ جانے کس وقت وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ اپنے سرہانے دادا جان کو دیکھ کر بے اختیار اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ پُرتشویش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''کیسی ہو بیٹا۔'' وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولے۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے مجھے اکیلا چھوڑ کر؟'' وہ روتی ہوئی بولی۔

''ڈرتے نہیں ہیں بیٹا ہم سب ہیں تمہارے ساتھ ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' وہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''ساری رات میں اور سرمد کتنا پریشان رہے ہیں۔'' وہ ایک دم ڈر کر اٹھ بیٹھی اس کی نظریں سامنے کرسی پر بیٹھے سرمد پر پڑیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا ایک دم اسے یاد آ گیا۔

''پانی......'' اس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ دادا دعائیں پڑھ پڑھ کر اسے پھونک رہے تھے۔ دادا کے ہاتھ سے ناشتہ کر کے وہ چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ اُن کے لاکھ پوچھنے

پر بھی اس نے ایک لفظ انہیں نہیں بتایا تھا۔

دادا جان ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ سرمد کو اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھ کر وہ سن پڑ گئی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' وہ بڑے شیریں لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے چہرے پر بڑے نرم وملائم تاثرات تھے۔ علیزہ کے چہرے کی سفید پڑتی رنگت دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لیے چپ سا ہو گیا۔

''علیزہ پلیز جو کچھ ہوا ہے اسے ایک خواب سمجھ کر بھلا دو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے ساتھ ایسا کبھی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ کل رات جو کچھ ہوا میں اس کے لیے معافی مانگ رہا ہوں۔'' وہ ندامت سے سر جھکائے بول رہا تھا۔

علیزہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے صحیح سمجھے کل رات والے بے رحم اور سفاک سرمد کو یا اسے جو چہرے پر افسردگی اور ندامت لیے بیٹھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دیر تک روتی رہی، شام تک اس کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ دادا جان نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ بڑے دنوں بعد وہ باہر آ کر لان میں بیٹھی تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سرمد کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اسے ایک عجیب سے رنج وملال نے گھیر لیا تھا۔

اس کے چہرے پر پھیلتے دہشت اور بے اعتباری کے رنگ دیکھ کر وہ چپ سا ہو گیا تھا۔

''میں کبھی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا پلیز خود کو سنبھالو دیکھو تمہاری وجہ سے دادا جان بھی کتنے پریشان ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولا تھا۔

''یہاں کیا کرنے آئے ہیں آپ دیکھیں مزید جھوٹ نہیں بولیے گا۔'' وہ بے اعتباری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو میں جو بھی ہوں اور جہاں سے بھی آیا ہوں اور جس مقصد سے آیا ہوں مگر تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''نقصان کا مطلب بھی پتہ ہے آپ کو اندازہ ہی نہیں آپ کتنا بڑا نقصان پہنچا چکے ہیں۔ آپ نے میرے سادہ اور پُر خلوص دادا جان کے اعتبار اور بھروسے کا خون کیا ہے۔ بتائیں کیا اس نقصان کا ازالہ ہو سکتا ہے۔'' کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولی۔

''اور میں...... میں جو آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔'' وہ رونے لگی۔

''اور نقصان کسے کہتے ہیں؟ اس سے بڑا کوئی نقصان ہو سکتا ہے؟ ہماری محبت' خلوص اور اعتبار ہار گیا، نقصان تو ہو چکا۔'' علیزہ نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

صبح وہ ٹیبل پر ناشتہ لگا رہی تھی۔ اسی وقت دادا جان اندر آئے اور اس کے ہاتھ میں چابیاں پکڑاتے ہوئے افسردگی سے بولے۔

''سرمد چلا گیا ہے......''

''چلے گئے۔'' اس کے دل کو دھکا سا لگا۔

''ہاں رات میرے پاس آیا تھا کہہ رہا تھا اس کا کام ختم ہو گیا ہے اس لیے صبح وہ چلا جائے گا۔ وہ صبح فجر کے وقت چلا گیا تھا۔ اب تک دل کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ چلا گیا ہے کیسا اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ گم صم کرسی پر بیٹھ گئی۔ دونوں

نے خاموشی اور اداس فضا میں ناشتہ کیا۔ ناشتہ کر کے اس کے پورشن کی طرف جاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہاں ویرانی کا ڈیرہ تھا۔

اس کے آنسو تو اتر سے بہہ رہے تھے۔ زمین پر علیزہ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ جو اس دن سرمد کے ہاتھ کی آہنی گرفت سے ٹوٹی تھیں وہ کانچ جیسے اس کے دل میں کھب گئے تھے۔

''میں اس شخص کے لیے نہیں روؤں گی۔ وہ جھوٹا تھا قاتل تھا اس نے ہمیں دھوکا دیا میں ایسے انسان کے لیے آنسو نہیں بہاؤں گی۔'' وہ خود سے کہہ بھی رہی تھی اور آنسو بھی بہا رہی تھی۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ چادر کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ کچھ دیر پہلے وہ یہاں کروٹیں بدلتا رہا ہوگا۔ علیزہ نے اُس کا تکیہ سیدھا کر کے رکھا تو دیکھا تکیے کے نیچے ایک سفید رنگ کا لفافہ رکھا ہوا تھا۔

اس نے بے تابی سے وہ لفافہ اٹھا کر کھولا۔

''علیزہ میں جا رہا ہوں۔ اب ہم زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا، میری وجہ سے تمہیں جو تکلیف اور دکھ ملے ان سب کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں میں کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کس مقصد سے آیا تھا؟ اور کہاں جا رہا ہوں؟ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ میرے لیے دعا کرنا۔ میں تمہارے لیے دعا گو ہوں کہ تم ہمیشہ خوش رہو تمہیں بے حساب خوشیاں ملیں کوئی دکھ کوئی غم بھولے سے بھی تمہارے نزدیک نہ آئے۔ اسفند یار......'' پورا خط اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''اور میں...... میں جو آپ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اور نقصان کسے کہتے ہیں؟ اس سے بڑا کوئی نقصان ہو سکتا ہے؟'' رات کی تنہائی میں اکثر یہ آواز اسے نیند سے جگا دیتی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ایک مانوس سی خوشبو اسے چہار سو بکھری سی محسوس ہوتی تھی۔ اور پھر ساری رات اس کی آواز اسے سونے نہیں دیتی تھی۔ وہ پھر اسی جگہ پہنچ جاتا جہاں سے بھاگ کر آ گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے اُس کا دل اب بھی وہیں کہیں ہے۔ وہاں سے آتے ہوئے وہ اپنی قیمتی متاع اپنا دل وہیں بھول کر آ گیا تھا۔

وہ خود کو تنبیہ کرتا محبت، خلوص، اعتبار، بھروسہ نامی باتوں کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ میں اسفند یار کب سے ان جذبوں پر یقین کرنے لگا سب فضول باتیں ہیں۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا مگر اس کے باوجود اس کی بے سکونی ختم نہیں ہوتی تھی۔ وہ بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہتا تھا۔ میں محبت کو نہیں مانتا میرے دل میں محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں، وہ چیخ اٹھتا تھا۔ کل ہی خرم کہہ رہا تھا جب سے کراچی سے آئے ہو بدلے بدلے سے ہو۔ بکواس کرتا ہے۔'' میں نہیں بدلا میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ وہ خود کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔

اس نے ایک بے حد امیر اور سیاسی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ پشاور کے ایک عالیشان گھر میں وہ ڈیڈی اور ممی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ دنیا کی ہر آزسائش اسے حاصل تھی۔ وہ شروع ہی سے بڑا پڑھاکو اور خاموش طبع تھا۔ اس کی خاموش طبعی میں اس کے گھر کے ماحول کا بھی کافی دخل تھا۔ ممی کو آئے دن کے فنکشنز پارٹیز سے فرصت نہیں تھی

جبکہ ڈیڈی اپنے بزنس اور سیاسی جھمیلوں میں اُلجھے رہتے تھے۔

اسفند کے ڈیڈی امیر یار پشاور کی ایک مشہور سیاسی پارٹی کے اہم لیڈر تھے اور ان سے پہلے اُن کے والد مہابت یار کی وابستگی بھی اس ہی سیاسی پارٹی سے رہی تھی۔ لیکن اسفند یار کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مہابت یار بڑے دبنگ قسم کے سیاسی لیڈر رہے تھے۔ ایسے سیاسی لوگوں کے جہاں سو دوست ہوں وہاں سو دشمن بھی ہوتے ہیں۔ مخالف پارٹی سے ان کی سیاسی چپقلش چلتی رہتی تھی۔ مہابت یار کے سامنے تو کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اُف بھی کہہ سکیں۔ لیکن ان کے برخلاف امیر یار باہر کے کوالیفائیڈ اور نہایت ٹھنڈے مزاج کے شخص تھے۔ اُن کے مزاج کی نرمی سے ان کے مخالفین بڑا فائدہ اٹھایا کرتے تھے بلکہ بعض تو برملا انہیں بزدلی تک کا طعنہ دیا کرتے تھے۔

اسفند یار کو ان سیاسی جھمیلوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بڑا شاندار تھا شروع ہی سے وہ ہر کلاس میں پوزیشن لیتا رہا تھا اور کامیابی سے ترقی کی منزلیں طے کرتا وہ میڈیکل کالج میں آ گیا تھا۔ اسلام آباد میڈیکل کالج میں اُس کا ایڈمیشن ہوا تھا اس لیے اسے یہاں کے ہوسٹل میں رہائش اختیار کرنی پڑی تھی لیکن وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اب وہ یکسوئی سے اپنی تعلیم پر دھیان دے سکتا تھا۔

ابتداء میں ممی اور ڈیڈی اسے بہت یاد آتے تھے وہ پہلی بار اُن سے جدا ہوا تھا۔ ڈیڈی گاہے بگاہے اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔

اسفند یار نے سب کچھ بھول کر تعلیم پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ وہ اب میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھا اور اس کے فائنل ایگزامز شروع ہونے والے تھے۔

انہی دنوں اس کے ڈیڈی امیر یار اس سے ملنے ہاسٹل آئے تھے۔ وہ بڑے چپ اور بجھے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اس کے اصرار پر انہوں نے بتایا تھا کہ مخالف پارٹی کا لیڈر جبار اعوان اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے اور انہیں قتل کی دھمکیاں دینے لگا ہے۔ یہ سن کر اسفند کا لہو اس کی رگوں میں سنسنانے لگا۔

''اُس کی یہ جرأت؟'' اس نے غصے سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا

''ڈیڈی آپ سیاست چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آپ ان جاہلانہ ذہن رکھنے والے اجڈ لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی ہمارے گھرانے کا سیاسی سفر آپ تک ہی اختتام پذیر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ مجھے سیاست میں نے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ دامن بچا کر نکل جائیں۔''

''بیٹا پھر تبدیلی کیسے آئے گی۔ اگر ہر پڑھا لکھا قابل شخص یہی سوچنے لگے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا ڈیڈی بس اب آپ ان جھمیلوں سے دور رہیں۔'' وہ فکر مندی سے بولا تھا۔

''میں نے گارڈز کی تعداد بڑھا دی ہے، میں خود بہت محتاط ہو گیا ہوں تم بے فکر رہو۔'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔

اس نے پہلی بار ڈیڈی کو اتنا فکر مند دیکھا تھا۔ انہیں فکر مند دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ دو دن بعد اس کے فائنل ایگزامز شروع ہونے والے تھے۔ اسے اپنی اَن تھک محنت پر بھروسہ

تھا۔ اس محنت کے نتیجے میں ایک شاندار مستقبل اس کے سامنے تھا کہ وہ واقعہ ہوگیا جس نے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔

ہوا یوں کہ جبار اعوان کا عیاش بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ ان دنوں اسلام آباد آیا ہوا تھا۔ یہ سب دوست کچھ بدنام زمانہ لڑکیوں کے ساتھ ایک مشہور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس دن وہ دوستوں کے ساتھ اسلام آباد کے ایک شاپنگ مال کے پارکنگ لاٹ میں اپنی گاڑی پارک کررہا تھا کہ جبار اعوان کے بیٹے شہباز کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کردیا۔ گاڑی اس وقت شہباز ہی ڈرائیو کررہا تھا۔ فائر قریب سے کیا گیا تھا۔ گولی اس کے حلق سے پار ہوگئی تھی۔ یہ کسی ماہر نشانے باز کا کمال لگتا تھا۔

رش اور ناکافی روشنی کی وجہ سے لوگ اور اُس کے دوست قاتل کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ یہ تو تھی حقیقت مگر جبار اعوان اور اس کے حواریوں نے سارا الزام امیر یار کے بیٹے اسفند یار پر دھر دیا۔ شہباز کے دوستوں نے جبار اعوان کا مکمل ساتھ دیا اور اسفند کے خلاف گواہی دی تھی۔

دوسرے دن صبح ایگزامیشن ہال میں اسفند یار اپنا پہلا پرچہ حل کررہا تھا جب پولیس نے اسے شہباز کے قتل کے شبے میں گرفتار کرلیا تھا۔ اسفند نے تو کبھی شہباز کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کے قاتل اسی دنیا میں دندناتے پھر رہے تھے اور اسے ناکردہ گناہ کی سزا میں گرفتار کرلیا تھا۔ اسے پولیس ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا۔

امیر یار کو جیسے ہی اس واقعے کا پتہ چلا دونوں میاں بیوی سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنی گاڑی میں بذریعہ سڑک اسلام آباد کی جانب روانہ ہوگئے تھے۔ ابھی ان دونوں نے چند ہی کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اُن کا پیچھا کرتے جبار اعوان کے حواریوں نے انہیں جالیا اور دونوں میاں بیوی کو گولیوں سے بھون دیا اور موقع سے فرار ہوگئے۔

اس ساری کارروائی میں چند منٹ صرف ہوئے تھے اور ایک ہنستا بستا گھر اجڑ گیا تھا۔

اسفند یار کے لیے یہ دوہرا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس کی کہیں شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ پولیس، عدالتیں اور گواہ سب جبار اعوان کی جیب میں تھے۔ اسفند کی قیمتی متاع اس کے ماں باپ ظالموں نے چھین لیے تھے اور اُس کا شاندار مستقبل، کامیابی جو کہ صرف چند قدم دور تھی اس سے چھین لی گئی تھی۔ ساری دنیا نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لے دے کر اُس کا ایک بچپن کا دوست خرم تھا جو اُس کے کام آرہا تھا اس کی خبر گیری کررہا تھا۔ وکیل کا انتظام وغیرہ بھی خرم نے ہی کیا تھا۔

اسفند کے پچھلے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے اور اس کے قابل وکیل کی کاوشوں سے اسفند کی سزا میں کافی تخفیف ہوگئی تھی۔ مگر یہ سزا بھی سات طویل سالوں پر محیط تھی۔

ان سات سالوں نے اسے سر سے پاؤں تک تبدیل کردیا تھا۔ وقت نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ انتقام کا جذبہ اس کے جسم میں لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ وہ اب سراپا انتقام تھا۔ روایتی بدلے کی آگ تو اس کے لہو میں شامل تھی۔ اسے درحقیقت اب کسی سے محبت نہیں تھی۔ اس کے لیے اب کوئی دوست کوئی رشتہ اہم نہیں تھا اس کے اندر اب صرف نفرت ہی نفرت بھری تھی شدید نفرت۔

وہ بے پناہ خودغرض ہوگیا تھا۔ محبت، خلوص،

قربانی اور ایثار جیسے لفظ اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے ذہن پر بس ایک ہی دھن سوار تھی۔ جبار اعوان سے انتقام لینے کی دھن، ان سات سالوں میں اسفند نے جبار اعوان سے انتقام لینے کے بے شمار منصوبے بنائے اور توڑے تھے۔

آخر وہ دن آگیا جس کا اسفند کو شدت سے انتظار تھا۔ یعنی اس کی رہائی کا دن...... وہ اپنے قیمتی سات سال ناکردہ جرم کی سزا بھگت کر باہر آیا تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا ڈیڈی کا بزنس تباہ ہو چکا تھا۔ تھوڑی بہت جائیداد اور اس کے اکاؤنٹ میں جمع کچھ رقم اس کے پاس تھی۔ اسے دولت وغیرہ کے چلے جانے کا کوئی غم نہیں تھا اس کا غم تو اس سے سوا تھا۔

باقی ماندہ جائیداد کی فروخت اور اپنے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس نے نئے کاروبار کی بنیاد رکھی تھی۔ خرم نے اس موقع پر بھی اُس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس کی محنت اور ذہانت رنگ لائی تھی بہت جلد اس نے اپنا بزنس سیٹ کر لیا تھا۔ وہ زندگی میں ہر طرح سے سیٹل ہو گیا تھا۔ زندگی ہر لحاظ سے ہموار اور پُرسکون ہونے کے باوجود اسے ایک بے سکونی لاحق تھی جیسے زندگی میں ایک اہم کام کرنا باقی ہے اور وہ کام تھا جبار اعوان سے انتقام لینے کا۔

وقت کا پہیہ گھوما تھا اور زندگی نے کروٹ لی تھی تو تبدیلی صرف اسفند یار کے حصے میں نہیں آئی تھی بلکہ جبار اعوان کی زندگی میں بھی بڑی ہلچل مچی تھی۔ جبار اعوان کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ان میں سے شہباز قتل ہو چکا تھا جبکہ باقی پانچ بیٹوں کی فطرت و عادت بھی شہباز سے ملتی جلتی ہی تھی۔ جوان بیٹے کی موت سے جبار کی کمر پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کا سارا کروفر رخصت ہو گیا تھا۔ اس کے موقع پرست اور عیار بیٹوں نے اس کی تمام دولت اور جائیداد کے حصے کر دیے اس سلسلے میں اُن کے آپس میں بھی جھگڑے ہوئے اور یوں بددل ہو کر وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ساتھ کراچی شفٹ ہو گیا۔

اسفند کو جبار کے یہ تمام حالات اس کی تلاش کے دوران ہی پتہ چلے تھے۔ اسے تلاش کرنا اگرچہ ایک مشکل کام تھا مگر وہ اپنے ارادے میں اٹل تھا۔ آخر کڑیوں سے کڑیاں ملتی گئیں اور وہ کراچی کے پوش ایریا میں واقع اس بنگلے کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا جہاں آج کل جبار مقیم تھا۔

وہ اس بنگلے میں رہ رہا تھا جو علیزہ کے پڑوس میں ہی واقع تھا۔ اسے کیا کرنا تھا یہ وہ سوچ چکا تھا۔ جبار کے بارے میں تمام معلومات وہ بڑی ہوشیاری سے حاصل کر چکا تھا۔ اسفند نے وہاں جا کر اس علاقے کے اسٹیٹ ایجنٹ سے ملاقات کی تو وہاں ایک بزرگ اپنے بنگلے کا ایک پورشن کرائے پر دینے کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے وہیں اپنے گھر میں رہنے کی آفر دی تھی۔ ان بزرگ کی باتیں سن کر اسے فوراً ہی ایک خیال سوجھا تھا۔ بزرگ اسے ٹھیک ٹھاک بے وقوف لگے تھے۔

وہ اپنی کراچی میں رہائش کو چھپانا چاہتا تھا۔ کسی بڑے ہوٹل میں رہائش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی کراچی آمد کا کوئی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر بزرگ کے سامنے اپنی رہائش کا مسئلہ بیان کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے اسے اپنے گھر رہنے کی پیش کش کر دی تھی۔ اس کے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

اندازے مشکل ہی سے غلط ثابت ہوتے تھے۔

یہ ایک کافی کشادہ اور قدیم طرز پر بنا ہوا بنگلہ تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ جگہ جیسے اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والے لوگوں میں سب سے سادہ اور بے وقوف لگتے تھے۔ بیٹا بیٹا کہتے اُن کی زبان گھستی تھی۔ اس نے جو کچھ انہیں بتایا تھا انہوں نے آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے انہیں اپنا نام تک غلط بتایا تھا۔

انہوں نے پہلے ہی دن اسفند کو کھانے پر بلایا تھا۔ وہاں پہلی بار اس نے انتہائی خوبصورت اور سادہ سی لڑکی علیزہ کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی عام سے کپڑوں میں بھی وہ خاص لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔

اس دن وہ برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اور اپنی دن بھر کی کارکردگی پر خوش ہو رہا تھا۔ جبار کے بارے میں بڑی اہم معلومات اس کے ملازم کے ذریعے اسے مل گئی تھیں۔ وہ اس کے اتنا قریب تھا اتنا قریب کہ جب چاہتا اس کی زندگی کی ڈور کاٹ سکتا تھا۔ جبار کے بیٹے کے آنے جانے کے اوقات کے بارے میں بھی اُسے پتہ چل گیا تھا۔ وہ اس سے نبٹنے کے منصوبے بنا رہا تھا جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ لان میں کچھ فاصلے پر علیزہ کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ علیزہ شاید اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لیکن اس کا ذہن اس وقت جبار میں اُلجھا ہوا تھا۔ اسفند نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔

دوسری صبح موسم ابر آلود تھا اور اُس کا موڈ بھی بڑا خوشگوار تھا وہ جاگنگ کرنے باہر نکل گیا تھا۔ واپسی پر وہ لان میں چہل قدمی کرتی نظر آئی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گلابی رنگ کے لباس میں وہ حد سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ سرسبز گھاس پر اپنے گلابی پاؤں دھرتی وہ آہستہ قدمی سے چل رہی تھی وہ اس وقت پھول کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ وہ بے اختیار اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اپنے کل کے نظر انداز کیے جانے پر اُس کا موڈ آف تھا۔ اسی لیے وہ اسے اگنور کر رہی تھی۔ وہ اپنے روٹھے روٹھے اس روپ میں اور پیاری لگ رہی تھی۔ وہ اُس کا یہ انداز دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

سب کچھ اسفند کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس نے جبار کے دو ملازمین کو تھوڑا سا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ اس کا کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ ملازمین کے ذریعے ہی اسے پتہ چلا تھا کہ جبار آج کل بہت بیمار ہے اور اپنے کمرے تک ہی محدود رہتا ہے۔ "کل وقت تمہارا تھا جبار اعوان آج وقت کی طنابیں میرے ہاتھوں میں ہیں۔" اس نے سوچا۔

وہ اکثر رات کو دیر تک جاگتا رہتا تھا اور اکثر علیزہ کو اپنی کھڑکی سے اِدھر اُدھر جھانکتے اور آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھار تو یوں لگتا کہ وہ سوتے سے جاگ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔ ایک بار وہ جب رات گئے باہر جھانکنے کے بعد کھڑکی سے ہٹی اور اپنے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تو اسے ذرا تجسس ہوا۔ وہ دبے پاؤں اُن لوگوں کے پورشن کی طرف آ گیا۔ اس نے لاؤنج کی کھڑکی سے اندر جھانکا تو وہ بڑے وہمی انداز میں تمام دروازے اور کھڑکیاں چیک کر رہی تھی۔

جو کھڑکیاں کھلی تھیں وہ جلدی جلدی بند کر رہی تھی۔ اس کے بے حد خوبصورت اور گھنے بال کھلے ہوئے اُس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے وہ اس حلیے میں بڑی حسین لگ رہی تھی۔ وہ اتنی پیاری اور معصوم لگ رہی تھی کہ وہ مبہوت رہ گیا تھا۔ جس کھڑکی کے پاس وہ کھڑا تھا وہ اسے بند کرنے آئی تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں وہ واپس آیا تو اس کے دل کی کیفیت عجیب سی تھی بار بار اس کی آنکھوں میں اُس کا دلکش سراپا گھوم رہا تھا۔

اس دن اُس کی طبیعت کچھ خراب تھی بخار ہو گیا تھا۔ انہیں نہ جانے کیسے خبر ہو گئی۔ وہ اُن کے آنے پر حیران تھا۔

''کل سے تم مسلسل گھر پر ہو تو مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں۔'' اسفند کے استفسار پر وہ بولے تھے۔

معمولی بخار کو وہ خاطر میں نہیں لایا تھا دوا لے کر وہ بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھتا رہا تھا یا سوتا رہا تھا۔ مگر وہ اس طرح پریشان ہو گئے تھے جیسے وہ نہ جانے کتنا شدید بیمار ہو۔ انہوں نے ملازمہ سے چائے بنوا کر اسے پلائی تھی بسکٹ کھلائے تھے۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔

'' اٹھنے کی ہمت نہیں تھی تو فون ہی کر دیتے۔'' وہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کے بخار کا اندازہ کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں کا لمس پا کر وہ کچھ بے چین ہو گیا تھا۔ اسفند نے اُن کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولے تھے۔

''تم تکلف بہت برتتے ہو کیا تمہارے گھر والے یہاں ہوتے تو انہیں منع کرتے۔'' ان کی اس بات نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کتنی سچی اور خالص محبت تھی اُن کی، اس رات وہ بہت پریشان اور پشیمان رہا تھا۔ کتنے پُرخلوص اور سادہ لوگ تھے یہ۔

اتوار کا دن تھا وہ بستر پر سستی سے پڑا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ جب دروازے پر دستک ہوئی اس نے دروازہ کھولا تو سامنے علیزہ کھڑی تھی۔ وہ اسے ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی زرد آنچل کی اوٹ میں اُس کا سرخ و سپید چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ رنگ آج سے پہلے اسے اتنا اچھا کیوں نہیں لگا۔ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنا اسفند کے لیے ایک بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ وہ خود کو اس فیملی کا فرد تصور کر رہا تھا۔ اس نے بے اختیار دعا کی کہ کاش یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے اس لمحہ اس نے سوچا اس جگہ سے اچھی جگہ روئے زمین پر کوئی نہیں ہے۔

اسفند کا آج کل زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزر رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں چھٹیاں انجوائے کرنے آیا ہو۔ جبار کو جیسے وہ یکسر بھلا بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے گھر سے باہر جاتا تو واپس گھر جانے کے لیے بے چین ہونے لگتا تھا۔ اس گھر اور گھر کے مکینوں میں نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی۔ جب اسے اس بات کا خیال آیا کہ وہ اپنا مقصد بھول رہا ہے۔ تو فوراً نئے سرے سے خود کو تیار کیا۔ کچھ تھا جو اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ اپنی بدلتی ہوئی کیفیت سے وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔ اسے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا تھا شام تک یہ اضطراب اور بے قراری ایک ہیجان کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ علیزہ کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں جو اس کے لیے وسوسے تھے وہ سچ تھے۔ اپنا مقصد یاد آتے

ہی لہو اُس کی رگوں میں آگ بن کر دوڑنے لگا تھا۔

وہ فون پر خرم سے بات کر رہا تھا اسی وقت اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا اور اسی وقت علیزہ کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ اسفند کا غیض وغضب سے برا حال ہوگیا تھا۔ اسے اس کے بارے میں سب کچھ پتہ چل گیا تھا۔ یہ سوچ اُس کی ہر سوچ پر حاوی ہوگئی تھی۔ اس پر ایک جنون سا سوار ہوگیا۔ علیزہ خوفزدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر اسفند نے اسے آگے بڑھنے نہیں دیا اور اسے انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے کھینچ کر کمرے میں لے آیا وہ اس وقت وہی اسفند تھا جو اپنے راستے میں آنے والے کو کچل کر رکھ دیتا تھا۔ وہ اس سے التجا کر رہی تھی گڑگڑا رہی تھی اور وہ اسے اذیت دے رہا تھا۔ اس کا منہ اس نے سختی سے بند کیا تھا وہ بری طرح تڑپ رہی تھی اسے اس پر کوئی رحم نہیں آ رہا تھا بلکہ اس کے چلانے پر وہ غصے سے پاگل ہوگیا اور پوری قوت سے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا وہ بے حال سی ہوگئی تھی اس کا سر بری طرح دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اسے اس نے انتہائی سفاکی سے کوئی بھی بات کسی کو بتانے سے منع کیا اور وہاں سے جانے کا کہا تو وہ دیوانہ وار وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

وہ چلی گئی تھی اور اسفند خاموش کھڑا اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا اس کہ اب جبکہ اسے اُس کی اصلیت کا پتہ چل گیا ہے اسے جلد از جلد جبار کا کام تمام کر کے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ باہر سے آتا بارش کا شور اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے کمرے میں پلٹا تو فرش پر جا بجا الٹی ہوئی ٹرے، پکوڑے، سموسے، ٹوٹی ہوئی چائے کی پیالی جو وہ اُس کے لیے بنا کر لائی تھی بکھری ہوئی تھی۔

’’میرے لیے...... میرے لیے بنا کر لائی تھی۔‘‘ اس نے خود سے کہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دیکھنے لگا وہ سب اٹھا کر اس نے ٹرے میں ڈالا۔

آگے کچھ فاصلے پر اُس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں پڑی تھیں۔ وہ دیوار کے پاس آیا یہاں اُس کا زرد دوپٹہ پڑا تھا۔ جسے اس کے سر پر دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ آج سے پہلے یہ رنگ اسے اتنا اچھا کیوں نہیں لگا تھا۔ وہاں کی ایک ایک چیز اُس کی سفاکی کا اعلان کر رہی تھی۔

’’وہ کیا کر رہی ہوگی...... وہ ٹھیک تو ہوگی۔‘‘ علیزہ وہ چیختا ہوا اس کی طرف لپکا تھا۔

’’یہ میں نے کیا کر دیا؟‘‘

’’علیزہ اٹھو آنکھیں کھولو۔‘‘ وہ جنونی انداز میں اسے جھنجھوڑ رہا تھا مگر اُس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ پھول جیسی لڑکی اتنی سفاکی بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیروں کے ساتھ اس کے ہاتھ کا نشان بھی واضح نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ تھام کر رو رہا تھا۔ مگر وہ ہوش و حواس سے بے گانہ پڑی رہی۔ وہ اسے اُٹھا کر کمرے میں لایا اور بیڈ پر لٹا کر باہر بھاگا۔

طوفانی بارش میں وہ تیزی سے چلتا نزدیک ہی واقع ڈاکٹر کی کلینک کی طرف جا رہا تھا۔ راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا تھا۔ اسے کچھ ہوا تو میں کیسے جی پاؤں گا۔ ڈاکٹر کو لے کر وہ واپس گھر پہنچا تو دادا جان اس کے سرہانے بیٹھے رو رہے تھے اور مسلسل دعائیں پڑھ پڑھ کر اسے پھونک رہے

تھے۔ ڈاکٹر کے تسلی آمیز جملے سننے کے بعد وہ بولے۔

''غلطی میری ہے...... اتنے خراب موسم میں اسے اکیلے چھوڑ کر کیوں گیا۔ وہ ڈر گئی ہوگی۔ بارش کی گھن گرج سے بہت ڈرتی ہے۔'' کیسی قیامت کی یہ رات تھی وہ دونوں اس کے سرہانے بیٹھے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کررہے تھے۔

بے ہوشی میں وہ کئی بار چلائی تھی۔

''دادا جان مجھے بچالیں۔'' اور اس کی یہ پکار اسفند کو ندامت کے سمندر میں غرق کررہی تھی۔

اس کی نظر جیسے ہی اسفند پر پڑی تو اسے لگا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتادے گی کہ وہ دھوکے باز ہے اور اسفند نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے اور اس کی وجہ سے آنچل اس کے سر سے ہٹا ہے۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر تو قفل پڑے تھے اس کے لب بھینچے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف منجمد ہوکر رہ گیا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا۔ زندگی اس کا امتحان لے رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے برسوں جس انتقام جس نفرت کی آبیاری کی تھی وہ اس مختصر سے عرصے میں ریت کی دیوار کی طرح ڈھے رہی تھی کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جو وہ کرنے جارہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ علیزہ کی حسین آنکھوں میں اس کے لیے آنسو تھے۔ اس کی آنکھوں سے گرنے والا ہر اشک اس کے لیے تھا اس کی وجہ سے تھا اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کردے اور اس سے کہے......

''ہاں میں ہی وہ شخص ہوں جس پر تم آنکھیں بند کرکے اعتبار کرسکتی ہو۔'' وہ اسے سوتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

''کاش علیزہ میں تمہارے قابل ہوتا۔ کاش میں تمہارے جیسا ہوتا۔ نفرت زہر بن کر میرے پورے وجود میں پھیل گئی ہے۔ محبت اب مجھے راس نہیں آئے گی۔ نفرتوں نے مجھے محبت کے قابل ہی کب چھوڑا ہے۔ مجھے معاف کردینا علیزہ، میں انتقام لیے بنا جی نہیں سکتا۔ میں واپس اپنی اسی دنیا میں جارہا ہوں۔ منافق، جھوٹی اور مکروفریب سے بھری دنیا میں......''

جبار اعوان کو قتل کرنے کے منصوبے کو اس نے آخری شکل دی تھی۔ اس کے ملازم نے جبار کے کمرے کے اے سی میں کوئی خرابی پیدا کردی تھی اور الیکٹریشن کے روپ میں اسفند کو اس کے کمرے تک باآسانی رسائی مل گئی تھی۔ جبار کا ملازم اسے پہلے بتاچکا تھا کہ وہ بہت بیمار ہے لیکن اس کی بیماری کی نوعیت سے اس نے اسفند کو آگاہ نہیں کیا تھا۔

وہ اور جبار اس وقت جبار کے کمرے میں تھے۔ ملازم جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کرگیا تھا۔ اسفند جبار کے بیڈ کے قریب آگیا۔ وہ بغور جبار کے بوڑھے کمزور اور فالج زدہ جسم کو بیڈ پر پڑے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ برسوں سے اپنے بیڈ تک محدود تھا۔ یہاں تک کہ قوت گویائی سے بھی محروم ہوگیا تھا۔

''مجھے پہچانا جبار میں اسفند یار ہوں، امیر یار کا بیٹا جس کی زندگی تونے تباہ کردی۔ میں تجھ سے انتقام لینے آیا تھا۔ میں تجھے اذیت ناک موت مارنا چاہتا تھا تجھے تڑپتا اور اپنے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے زندگی کی بھیک مانگتے دیکھنا چاہتا تھا مگر جو موت میں تجھے دینا چاہتا تھا وہ کم اذیت ناک تھی

قدرت نے تیرے لیے بہتر سزا تجویز کی ہے۔''
نفرت اور انتقام کا وہ الاؤ جو برسوں سے اسفند نے اپنے وجود میں سلگائے رکھا تھا وہ جبار کی اذیت ناک حالت دیکھ کر بجھ گیا تھا۔ جیسے لمحوں میں اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ قدرت اس سے پہلے ہی اس سے انتقام لے چکی تھی۔ بے شک اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ اسفند نے سوچا تھا۔ وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلا آیا تھا جبار دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اسفند پشاور اپنے گھر واپس آ گیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ بس وہ بدل گیا تھا اس میں کوئی بڑی تبدیلی آ گئی تھی خرم نے اس تبدیلی کو سب سے زیادہ محسوس کیا تھا۔ آفس کے بعد سارا وقت اس کا گھر پر ہی گزرتا تھا یا پھر وہ لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا تھا۔ صبح سو کر اٹھتا تو اپنے بنگلے کے وسیع وعریض لان پر کوئی آہستہ آہستہ گھاس پر اپنے سفید پاؤں رکھتا نظر آنے لگتا۔ وہ اسے یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی ہر بار کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا لیکن وہ جتنا اُس کی یاد کو جھٹکتا وہ اسے اتنی ہی شدت سے یاد آنے لگتی تھی۔ اس کی آواز اسفند کے کانوں میں گونجتی تو وہ سوتے سے اٹھ جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔

ایک سال بیت چکا تھا۔ خود سے لڑتے ہوئے۔ علیزہ کو بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ماضی کی ایک ایک بات اسے یاد آتی تھی رُلاتی تھی، تڑپاتی تھی۔ وہ بڑا بے چین اور مضطرب رہتا تھا۔ اب صرف وہ اسفند زندہ تھا جو محبت کرتا تھا جس کے دل میں ایک محبت بھرا دل دھڑکتا تھا۔ اس کے دل میں محبت نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔ وہ اب اپنی زندگی محبتوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ علیزہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

''کیا وہ مجھے معاف کر دے گی؟ کیا اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہوگی؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔

''کیا وہ میری محبت کا یقین کر لے گی؟''

''ہاں......'' اس کے اندر سے آواز آئی۔

''وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔'' دل نے کہا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی اور باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ دسمبر کے آخری ایام تھے باہر سخت سردی تھی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ کھڑکی بند کر کے پلٹنے ہی والی تھی کہ اُس کی نظر اسی وقت ایک شخص پر پڑی جو سوٹ پہنے تیز قدموں سے گیٹ سے اندر داخل ہوتا نظر آیا۔ وہ تیز تیز چلا آ رہا تھا۔

''سرمد......'' وہ بے اختیار بھاگی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اسفند نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا اس تک آ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''علیزہ میں ایک طویل مسافت طے کر کے آیا ہوں کیا مجھے یہاں جگہ ملے گی؟''

اس کے سوال میں کئی اندیشے تھے کئی امیدیں تھیں کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولا۔

''وہ سرمد مر چکا ہے اب تمہارے سامنے اسفند کھڑا ہے جو تم سے شدید محبت کرتا ہے جو تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔'' وہ بڑی آس لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اتنی دیر کیوں کر دی آنے میں۔'' اس کا جواب سن کر وہ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ اس کے سارے اندیشے ختم ہو گئے اور لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

سمیرا غزل صدیقی

جیون اک خوابِ سفر

''بہو اپنے گھر میں شوہر کی دیکھ بھال کرتی اچھی لگتی ہے نہ کہ میکے میں سیر سپاٹے کرتی اور جو بیویاں اپنے شوہروں کو چھوڑ چھوڑ کر میکے جا بیٹھتی ہیں اُن کے شوہر بھی کہیں اور ہی دل لگی کا سامان تلاش کر لیتے ہیں۔'' ساس کی منطق کے آگے وہ چپ ہو جاتی پھر بھی......

ماجد علی عرف مجو کی شادی خانہ آبادی اس کی تین عدد خرانٹ شادی شدہ بہنوں اور ایک عدد کنواری مگر سب پر بھاری بہن نے اپنی مشترکہ پسند سے نادیہ سلیم سے بڑی ہی دھوم دھام سے کروائی تھی۔ یوں بھی وہ اپنی اماں کا اکلوتا اور کماؤ پوت بیٹا تھا جس کی کریانے کی دکان سے ہی اس کی بہنوں

اور گھر کا خرچ چلتا تھا۔ ویسے تو مجو بڑا ہی نیک اور ہوشیار تھا مگر بلا کا سیدھا تھا مجال تھی جو اماں اور بہنوں کے آگے اس کی زبان کھل جاتی۔ بچپن سے ہی اُس نے صرف ایک لفظ سیکھا تھا 'ہاں' اور اس کے علاوہ اس نے گھر میں کوئی لفظ بولنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

عمر نے اٹھائیس کا ہندسہ کراس کیا تو اماں کو اب بہو کی ضرورت محسوس ہونے لگی البتہ ان کی کوشش یہی تھی کہ کنواری نند مدیحہ کی بھی شادی ہو جائے یہ نہ ہو کہ شادی کے بعد بیٹا ماتھے پر آنکھیں رکھ لے۔ اسی لیے شروع سے ہی دکان کا سارا خرچ و آمدنی اماں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا یہ نہ ہو کہ بیٹا شادی کے بعد پیسوں کو ترسا دے اور تو اور لڑکی کے انتخاب میں بھی بہنوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ لڑکی کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو اور وہ اُسے خوب دبا کر رکھ سکیں۔ بن باپ کی سب سے بڑی ذمہ دار چھبیس سالہ نادیہ اپنی پلکوں پر ڈھیروں خواب لیے ماجد کے سنگ رخصت ہو کر اس کے چھوٹے سے آشیانے میں چلی آئی تھی۔ مگر اس کے سہانے محبت بھرے خواب شادی کی پہلی رات ہی بری طرح چکنا چور ہو گئے تھے۔ جب مجو نے دبے دبے لفظوں میں اُسے باور کرایا تھا۔

''دیکھو نادیہ میں نے کبھی اپنی ماں کو کوئی تکلیف نہیں دی ہے بڑی امیدیں ہیں انہیں مجھ سے اور تم بھی کبھی اُن کا دل نہ دکھانا اُن کے آگے کبھی ناں نہ بولنا۔''

یہ کیسا دولہا تھا جو شادی کی اولین رات ہی اُسے اچھی بہو بننے کے گُر سکھا رہا تھا۔ جبکہ یہ رات تو اُن دونوں کے وصل کی محبت کی رات تھی۔ نادیہ نے بھی جھٹ پلکیں جھکا دی تھیں۔ مبادا سرتاج ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ شادی کے دوسرے روز ہی نادیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مجو صرف اپنی اماں اور بہنوں کی سُنتا ہے سارا دن مجو کی اماں ساجدہ نادیہ کو گھر کے کاموں میں ہلکان کیے رکھتیں کبھی نند کی فرمائش تو کبھی ساس کی وہ بے چاری منع بھی نہ کر پاتی۔ کبھی لب کھولنے کا سوچتی بھی تو ساس کی قہر آلود آنکھیں اس کے لب ہلنے سے پہلے ہی خاموش کرا دیتیں مجو سے کچھ کہنے کا مطلب اُسے ناراض کرنا ہی تھا کبھی جو وہ میکے جانے کا سوچتی تو ساس صاحبہ چپ کرا دیتیں۔

''بہو اپنے گھر میں شوہر کی دیکھ بھال کرتی اچھی لگتی ہے نہ کہ میکے میں سیر سپاٹے کرتی اور جو بیویاں اپنے شوہروں کو چھوڑ چھوڑ کر میکے جا بیٹھتی ہیں اُن کے شوہر بھی کہیں اور ہی دل لگی کا سامان تلاش کر لیتے ہیں۔'' ساس کی منطق کے آگے وہ چپ ہو جاتی پھر کبھی میکے جانے کا نام نہ لیتی اور جو کبھی اس کی اماں اور بہنیں اس سے ملنے کو آ جاتیں تو ساس اور نند انہیں اُس کے پاس کبھی اکیلا ہی نہ چھوڑتیں۔ جو وہ کوئی حالِ دل کہہ سکے۔ ہاں اتنا ضرور سوچتی تھی کہ اُس کی شادی شدہ نندیں کیوں ہر دوسرے دن میکے میں دکھائی دیتی ہیں۔ انہیں کیوں ساس منع نہیں کرتیں اور ان سوالوں کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ وہ بہو تھی اور وہ بیٹیاں۔''

☆......☆......☆

اُس روز نادیہ نے مشین لگائی ہوئی تھی۔ صبح سے وہ کوئی درجن بھر سے زائد کپڑے دھو دھو کر ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ آگ اُگلتا سورج صحن میں کپڑے دھوتی نادیہ پر مسلسل اپنا قہر برسا رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابور اپنی خرابی قسمت کو کوس رہی تھی ابھی وہ کپڑے پھیلانے کو کھڑی ہی ہوئی تھی کہ اُسے منہ بھر کے قے آئی تھی وہ فوراً واش روم بھاگی تھی۔ ساس صاحبہ کو اُس کے انداز ذرا کھٹکے تھے۔ وہ فوراً نادیہ کو قریبی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں اور جو خوشخبری انہیں ڈاکٹر نے سنائی تھی وہ نہال ہو چلی تھیں۔ نانی بننے کے بعد دادی

بننے کی خوشی کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ شام تک یہ خبراس کی تمام نندوں تک پہنچ چکی تھی۔ سو وہ اپنے ہٹلر بچوں سمیت میکے میں ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔ شام کو مجو گھر آیا تو شرمائی لجائی سی نادیہ اُسے بہت بھائی تھی۔ باپ بننا اس کے لیے بھی کسی خوش نصیبی سے کم نہ تھا آج تو چھوٹی نند صاحبہ بھی نادیہ کے ساتھ کچن میں مدد کروا رہی تھیں۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں اتنی بڑی پلٹن کی اکیلے خاطر تواضع اس کے اندر سانس لیتی ننھی سی جان کے لیے کسی قدر بھی مناسب نہ تھا۔

ساس صاحبہ تینوں شادی شدہ نندوں کے ساتھ اپنے کمرے میں گول میز کانفرنس میں مصروف تھیں اور بچے شرارتیں کرتے نادیہ کی جان ہلکان کیے رکھے ہوئے تھے۔ نادیہ ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ آخر بند کمرے میں یہ لوگ کیا راز و نیاز کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔

''بات تو خوشی کی ہے امی مگر سر پر مت چڑھا لینا اپنی بہو کو یہ نہ ہو کہ مہارانی بنا لیں آپ اور پھر آپ کے قابو ہی نہ آئیں۔'' نادیہ کی سب سے بڑی نند عالیہ نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں تھیں۔

''اور کیا امی آپ تو ہیں ہی نری معصوم ارے ایک مہینہ لگا ہے بھابی کو دبا کے رکھنے میں اب پوتے کی خوشی میں ساری محنت نہ برباد کر لینا یہ نہ ہو کہ بھائی جورو کے غلام بن جائیں۔ بھئی ہم نے بھی تو بچے پیدا کیے ہیں کیا ہم نے گھر کے کام نہیں کیے آپ نے تو پہلے ہی دن بے چاری مدیحہ کی ڈیوٹی بھابی کے ساتھ کچن میں لگا دی حد کرتی ہیں آپ۔'' عالیہ سے چھوٹی نجمہ نے اماں کو گھورا تھا۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو اب دیکھنا کیسی لگام کس کے رکھتی ہوں۔'' ساس صاحبہ کی آنکھوں میں بڑی کمینی سی چمک آئی تھی اور پھر تینوں بہنوں کا بڑا ہی بے ہنگم قہقہہ فضا میں گونجا تھا۔

☆......☆......☆

بیٹیوں کے کہنے میں آ کر ساس صاحبہ نے اگلے دن سے ہی ماتھے پر آنکھیں رکھ لی یعنی سارا کام اکیلی نادیہ کے سپرد کر دیا تھا اور وہ بے چاری حیران و پریشان سی کھڑی سوچتی رہ گئی کہ کل تک تو ساس نے مدیحہ کو اس کے ساتھ مل کے ہر کام کرنے کو کہا تھا پھر آج ایسا کیا ہو گیا جو آنکھیں بدل لیں۔

''مدیحہ بیٹا تم دوپہر میں چلنا میرے ساتھ رضیہ آپا کے گھر تمہیں سلائی سیکھنے لگا آؤں گی خیر سے اب تمہارا بیاہ بھی کرنا ہے۔'' سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ساس صاحبہ نے نادیہ کے سامنے مدیحہ سے کہا تھا۔ سلائی سینٹر بھیجنے کا مقصد بھی صرف یہی تھا کہ مدیحہ نادیہ کی مدد نہ کر سکے اور ماجد کے سامنے بہانہ بھی بن جائے کہ وہ بے چاری گھر پر ہوتی ہی کب ہے رہ گئی ساس تو وہ کہاں سے اس عمر میں کام کریں گی۔

''جی امی جیسے آپ کہیں۔'' مدیحہ نے مسکراتے ہوئے نادیہ کو دیکھا تھا جیسے کہ اس کی بے بسی پر ہنس رہی ہو اور وہ بے چاری تو اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ ''امی ابھی کچھ مہینے رُک جائیں پھر لگا دیجیے گا۔'' اب مدیحہ ہر وقت اپنی سلائی کے کاموں میں مصروف رہتی اور نادیہ گھر کے کاموں میں کپڑے دھوتی تو تھوڑے تھوڑے کپڑے بالٹی میں بھر کے اوپر پہنچا آتی کسی کو ترس نہ آتا کہ وزن اٹھانے سے ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ ڈھیروں برتن دھوتی جب کچن میں جاتی برتن منہ چڑا رہے ہوتے۔ نند یا ساس کو اتنی توفیق نہ ہوتی کہ کم از کم کچھ کھایا ہے تو برتن دھو کر رکھ دیں۔ دوپہر کو الگ ہنڈیا پکاتی رات کو الگ کہ باسی سالن یا روٹی کسی کو کھانے کی عادت نہ تھی۔

مجو گھر آتا تو نڈھال نڈھال سی نادیہ کو دیکھ کے تھوڑا پریشان ہو جاتا اکثر وہ الٹیاں کر کر کے نڈھال ہو جاتی تو ساس بڑی ہی بے فکری سے کہتیں۔

"بھئی اُلٹیاں تو ایسے میں ہو ہی جاتی ہیں۔ مجھے تو پورے نو مہینے تک ہوتی تھیں مگر مجال ہے جو گھر کا کام رُکا ہو۔" اور وہ بے چاری پھر سے کام میں جت جاتی۔ اس روز گھر پر کوئی نہ تھا مدیحہ سینٹر گئی ہوئی تھی تو ساس صاحبہ اپنی کسی سہیلی کے گھر حال احوال پوچھنے کی غرض سے روانہ ہو گئی تھیں۔ نادیہ کو بڑی دیر سے چکر آ رہے تھے اُس نے بڑی ہی مشکل سے لیموں پانی بنایا تھا مگر یہ اس کی خرابی قسمت تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ گلاس منہ سے لگاتی ایک بڑا ہی زوردار چکر اُسے زمین بوس کر گیا تھا اور گلاس کی کرچیاں پورے کچن میں بکھیر گئی تھیں۔ اُسے ہوش آیا تو اُس نے خود کو اسپتال میں پایا تھا اس نے آنکھیں کھولیں تو ماجد اُس کے برابر میں بھی بیٹھا تھا۔ اُس نے حیران ہو کے ماجد کو دیکھا تھا۔

"گھبراؤ مت تمہیں چکر آ گئے تھے وہ تو اچھا ہوا کہ میں کسی ضروری کام سے گھر آ گیا تھا اور چابی بھی ایک میرے پاس ہوتی ہے ورنہ تو آج نجانے کیا ہو جاتا تم نے اماں کو جانے کیوں دیا۔" ماجد اُس کے لیے فکر مند تھا نادیہ کا دل پُرسکون ہوا تھا۔

"اب یہ ٹھیک ہیں لیکن آپ کو ان کا دھیان رکھنا ہوگا یہ بہت کمزور ہیں اُن کی خوراک کا خیال رکھیں کچھ دن انہیں ریسٹ کرنے دیں پھر ہلکا پھلکا کام کرائیں یہ نہیں کہ سب کام ان پر لاد دیں۔ اسی وجہ سے ان کا یہ حال ہوا ہے آپ بات سمجھیں بچے پر اثر پڑے گا۔" ڈاکٹر نے رسانیت سے ماجد کو سمجھایا تھا وہ خود کافی ٹائم سے دیکھ رہا تھا کہ نادیہ ایسی حالت میں بھی سارا کام خود کر رہی ہے مگر اماں سے کچھ کہنے کی اس کی ہمت نہ تھی مگر اب سوال اس کے بچے کی صحت و سلامتی کا تھا وہ نادیہ کو لے کر گھر آیا تھا تو اماں پہلے سے تنی بیٹھی تھیں۔

"ارے او مجو باؤلا ہو گیا ہے کیا ایسی حالت میں بہو کو لے کر کہاں چلا گیا تھا میرے انے کا انتظار تو کیا ہوتا اور بہو سارا گھر ایسے ہی گندا چھوڑ کے تم گھومنے چلی گئیں۔" اماں نے بہو بیٹے کو گھورا تھا۔

"اماں سوچنا تو تجھے چاہیے تھا نہ مدیحہ گھر پر تھی نہ تو ایسی حالت میں نادیہ کو چھوڑ کے کہاں چلی گئی تھیں بے ہوش ہو گی تھی یہ اگر میں نہیں آتا تو پتا نہیں کیا ہوتا اور ڈاکٹر نے اسے آرام کا کہا ہے تو خود کر لے کام پہلے بھی تو کرتی تھی۔" زندگی میں پہلی بار ماجد نے اپنی زبان اماں کے آگے کھولی تھی۔ اماں تو اماں نادیہ بھی حق دق ماجد کا یہ روپ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اماں تو ابھی تک شاک میں تھیں۔ ماجد نادیہ کو کمرے میں چھوڑ آیا تھا پھر اماں کی ہمت نہ پڑی تھی نادیہ کو بلانے کی اگلے دن ہی اماں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو فون کر کے بلا لیا تھا۔

"دیکھا اماں میں نہ کہتی تھی کہ لگام کس کے رکھو آج دیکھ لیا نہ اولاد کی وجہ سے وہ کل کی آئی لڑکی جیت گئی۔ کیسا ڈرامہ کر کے بھائی کو اپنی طرف کر لیا۔" بڑی نند نے بڑی ہی چالاکی سے اپنی آنکھیں گھمائی تھیں۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی واقعی طبیعت خراب ہو گئی ہو میرے پوتے کو کچھ نہ ہو جائے۔" اماں تو آخر تھی تو اماں ہی نہ بہو سے دلچسپی نہ ہو پوتے کا تو شوق تھا بہر حال انہیں۔

"لو اماں پگلا گئی ہو کیا ارے یہی تو ڈرامے ہوتے ہیں آرام کرنے کے تو بھی بہو کے ڈرامے میں آ گئی۔" بڑی سے چھوٹی نند نجمہ نے اماں کو

آنکھیں دکھائی تھیں۔ وہ اپنی باتوں میں مگن تھیں اور باہر اماں کو بلانے کے لیے آیا ہوا ماجد اپنی ماں اور بہنوں کا یہ روپ دیکھ کے سخت صدمے میں تھا۔ لمحے میں اُس نے فیصلہ کیا تھا اور وہ دھاڑ سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تھا۔ اماں سمیت باقی بہنیں سخت اچھلی تھیں مبادا اُس نے سب سن نہ لیا ہو۔

''واہ اماں واہ تُو اپنی بیٹیوں کی باتوں میں آ کے اپنے ہنستے بستے گھر کو آگ لگا رہی ہے۔ تو خود ہی بیاہ کر لائی تھی نہ اُسے میں تو نہیں لایا تھا نہ پھر یہ فرق کیوں ذرا دیکھ جا کے اُسے کبھی اُس نے تیری بے عزتی کی تجھ سے زبان چلائی۔ تیری نافرمانی کی نہیں یہاں تک کے تو نے اُسے کبھی میکے رُکنے نہ جانے دیا وہ اُس پر بھی سر جھکا گئی تیری بیٹیاں تو روز آتی ہیں نہ وہ کیا سوچتی ہو گی اماں کھول لے اپنی آنکھیں یہ نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔ یہ سب تو اپنے گھر چلی جائیں گی تیری اصلی بیٹی تو وہ ہے نہ تیرے دکھ درد کی ساتھی۔''

ماجد کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اماں بیٹے کو دیکھتی رہ گئی تھیں لمحہ لگا تھا انہیں بھی سب سمجھنے میں غلطی اُن کی تھی جو وہ بہو کو بہو ہی سمجھ رہی تھیں اور ایسا کرنے میں اُن کی بیٹیوں کا ہی ہاتھ تھا وہ ہی انہیں سمجھاتی رہتی تھیں۔

''بھائی ہمیں غلط نہ سمجھو۔'' عالیہ فوراً بولی تھی۔

''باجی پلیز آپ نہ بولو آپ لوگ اپنی زندگی میں خوش ہو پھر آپ کو اس سے کیا مسئلہ ہے اور اماں تُو جانتی ہے نہ میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں جیسے ہم پہلے سب ہنستی خوشی رہتے تھے کیا اب نہیں رہ سکتے ضروری ہے رنجشیں پالنا میں تیرا ہوں تیرا ہی رہوں گا۔ بس اس گھر کو ہنستا بستا کر دے تو ہماری بڑائی ہے۔'' ماجد اماں کے گلے لگ گیا تھا

ماجد کے پیچھے آتی نادیہ نے تشکر آمیز نظروں سے ماجد کو دیکھا تھا۔

وہ تو سمجھتی تھی کہ ماجد صرف ماں بہنوں کے کہنے میں رہتا ہے لیکن وہ اب جان پائی تھی کہ ماجد صرف فرمانبردار ہے اُس کا اخلاق اچھا ہے اور اُسے یقین تھا کہ اِس سے بہتر ہمسفر اُسے نہیں مل سکتا تھا اماں اور بہنیں الگ شرمندہ تھیں یوں کے جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔

☆......☆......☆

رات بھر شدید تکلیف میں گزارنے کے بعد اُس نے فجر کے وقت ایک بہت ہی خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

''یا اللہ تیرا شکر تُو نے مجھے چاند سا پوتا دیا۔'' اُس کی ساس حمیدہ نے ایک ہاتھ سے تسبیح سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنے پوتے کو لیا تھا۔

''ہاں! اماں دیکھ نہ میرے جیسا ہے نہ بالکل۔'' ماجد نے اماں کے کندھے پر سر رکھا تھا۔

''جی نہیں صرف تیرے جیسا نہیں بلکہ میری بٹی نادیہ اور تیرے جیسا ہے۔'' اماں نے جھک کے نادیہ کی پیشانی پر پیار کیا تھا اور ننھے منے کو نادیہ کے برابر میں لٹا دیا تھا۔ نادیہ نے بڑی ہی محبت سے اپنے مکمل گھر کو اور اُس خوبصورت منظر کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کیا تھا۔ ہر لڑکی پر سسرال میں شروع کا وقت مشکل ہوتا ہے جسے اپنی سمجھداری اور خوش اخلاقی وصبر سے گزارنا ہوتا ہے اور نادیہ نے بھی اپنی ماں سے یہی سیکھ سیکھی تھی۔ جس کی بدولت آج اس کی ساس بھی اس کی تھیں اور ماجد تو تھا ہی اس کا، زندگی اک خواب سفر لگنے لگی تھی۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

سید وجاہت علی

کیسے کہوں......!

''دیکھو نعمان......میں تمہارے جذبات کی قدر کرسکتی ہوں لیکن ہمارے مابین کسی جائز اور قانونی تعلق کا بھی بن جانا ممکن نہیں ہے۔'' اسماء نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔
''اس جملے کے بعد لامحالہ تمہارا پہلا سوال یہ ہوگا کہ کیوں......یہ کیوں ممکن نہیں......

دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتی، محبت کی ایک یادگار کتھا، ناولٹ کی صورت

وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے آسمان کی وسعتوں میں نظریں دوڑا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے جھلکتی اداسی اس کے اندر کے کرب کی مظہر تھی۔ وہ ٹیرس پر مضمحل قدموں سے چہل قدمی کر رہی تھی اور حسین شام بھی اس کی اداسی میں تخفیف نہیں کر پائی تھی۔

آسمان کی وسعتوں میں طیور اپنی آخری پروازیں لے رہے تھے۔ نرم ہوا میں خنکی اور کچھ کچھ تازگی تھی۔ ٹیرس کی شمالی سمت دور شام کے دھند لکے میں ڈوبی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور مغرب کی طرف افق تک پھیلا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ سرخ سورج دھیرے دھیرے اتر رہا تھا۔ ہوا میں سرایت شدہ خنکی آنے والے دسمبر کا پتا دے رہی تھی۔ نومبر کی دوپہر اور شامیں اسے بہت پسند تھیں لیکن اب اس کے لیے ان میں دلچسپی نہ رہی تھی۔ پاپا کی موت کے بعد اس کے لیے سب کچھ تبدیل ہو کے رہ گیا تھا۔ پچھلے سال یہی نومبر تھا اور ایسی ہی دسمبر کی اطلاع لاتی شامیں۔ اب بھی سب کچھ وہی تھا لیکن اس کے پاپا نہ تھے چناں چہ ان کی جدائی کا غم ہر لطف اور دلچسپی پر غالب آ گیا تھا۔

اسماء نے سوچا نہ تھا کہ اس کے پاپا وہاں چلے جائیں گے جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔

وہ منظر اس کے حافظے سے کبھی محو نہیں ہوسکتا تھا جب موت اس کے پاپا کو لے جا رہی تھی۔ اس کے سامنے پاپا کی زندگی کی ڈور کٹ رہی تھی اور وہ بے بس تھی۔

وہ پاپا کے ساتھ ہسپتال میں تھی۔ ان کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا لیکن پھر بھی انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ آخری لمحات تھے۔ پھر موت کا بھیانک سناٹا۔ ان کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ تکلیف کی وجہ سے ان کی آنکھیں یک دم باہر ابل پڑتی تھیں۔ انھوں نے اپنی تمام ہمتوں کے مجتمع کر کے اپنا دایاں ہاتھ

اٹھایا تھا اور کرب ٹپکتی نظروں سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ وہ اسماء کے سر پر ہاتھ رکھنا چاہتے تھے۔ اسماء نے تڑپ کر اپنا سر آگے کر دیا۔ انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر شاید وہ آسودہ ہو گئے۔ انھوں نے ایک ہچکی لی اور ان کی سانسوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

''نہیں ...... نہیں پاپا ...... نہیں۔'' وہ چیخ اٹھی تھی۔ ''آپ نہیں جا سکتے ...... کیا آپ اپنی اسماء کو چھوڑ جائیں گے ...؟؟ کیا آپ اپنی اکلوتی بیٹی کے آنسوؤں کا خیال نہ کریں گے ...؟؟ نہ جائیں پاپا ...... نہ جائیں ...... نہ جائیں۔''

لیکن کیا کبھی کوئی اپنی مرضی سے آیا اور گیا ہے؟؟ جانے والوں کے اختیار میں رک جانا ہوتا تو وہ ہزاروں سال تک رک جاتے۔

اسماء روتی رہ گئی اور اس کے پاپا مسافر عدم ہو گئے۔

پھر اس کے حواس بحال نہ رہے تھے۔ وہ بے ہوش ہو گئی اور اس کی آنکھوں کے آخری منظر میں اس کے مرحوم باپ' اور اس کی والدہ جو اسے تسلی دے رہی تھیں' کے چہرے تھے۔

پھر ہوش میں آنے کے بعد بھی اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ پاپا کی تجہیز و تکفین ہو گئی۔ سلسلہ ایام نہ رکا اور اب پانچ مہینے بیت گئے تھے۔ آج اسے پاپا بہت شدت سے یاد آ رہے تھے۔

اس کی آنکھیں اشک بار ہو کے دھندلانے لگیں۔ سارا منظر دھندلانے لگا اور دھندلکوں میں غرق شدہ وہ شام بھی مزید دھندلانے لگی۔

''پاپا ...'' اس کے منہ سے سسکی نکلی اور آنسوؤں نے اس کی پلکوں کی نازک گھنیری حدوں کو توڑ دیا۔

پھر یکا یک کسی نے اس کے گداز شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے لمس محسوس کر لیا کہ یہ اس کی سب سے عزیز دوست عینی ہے تاہم پھر بھی وہ چونک کر مڑی۔ عینی کے دونوں ہاتھوں میں چائے کے مگ تھے۔

''رو رہی ہو ...؟؟'' اس نے اسماء کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''میری آنکھیں اب شاید آنسوؤں کا مستقل ٹھکانہ ہو گئی ہیں ...'' اس نے اپنی انگلیوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

عینی نے چائے کا مگ پکڑایا اور اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''تاہم اپنے وجود کو قنوطیت کے حوالے نہ کر دینا۔ انکل کی موت ایسا صدمہ نہیں ہے جو تمہاری ہمتوں اور حوصلوں کو ریزہ ریزہ نہ کر دے لیکن پھر بھی تمہیں رجائیت سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے۔ موت سے مفر ممکن نہیں ہے۔ این المفر ......؟؟''

پھر اس نے اسماء کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی براجمان ہو گئی۔

''اس میں امکان قریب بالکل نہیں ہے۔'' اسماء نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تاہم بھی یہ حادثہ موت اتنی سرعت سے وقوع پذیر ہوتا ہے کہ انسان کے حواس قطعاً معطل ہو کے رہ جاتے ہیں۔ چھ مہینے قبل پاپا بالکل ٹھیک تھے اور لگتا نہ تھا کہ موت ان کی تاک میں ہے۔ اچانک وہ بیمار ہوئے اور چند دنوں میں ہی قزاق اجل نے انھیں اچک لیا۔''

''مجھے تمہاری کیفیت کا کسی حد تک ہی اندازہ ہے۔ جس کرب سے تم گزر رہی ہو' اسے تم ہی محسوس کر سکتی ہو تاہم تمہیں اپنی والدہ کی خاطر ہمت پکڑنی چاہیے۔ انکل تمہارے پاپا تھے تو ان

کے شریک حیات تھے۔ ان کی کیفیت زیادہ شدید ہے' اس کے باوجود وہ تم لوگوں کو حوصلہ دیتی ہیں۔ لاکھ چھپانے کے باوجود ان کا چہرہ ان کے اندرونی غم کا غماز ہے' پھر بھی وہ تم لوگوں کی ہمت بندھاتی ہیں۔''

اسماء نے دھیرے سے سر ہلایا۔ اس کی نگاہیں افق پر کہیں مرکوز تھیں۔

''ہمت کرو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

اسماء نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے اصرار پر ٹیبل سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''تم کب آئیں؟؟'' اس نے سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

''بس ابھی بھائی چھوڑ کر گئے ہیں۔ آج ایک بھی گاڑی نہیں تھی۔ میری کار جنید لے گیا ہے۔ میں نے بھائی سے درخواست کی تھی تو انھوں نے مجھے بہ مشکل یہاں چھوڑا ہے۔ ہمارے دونوں بھائی بھی انوکھے ہیں۔ ویسے سڑکیں ناپتے رہتے ہیں لیکن میں کہیں چلنے کی کہتی ہوں تو بہانوں کی پٹاری کھل جاتی ہے یا کبھی تو مروت بالائے طاق اور صاف انکار...... بہر حال مجھے اندازہ تھا کہ تم ٹیرس پر ہو گی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آنٹی نے مجھے چائے کے کپ تھما دیے۔''

''آہم...... اور تمہارا Thesis کہاں تک پہنچا...؟؟''

''چل رہا ہے...... یار اس Existentialism کا تو سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آخر کیرک گارڈ صاحب کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں؟؟ میں نے غلطی کی ہے اس موضوع کو لے کر...''

اسماء اور عینی کالج فرینڈز تھیں۔ ان کی دوستی کالج میں ہوئی تھی اور کالج میں ہی ان کی دوستی گہری ہو گئی تھی۔ یونی ورسٹی میں آ کر دونوں بہنیں محسوس ہونے لگی تھیں۔ اسماء نے ماسٹرز کو ہی بہت خیال کیا لیکن عینی نے آگے ایم۔ فل میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔

''مجھے بھی ماسٹرز میں logical positiveism پڑھتے ہوئے بہت کوفت ہوئی تھی۔'' اسماء دھیرے سے مسکرائی۔

''تمہیں Thesis کے لیے philosophical topics نہیں اٹھانے تھے۔''

''بس یار... یہ دراصل فلسفے کے عالمگیر انحطاط کا عرصہ ہے اور اس زوال پذیر دور میں Existentialism اور Logical Positiveism جیسے فلسفے حشرات الارض کی طرح ابھر رہے ہیں لیکن اپنی ناپائیداری کی بناء پر جلد یہ معدوم ہو جائیں گے...''

پھر چند لمحے توقف کے بعد اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''نعمان کی کال آئی تھی۔''

''اوہ...'' اسماء کے منہ سے نکلا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس کے عنابی چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

یک بارگی وہ چھ سال پیچھے چلی گئی۔ یونی ورسٹی لائف میں۔ یونی ورسٹی کا فرسٹ ائیر' سیکنڈ' تھرڈ' فورتھ ائیر...... انگلش ڈیپارٹمنٹ کلاسز کوریڈورز' لان کینٹین' اسائمنٹس' سمسٹرز...... تمام مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے گردش کر گئے تھے۔ کچھ لحظوں کے لیے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ گھر میں نہ ہو بلکہ ڈیپارٹمنٹ کے طویل کوریڈور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میں واک کر رہی ہو اور شاید اس لیے بھی کہ ٹیرس پر بھی عینی ساتھ تھی اور کوریڈور میں بھی ہمراہ ہوتی تھی۔ کتنے ہی لوگ اسماء کی نظروں سے مجروح ہونے کے لیے بے قرار رہتے تھے اور نعمان اس گروہ سے باہر نہیں تھا۔ وہ سب کے ساتھ تغافل برتا کرتی تھی اور ان میں بھی نعمان شامل تھا۔

وہ عام شکل وصورت کا لڑکا نہیں تھا بل کہ ڈپارٹمنٹ یا شاید یونی ورسٹی میں بھی اس کے مقابل کوئی نہیں تھا اور یونی ورسٹی کی خوب صورت ترین لڑکیاں اس سے راہ و راسم بڑھانے کے لیے بے تاب تھیں لیکن اس کی سوچیں اسماء کی زلف دراز میں الجھی تھیں۔ وہ تھی بھی ایسی ہی۔ کوہ قاف کی داستانوں کی پری سی۔

نعمان نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی لیکن وہ اس کی توجہ حاصل نہیں کر پایا تھا۔

یہ یونی ورسٹی کے ابتدائی دنوں کی بات تھی۔ عینی کسی سبب غیر حاضر تھی اور اسماء یونی ورسٹی کے لان میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا رجسٹر اور وینٹی بیگ پاس بینچ پر دھرے ہوئے تھے۔

''اسلام علیکم۔'' نعمان نے قریب آ کے اس مخاطب کیا تھا۔

اس نے چونک کر دیکھا اور قدرے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام۔''

اس کے لہجے میں اجنبیت تھی اور وہ سوالیہ حوصلہ شکن نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کسی لڑکی سے بات کی ہو اور اس نے ایسے انداز میں ٹریٹ کیا ہو لیکن اب ایسا ہی ہوا تھا اور ایک لمحے کے لیے پتا نہیں وہ کیوں گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

''دیکھیے مس...... میں بہ وجوہ گزشتہ دو دن غیر حاضر رہا ہوں۔ مجھ سے کلاسز مس ہو گئی ہیں۔

کل ٹنی سن کے حوالے سے مس صدف صدیقی نے جو لیکچر دیا ہے اس کے نوٹس مل سکیں گے؟؟''

''کیوں؟؟ کیا یہ ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے کہ آپ کے لیے نوٹس سنبھال کر رکھوں؟؟'' اس نے شعلہ بار نگاہوں سے نعمان کو گھورا تھا۔ ''کیا پینتالیس اسٹوڈنٹس میں آپ کو صرف میں ہی دستیاب ہوئی ہوں نوٹس کے لیے؟؟''

''نن......نہیں......'' نعمان بوکھلا گیا۔ ''لیکن ابھی تو آپ ہی سامنے ہیں۔ باقی فیلوز شاید آڈیٹوریم میں ہیں۔''

''تو آپ بھی آڈیٹوریم جانے کا کشٹ اٹھا لیں یا انتظار کیجیے۔ کیا اسٹوڈنٹس کو آڈیٹوریم میں قید کر لیا گیا ہے جہاں سے وہ کبھی باہر نہیں آ سکیں گے؟ انتظار کیجیے۔ ابھی جلد یا بہ دیر پروگرام اختتام کو پہنچے تو تینتالیس کلاس فیلوز سے نوٹس کی بابت دریافت کر لیجیے گا۔ کسی محنت کش نے تو پوائنٹس نوٹ کیے ہوں گے۔''

''اچھا۔ ٹھیک ہے۔ ویسے...... آپ نے اس پروگرام میں شرکت نہیں کی؟؟ کیا آپ کو اس موضوع سے دلچسپی نہیں ہے؟؟'' اس نے جھجکتے ہوئے دوسرا سوال کیا تھا۔

''فی الحال مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے کہ ایک غیر متعلق شخص کے سوالات کا جواب دوں۔ مسٹر نعمان......راہ و رسم بڑھانے کے یہ طریقے اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔''

''تو آپ کوئی طریقہ جدید بتا دیجیے۔'' نعمان نے سر کھجایا تھا۔

لیکن اس نے کوئی طریقہ بتانے کی بہ جائے اپنا بیگ اور رجسٹر سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

نعمان اسے جاتا دیکھتا رہ گیا تھا تاہم اس کے لیے یہ قابل اطمینان بات تھی کہ وہ اس کا نام جانتی ہے۔
دوبارہ پھر کئی دفعہ نعمان نے سلسلہ تکلم قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسماء کا رویہ ہر بار پہلے سے زیادہ ولولہ شکن ہوتا تھا۔
وہ مسلسل ناکام رہا تو حوصلہ کر کے اس نے دریافت کر ہی لیا۔
''آخر آپ مجھ سے اتنی متنفر کیوں ہیں؟؟ کیا میں کوئی سر کٹا انسان ہوں یا میں قطب شمالی کا باشندہ ہوں اور آپ کا تعلق قطب جنوبی سے ہے؟؟ بتایئے؟؟''
اس کے انداز میں بہت جھنجلاہٹ تھی۔
اسماء کو ہنسی آ گئی تھی لیکن وہ اپنا قہقہہ ضبط کر کے سنجیدگی سے بولی تھی۔ ''ہر لڑکی کسی لڑکے سے دوستی کی خواہاں نہیں ہوتی۔''
''تو میں بھی محض دوستی کا خواہش مند کب ہوں؟؟''
''whatever میری نفی اثبات میں تبدیل نہیں ہو سکے گی۔''
نعمان کے دانت بھینچ گئے تھے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بے بسی سے بولا تھا۔
''سبب بتاؤ گی؟؟''
''اچھا..... پہلے آپ بتائیں کہ صرف میں ہی کیوں؟؟ آپ کی اتنی لڑکیاں راہ تکتی ہیں...''
نعمان نے دائیں بائیں دیکھا' پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
''مجھے صرف تم اچھی لگتی ہو..... کیوں کہ..... کیوں کہ..... مجھے تم سے..... محبت ہو گئی ہے...''
اس نے اسماء کی آنکھوں سے نظریں ہٹا لی تھیں۔ وہ سامنے ایستادہ دیودار کے درختوں کی شاخوں کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔
''واقعی...'' اب اسماء نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے انداز میں بے یقینی تھی' نرمی تھی۔ ایک لمحے ابھر کے معدوم ہو جانے والی چمک تھی۔ وہ متحیر تھی۔ اسے نعمان کی آنکھوں میں بے قراری اور خلوص نظر آیا تھا۔
''ہاں......'' نعمان نے سر ہلایا۔ اس کی نگاہیں اب بھی پتوں پر جمی ہوئی تھیں۔
''مجھے آپ سے اس درجے کی عقل مندی کی توقع نہیں کی تھی۔'' اسماء کی آواز میں دوبارہ طنز بھری اجنبیت جھلکنے لگی۔
ان دونوں کے درمیان میں چند ثانیوں کے لیے خاموشی پھیل گئی۔ نعمان کو یہ چند لمحے برسوں پر محیط محسوس ہوئے تھے۔
''دیکھو نعمان...... میں تمہارے جذبات کی قدر کر سکتی ہوں لیکن ہمارے مابین کسی جائز اور قانونی تعلق کا بھی بن جانا ممکن نہیں ہے۔'' اسماء نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔ ''اس جملے کے بعد لامحالہ تمہارا پہلا سوال یہ ہو گا کہ کیوں...... یہ کیوں ممکن نہیں ہے؟؟ درحقیقت ہمارے اور تمہارے سٹیٹس میں بہت فرق ہے۔ ایک بڑی خلیج ہے جس کو تم نہیں پاٹ سکو گے۔ میرے گھر والے بھی نہیں مانیں گے......اور میں نہیں چاہتی کہ جہاں رشتہ ازدواج ممکن نہ ہو' وہاں کسی بھی نوعیت کے تعلقات استوار کیے جائیں...''
وہ دیودار کے پتوں سے نظریں ہٹا کر ٹیولپ کے پھولوں کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حسرت تھی' آرزو تھی۔ خواب تھے۔
اس کا تعلق لوور مڈل کلاس سے تھا جب کہ اسماء متمول گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے

والد ایک اچھے گورنمنٹ ڈپارٹمنٹ میں سیکریٹری تھے۔ کلاسز شروع ہوئے کئی دن گزر چکے تھے۔ تمام سٹوڈنٹس باقاعدہ آ رہے تھے۔ چناں چہ سب ایک دوسرے کے بارے میں اچھا خاصا جان گئے تھے۔ نعمان کے گھریلو پس منظر سے اسماء آشنا ہو چکی تھی۔ شاید عینی نے کسی سے سن کر اسے آگاہ کیا تھا۔

نعمان کے والد ایک کلرک تھے۔ خود نعمان ٹیوشن پڑھا کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر رہا تھا۔ وہ خوب صورت اور ذہین تھا۔ اس کی خوب صورتی اور ذہانت کے پردوں میں اس کا مالی پس منظر چھپ جایا کرتا تھا۔ لوگ اس کی قدر کرتے اور اس سے الفت محسوس کرنے لگتے تھے۔ بہتیری لڑکیوں نے اس کی زندگی میں آنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ سب سے کنارہ کش رہا لیکن اسماء کو دیکھ کر وہ اس وادی مجنوں و فرہاد میں گرنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکا۔

اسے اسماء کے رویے اور انکار سے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اسے ایسی لڑکی تصور نہیں کرتا تھا جو مادی اقدار کو اس قدر اہم خیال کرتی ہو۔ نعمان نے یہ سوچا تھا کہ جب وہ اقرار محبت کرے گا تو اس کی شقاوت محبت میں نہ بھی بدلی تو کم از کم اس کا دل ضرور پسیج جائے گا۔ پتا نہیں اس کی سوچوں میں ارتعاش ہوا تھا یا نہیں لیکن انکار اس نے دو ٹوک کر دیا تھا اور نعمان ہکا بکا کھڑا تھا۔ ٹوٹے دل کے ساتھ' ٹوٹی سوچوں کے ساتھ۔ شکستہ خوابوں کے ساتھ' شکستہ توقعات کے ساتھ۔

''حالات ایک جیسے تو نہیں رہتے اسماء۔ حالات ضرور بدلتے ہیں۔ ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں۔ مجھے ایک چانس تو دو پلیز...'' اس نے ٹوٹی امیدوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید میں سی۔ ایس۔ ایس کر جاؤں یا لیکچررشپ ہی مل جائے۔ پھر تمہارے گھر والے معترض نہ ہوں گے۔''

''ہاں لیکن یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا تم سوچ رہے ہو' ایسا نہ ہوا تو میرے اور تمہارے دونوں کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ قربت کے بعد جدائی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے اور میں اس تکلیف سے گزرنے کی آرزومند نہیں ہوں۔''

اسے لان کا فرش پیروں سے نکلتا محسوس ہوا اور سامنے انگلش ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور کے ستون لرزتے نظر آئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرے پھیل رہے تھے۔

''پلیز مجھے ایک موقع دو...... کیا پتا یہ دیواریں منہدم ہو جائیں...... پلیز...'' نعمان نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا۔

''سوری...'' اسماء نے دھیرے سے کہا تھا اور مڑ گئی تھی۔

نعمان اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔ یہ اس کی زندگی کے حیران کن لمحات تھے۔ تکلیف دہ پل تھے۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اسے رد کیا جا چکا ہے۔

''you Are being rejected Mr. Noman'' (تم مسترد کیے جا چکے ہو مسٹر نعمان)۔ اس نے بہت دکھ سے اپنے آپ سے کہا تھا۔

وہ ساکت تھا۔ اسے اب اپنی بکھر جانے والی خواہشوں کو سمیٹنا تھا۔ ٹوٹ جانے والے خوابوں کو جوڑنا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بھیگتا محسوس کیا۔

☆......☆......☆

اس کے بعد بھی اس نے کئی مرتبہ کوششیں کی تھیں لیکن ہر بار اسماء کا ردعمل پہلے سے زیادہ سخت اور تلخ ہوتا تھا۔ وہ اجنبیت کی دیوار' وہ سٹیٹس کا فرق زمیں بوس نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر جب ایک روز ایسا ہوا تھا کہ اسماء اس کے ساتھ بہت بری طرح پیش آئی تھی تو گھر آ کر وہ ہچکیوں سے رویا تھا۔ اسے روتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا ورنہ اسے پاگل خیال کرتے۔ پھر یہ آخری بار ہی ثابت ہوا تھا۔ اس نے کبھی دوبارہ سعی نہ کی۔ اب اس کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔

نہ وہ اسماء کو قائل کر سکا تھا۔ نہ اس کا خیال دل سے جھٹک ڈالنے میں کامیاب ہوا۔ اسے کس سنگ دل لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔ کس پتھر قلب پری پیکر کو اس نے منتخب کیا تھا جس کے گرد کھڑی اجنبیت اور تفاوت کی دیواریں مسمار کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اب اس کی توجہ اپنی سٹڈی اور کیریئر پر مرکوز تھی۔ اس دن جھڑکے جانے کے بعد اس نے دوبارہ بات نہ کی۔ اس کی طرف کبھی نہیں دیکھا۔ یونی ورسٹی کے دن گزرتے رہے۔ ان کے درمیان میں نامانوسیت کی دیواریں فربہ ہوتی رہی تھیں لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کلاس کے دوران میں نعمان محسوس کرتا کہ کوئی اسے گھور رہا ہے۔ وہ نظریں دوڑاتا تو اسماء کی نظریں اپنے آپ پر مرتکز پاتا تھا مگر جب دونوں کی نظریں متصادم ہوتیں' تو اسماء تجاہل کے ساتھ نظریں پھیر لیتی۔

وہ سوچتا کہ ایسا کیوں ہے؟ وہ کیوں کر میری طرف ایسے معصومانہ انداز میں دیکھ رہی ہوتی ہے؟ کیا اس کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو گیا ہے؟ لیکن وہ مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتی' پھر نہاں خانہ خیال میں نرمی کا چہ سوال است؟؟

''تمہاری خام خیالی ہے نعمان بیٹا...... اس خوش فہمی کو دریا برد کر دو ورنہ تمہارا توسن خیال قدم قدم پر لڑکھڑاتا رہے گا۔''

وقت اپنی چال چلتا رہا۔ سیمسٹرز گزر گئے۔ چار سال پورے ہو گئے۔ ان کے بیچ کے پاس آؤٹ ہونے کا وقت آ گیا۔ فائنل رزلٹ آیا تو نعمان کی اول پوزیشن بن رہی تھی۔ سب نے اسے مبارک باد دی۔

اور پھر یونی ورسٹی کے آخری دن الوداعی پارٹی میں اسماء اور عینی بھی شریک تھیں تو اسماء اسے تہنیتی الفاظ کہنے آئی تھی۔

''آپ کو فرسٹ پوزیشن مبارک ہو۔ مجھے امید تھی کہ اس بیچ کے کانووکیشن میں ہمارے ڈپارٹمنٹ کا گولڈ میڈل آپ کو ہی ملے گا۔'' اسماء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

نعمان کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی تھی۔

''بہت شکریہ۔'' نعمان کے منہ سے نکلا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اسماء کے سامنے کنفیوژڈ ہو جاتا تھا۔ اس کی وہ ہی حالت ہو رہی تھی جو پہلی دفعہ اقرار محبت کرتے وقت ہوئی تھی۔ اسماء اور اس کے درمیان میں خواہ کتنی وسیع خلیج رہی ہو لیکن بہر حال وہ اس سے محبت کرتا تھا اور اب تک کرتا تھا۔ اسماء کے روبرو اس کے دل میں وہ ہی موجیں مچلنے لگتی تھیں۔ اپنائیت' فکر' محبت' وہ ہی گداز جذبات وہ ہی بہار کے ابتدائی دنوں جیسے احساسات۔ آج وہ خوب صورت بھی کہیں زیادہ لگ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے بچپن کی کہانیوں کی کوئی پری اتر آئی ہو جو ابھی چلتے چلتے غائب ہو جائے گی۔

''میری شاید کانووکیشن میں شرکت نہ ہو سکے' اس لیے سوچا کہ ابھی وِش کر دوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

'' شکریہ...... لیکن خیریت...... کانووکیشن میں عدم شرکت......؟؟''

''پرسوں میری اسلام آباد روانگی ہے۔ وہاں سے جلد واپسی ممکن نہیں ہے۔ مجھے عدم شرکت کا افسوس رہے گا......''

پتا نہیں کیوں اس کے لہجے میں اتنی نرمی تھی یا یہ محض نعمان کی خوش فہمی پر مبنی خیال آرائی تھی۔

''اچھا......'' کہتے ہوئے وہ پھر سے خواہشوں کے تانے بانے بن رہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی پھیل گئی۔ عینی باری باری ان دونوں کو معنی خیز انداز میں دیکھ رہی تھی۔

''خوش رہیے۔'' پھر اسماء نے آہستہ سے کہا تھا' ایک لمحے کے لیے نعمان کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور پلٹ گئی تھی۔ عینی کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی تھی۔

نعمان ان دونوں کو جاتا دیکھتا رہ گیا۔ اس لمحے جب اسماء نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس پر نظر ڈالی تھی تو اسے ان نظروں میں شناسائی' اپنائیت اور محبت کی لہر محسوس ہوئی تھی لیکن یہ سب صرف ایک لمحے کے لیے تھا۔ اس ایک ثانیے کے بعد پھر وہ ہی چار سالوں پر محیط اجنبیت کے ناقابل عبور سمندر۔ وہ کسک کے ساتھ اسے تکتا رہا۔

اسماء آج اس دن سے کہیں زیادہ حسین دکھ رہی تھی جب نعمان نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

''کیا واقعی اسماء میرے مقدر میں نہیں ہے؟؟'' نعمان سوچ رہا تھا۔ ''کیا یہ پری پیکر وجود کسی اور کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے؟؟''

اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ وہ کسی اور کے ساتھ اس کے ہونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ خیال اس کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ اگرچہ اب اس کا اسماء کا مل جانا اس نے ناممکن طے کر لیا تھا لیکن کسی دوسرے کے ساتھ اس کا ساتھ...... یہ سوچنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

اس کے منہ سے سرد آہ نکلی۔ وہ اندر ہی اندر سلگ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

''کیا کہہ رہا تھا نعمان؟؟'' اسماء نے پوچھا۔

''انکل کے انتقال کی تعزیت کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اسماء حساس لڑکی ہے۔ اللہ پاک اسے صبر عطا فرمائے۔ نعمان کا سی ۔ایس۔ ایس ہو گیا تھا۔ تھرڈ پوزیشن آئی تھی۔ ابھی کچھ دنوں قبل ہی والٹن سے لوٹا ہے۔ پی۔ اے۔ ایس گروپ میں Allocation ہوئی ہے۔ ہم نے بہت تفصیل سے گفت گو کی تھی۔ میرا نمبر اس نے عنبر سے لیا تھا۔''

''اچھا...... چلو اچھی بات ہے۔ اور کیا کہہ رہا تھا...؟؟''

''بہت باتیں ہوئیں لیکن...... تم کیوں پوچھ رہی ہو...؟؟'' عینی نے یکایک ہونٹ سکوڑ لیے تھے۔ ''تمہیں کیا مطلب...؟؟ تمہیں کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے......''

اس کا لہجہ قدرے غصیلا ہو گیا تھا۔

اسماء جس طرح نعمان کو مسترد کرتی آئی تھی' عینی کے لیے ششدر کن پہلو تھا۔ وہ اس کی سب سے قریبی دوست تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا تھا۔ اس نے اسماء کو سمجھانے کی بہت کوششیں کی تھیں۔ بہت دلائل دیے تھے لیکن وہ اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ اس موضوع کے سبب اکثر ان

میں تلخ کلامی بھی ہوئی تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

''کیوں...؟؟''

''جب تم نے اسے رد کر دیا تھا تو تمہیں اس کے متعلق پوچھنے کا حق نہیں ہے اسماء...... محض اسٹیٹس کے سبب تم نے اسے ٹھکرایا تھا' پھر اب کیوں اس کے متعلق سوال کر رہی ہو...؟؟''

اسماء کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ چائے کا کپ خالی ہو چکا تھا لیکن وہ خیالوں میں تھی کہ کپ میز پر رکھنا ہی بھول گئی تھی۔ وہ خالی کپ ہاتھ میں لیے دیوار تک چلی گئی۔

سورج نصف سے زیادہ چھپ چکا تھا۔ اس کی زرد کرنیں مزید مدھم ہوئی جا رہی تھیں۔ سطح سمندر پر زرد چادر پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے آشیانوں میں لوٹ چکے تھے۔ وہ ذکر مساء میں مصروف تھے۔

اسماء دور افق کو تکنے لگی۔

''کیا تم بھی یہ ہی سمجھتی ہو؟؟ اور تمہارے پاس ایسا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔'' وہ بہت اداس لگ رہی تھی۔

عینی اس کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔

''وہ دیکھو...... سورج ڈوب رہا ہے۔ شاید کسی دن میں بھی افق کے پار جا بسوں...... لیکن پھر بھی میں تمہیں نہیں سمجھا سکوں گی کہ میں نے وہ سب کیوں کیا تھا؟'' وہ گم سم لہجے میں بول رہی تھی۔ ''کبھی ہم لاکھ کوششوں کے باوجود دوسروں کو وہ سب سمجھانے میں ناکام رہتے ہیں جو ہم اپنے خیالوں کے پس منظر میں درست سمجھتے ہیں۔ شاید میں غلط تھی اور یقیناً میں غلط تھی لیکن...... لیکن میں کیا کہوں...؟؟ انسان کے فیصلے ہوتے ہی ناقص ہیں...''

''میں سمجھی نہیں...'' عینی کو اپنے لہجے کی تلخی پر ندامت ہونے لگی۔ ''تم وضاحت کرو تو شاید میں درست رائے قائم کر سکوں...''

''کیا نعمان نے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی...؟؟'' اسماء نے وضاحت کرنے کی بہ جائے سوال کیا۔

''ہاں لیکن تعزیت کے علاوہ کوئی اور سبب نہیں...... تاہم وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اسماء کو اعتراض نہ ہو...''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم کل اسے میرے گھر بلا سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسے آگاہ کر دوں گی۔''

☆......☆......☆

نعمان ایک گھنٹے بیٹھا رہا۔ اسماء' اس کی والدہ اور عینی موجود تھیں۔ اس کے لہجے سے دکھ ٹپک رہا تھا۔ وہ بار بار خلوص سے اسماء اور اس کی والدہ کو تسلی دے رہا تھا۔ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر متانت آ گئی تھی جو اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔

اسماء کی والدہ اس کی ہر بات پر سر ہلا رہی تھیں۔ پھر جب وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا تو انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے جانے کے بعد حیرت زدہ لہجے میں اسماء سے کہا۔

''اتنا اچھا لڑکا ہے۔ تم نے اس سے قبل اسے گھر پر کیوں مدعو نہیں کیا؟؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وہ دن اور اگلا دن اداس گزرا۔ کبھی اسے اپنے پاپا یاد آتے۔ گزرے دن یاد آتے۔ یونی ورسٹی لائف یاد آتی۔ اب سب کچھ ماضی ہو گیا تھا۔ جو حال تھا' وہ ماضی میں تبدیل ہو گیا تھا اور اس ماضی کو حال میں تبدیل

کرنے پر کسی کو قدرت نہ تھی۔

اس کا ناسٹلجیا جاگ گیا تھا۔ یادیں گیلی لکڑیوں کی طرح سنگ رہی تھیں۔

اس روز وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اگلے دن بھی وہ یاسیت کے بھنور میں گھری رہی۔ وہ بہت اداس ہوئی تو ٹیرس پر آ گئی۔ وہ فضاؤں میں اڑتے پرندوں کو تکتی رہی۔ اس کا طائر خیال بھی ماضی کی طرف سفر کرتا رہا۔ پھر نومبر کی وہ اداس سہ پہر شام کے دھندلکوں میں تبدیل ہو گئی۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد اس نے عینی کو کال ملائی۔

''آج آئیں نہیں تم...''

''نہیں یار سوری...... تھیسز لکھ رہی تھی۔ میں نے خواہ مہ خواہ ایم فل لیڈنگ ٹو پھرا ہوا دماغ (Phd) میں ایڈمیشن لیا۔'' وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی تھی۔ ''میں بھی تمہاری طرح گھر بیٹھ رہتی۔ اب ہاں یار...... یہ کیرک گارڈ کا بچہ پتا نہیں کیا الٹا سیدھا لکھ مرا ہے۔ اتنی دقت ہو رہی ہے سمجھنے میں....''

''اچھا...... چلو اب تم فری ہو یا نہیں۔''

''ہاں...... اب تو فراغت ہے۔''

''او۔ کے۔ میں آ رہی ہوں۔ پھر کہیں چلیں گے۔''

''او۔ کے۔ آ جاؤ۔''

اسماء نے سلسلہ کاٹ دیا۔

چند لمحوں بعد وہ گاڑی نکال چکی تھی۔ دھیمی رفتار سے چلاتی رہی۔ پندرہ منٹ میں عینی کے گھر پہنچ گئی۔

''کہاں چلیں؟؟'' عینی گاڑی میں آ بیٹھی تو اس نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''فی الحال کسی ریسٹورنٹ چلتے ہیں۔ میں نے شام کی چائے نہیں پی آج...''

''ٹھیک ہے۔ پھر کسی پارک یا ساحل چلیں گے۔ اور کتنا رہ گیا ہے تھیسز...؟؟''

''جلد منہ پر ماروں گی۔'' عینی نے منہ بنایا۔ ''یار...... ہر سٹوڈنٹ نے ٹاپک اپنی مرضی کا لیا ہے لیکن میری باری آئی تو رونا دھونا ڈال دیا کہ نہیں ٹاپک ہم اپنی صوابدید پر دیں گے...''

''ایسے نہیں یار...... ٹیچر ہیں...... عزت کرنی چاہیے۔''

''رہنے دو...... مجھے پتا ہے کہ کیسے ٹیچر ہیں...'' اس نے سر جھٹکا۔ ''پڑھانے سے زیادہ انھیں سیلفیز بنانے اور بنوانے میں دلچسپی ہے۔ یونی ورسٹی نے انھیں بیرون بھیجا تھا تو روزانہ بیسیوں سیلفیز اپ لوڈ کرتے تھے جیسے یونی ورسٹی ان پر اتنا خرچہ اسی کام کے لیے کر رہی ہے۔ یہ لوگ رونا روتے ہیں کہ حکومت ایجوکیشن سیکٹر میں بجٹ کم رکھتی ہے لیکن جو بجٹ ہے' اس میں ہی کون سا انھوں نے کارنامے انجام دے دیے ہیں...؟؟''

''چلو... موڈ خراب نہ کرو...... ہر شعبے میں ہی صورت حال ابتر ہے...''

اسماء نے ایک کافی ہاؤس کے سامنے کار روک دی۔ پارکنگ ایریا میں پارک کرنے کے بعد دونوں نیچے اتر آئیں۔

اسماء نے کافی کا آرڈر دے دیا اور جب کافی آ گئی تو اس نے باتوں باتوں میں سرسری انداز سے پوچھا۔

''نعمان سے بات ہوئی تھی؟؟''

عینی دوبارہ چونک گئی تھی تاہم اس نے کوئی رد

عمل ظاہر نہ کیا اور سپ لیتے ہوئے بولی۔
''صبح ہی بات ہوئی تھی۔ دراصل میرے بھانجے کو سی۔ ایس۔ ایس کے حوالے سے ٹپس چاہیے تھیں۔ میں نے اس سے ذکر کیا تھا۔ اس نے اسی سلسلے میں کال کی تھی۔''
''اچھا......اور کیا گفت گو رہی۔؟؟''
''کرنٹ افیئرز پر گفت گو ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ اگر ملک میں بلدیاتی انتخابات نہ ہوئے تو سٹیفن ہاکنگ کے ساتھ مل کر خودکشی کرلے گا۔''
''مذاق سوجھ رہا ہے تمہیں...''
''میں اپنی سنجیدگی عدالت میں ثابت کرسکتی ہوں...''
''اچھا رہنے دو...''
''کیا...... عدالت میں اپنا موقف...''
''ارے نہیں...'' اسماء نے جھلا کر اس کا جملہ قطع کیا۔ ''مت بتاؤ کہ نعمان کی اور تمہاری اور کیا گفت گو ہوئی تھی...''
''اوہ......او۔ کے۔ ویسے......'' عینی نے اسے گھورا۔ وہ اب سنجیدہ ہوگئی تھی۔
''ویسے کیا...؟؟''
''تم آخر کیوں پوچھ رہی ہو؟؟ تم نے دوسری بار یہ سوال کیا ہے؟ تمہارا بار بار پوچھنا اور تمہارا یہ تجسس میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ کیا تم مجھے بھی آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھتی ہو؟''
''ایسی بات نہیں۔ بس یوں ہی...'' اسماء نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔
''یوں ہی......یا غریب نعمان اب سی۔ ایس۔ پی بن گیا ہے اس لیے...؟؟'' عینی کا نشتر بہت کٹیلا تھا۔
اسماء کو ایسے کاٹ دار جملے کی توقع نہیں تھی۔
اس کے دانت بھینچ گئے۔
''تم بھی مجھے ایسا خیال کرتی ہو؟؟ کم از کم تم سے یہ امید نہیں تھی...... میں تم سے اب کیا گلہ کروں...؟؟''
''گزشتہ چھ سال کے واقعات سے اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ اخذ نہیں ہوسکتا۔''
''او۔ کے۔'' اسماء نے بہت برہمی سے کہا تھا اور ان کے درمیان میں خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ وقفہ پھیلتا گیا حتی کہ کافی ختم ہوگئی۔
اسماء خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بل کی ادائیگی کے بعد دونوں کار میں آ بیٹھیں۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھما دی۔ گاڑی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ خلاف توقع وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہی تھی۔
''کہاں جارہی ہو؟؟'' کار کا رخ گھر کی طرف دیکھ کر عینی نے لب کشائی کی۔
''گھر...'' اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔
''کیوں؟؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ کسی پارک یا ساحل پر چلیں گے۔''
''مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں جانا ہے تو گاڑی لے جاؤ۔ میں ٹیکسی کرلوں گی۔''
ان کے درمیان میں دوبارہ سکوت پھیل گیا۔
تھوڑی دیر بعد عینی نے اس پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔ اس نے دایاں ہاتھ موڑ کر کہنی کار کے دروازے پر ٹکائی ہوئی تھی اور بایاں ہاتھ سٹیرنگ پر تھا۔ وہ مسلسل ونڈسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔
''سوری...'' عینی نے پہلو بدل کر کہا۔
''تم آخری فرد تھیں جس سے مجھے اتنے پست جملے کی توقع تھی۔ کیا تم مجھے مادہ پرست سمجھتی

ہو؟؟ لیکن اب توقع اٹھ گئی ہے۔ مجھے تم سے کسی بات کا شکوہ نہیں رہے گا۔''

''سوری...... یار تمہیں پتا ہے کہ میں کتنی منہ پھٹ ہوں...... گھر والے بھی مجھ سے پریشان رہتے ہیں۔ سوری پلیز... میرے الفاظ سخت تھے لیکن اچھا تم ہی بتاؤ' تم میری جگہ ہوتیں تو تمہاری رائے کیا ہوتی؟؟

یا تم مجھ سے اندر ہی اندر کسی نکتے کو چھپا رہی ہو...... جس کی وجہ سے میں صورت حال کا درست ادراک نہیں کر پا رہی ہوں؟''

''اٹس او۔ کے۔'' اسماء کے منہ سے نکلا۔'' ہاں تم مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں تمہیں جلد آگاہ کر دوں گی۔''

گھر پہنچنے تک ان کے مابین خاموشی رہی۔ عینی راستے بھر سوچتی رہی کہ نعمان کے متعلق دوبارہ پوچھنے کا سبب کیا ہے؟؟ کیا وہ نعمان کی طرف مائل ہونے لگی ہے؟؟

☆......☆......☆

اسماء منتظر رہی کہ نعمان اس سے رابطہ کرلے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اسے یہ توقع تھی کہ عینی دوبارہ نعمان کا ذکر چھیڑ بیٹھے گی لیکن یوں بھی کب ہوا؟ مجبوراً اس نے خود ہی دریافت کیا۔

''نعمان سے رابطہ ہوا تھا؟؟

''ہاں...''

''اچھا...... اب اگلی دفعہ بات ہو اس سے کہنا کہ مجھ سے بات کرلے۔'' اس نے کہہ ہی دیا تھا۔

''او۔ کے۔'' عینی نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔''میں کہہ دوں گی۔''

تین دن بعد نعمان کی کال آگئی تھی۔

''میں نعمان بول رہا ہوں۔ عینی نے مجھے آپ کا میسج دیا تھا۔ کیسے۔ خیریت...؟؟''

''یوں ہی...... میں کبھی کوئی کام بے سبب بھی کرلیتی ہوں...''

''ہاہاہا...... خوب منطق ہے۔'' نعمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔'' کبھی پوٹاشیم سائنائیڈ کا سفوف پیا ہوا کھوپرا سمجھ کر نہ پھانک لیجیے گا۔''

''میرے دماغ میں ابھی اتنا فتور وقوع پزیر نہیں ہوا ہے۔ ویسے میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟؟

''کر بھی لیتیں تو کیا تھا؟''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟؟ اب تمہارا وقت بہت قیمتی ہے سی۔ ایس۔ پی صاحب...''

''یوں ہی کہہ دیا...... کبھی میں بھی کوئی بات بے سبب کہہ جاتا ہوں...''

''ہاہاہا......'' اسماء ہنس پڑی۔'' پھر میں دعا کروں گی کہ تمہارے دماغ میں فتور واقع نہ ہو۔''

''اچھا...... آپ کی والدہ کیسی ہیں......'' نعمان نے قدرے سنجیدہ ہوکر کہا۔

''اللہ کا شکر ہے' ٹھیک ہیں۔ اللہ پاک نے انھیں ہمت اور حوصلے میں سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ امی نے ہماری بہت ہمت بندھائی۔ بہت حوصلے سے کام لیا۔''

''ویسے اس دن تم آئے تھے تو تمہارے جانے کے بعد تمہاری بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔''

''اوہ...... لیکن میں اتنا اچھا نہیں ہوں...''

''ہاں واقعی...... یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اسماء نے شرارتی لہجے میں کہا تھا۔

نعمان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

کچھ دیر وہ مزید باتیں کرتے رہے۔ پھر اسماء نے اسے ریسٹورنٹ پر کافی کی دعوت دی۔ نعمان نے اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے

ہوئے قبول کی اور اسماء نے سلسلہ کاٹ دیا۔
وہ ہکا بکا سیل فون کے ڈسپلے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔
'اسماء اس سے کیوں ملنا چاہ رہی ہے؟' تجسس نے اسے گھیر لیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بہت تیار ہو کر نہیں آئی تھی لیکن پھر بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ نعمان کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ آخر وہ واحد لڑکی تھی جس کے لیے اس نے کبھی دیدہ دل وا کیے تھے۔ اگر چہ ان کے درمیان میں الفت کا دو طرفہ تعلق کبھی استوار نہیں ہوا تھا اور اس پہلی محبت کی سلگتی یاد کو وہ کب کا بھلا چکا تھا لیکن بہر حال اب بھی وہ اس سے محبت کرتا تھا۔
وہ کافی ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آرڈر دے دیا تھا اور وہ دونوں گپ شپ کر رہے تھے۔
نعمان اس کے چہرے کی طرف دیکھتا اور جب وہ اس کی طرف دیکھتی تو وہ نگاہیں ہٹا لیتا۔
یونی ورسٹی میں وہ ٹین ایج تھی۔ اب کئی سال گزر چکے تھے لیکن اس میں اب بھی وہ ہی نزاکت اور تازگی جھلک رہی تھی۔ بل کہ پہلے سے زیادہ حسین معلوم دے رہی تھی۔ نعمان اب زیادہ پر وقار اور خوب رو معلوم ہو رہا تھا۔ اسماء وہ دل کش سا ٹین ایج لڑکا تلاش کر رہی تھی لیکن وقت اس لڑکے کو دور لے گیا تھا اور اب اس کے سامنے میچور سا نعمان براجمان تھا جس کے چہرے پر پھیلی متانت سے اس کی وجاہت فزوں تر ہو رہی تھی۔
''کیسی چل رہی آپ کی جاب سی۔ ایس۔ پی صاحب...؟؟''

''اچھی چل رہی ہے لیکن سیاسی دباؤ بہت ہے۔'' اس نے لمبی سانس کھینچی۔ ''اور پھر ہماری بیورو کریسی...... بڑا حصہ تو کرپٹ ہے۔ دیانت دار سی۔ ایس۔ پیز کو کام ہی نہیں کرنے دیا جاتا۔ کوئی صالح آفیسر حرام سے رکے اور روکے' فوراً دباؤ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بالا آفیسرز اور ماتحت...... سب ہی اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ پھر اسے او۔ ایس۔ ڈی بنا دیا جائے گا یا کسی دور دراز علاقے میں پوسٹنگ..'' وہ تلخ لہجے میں کہتا چلا گیا۔ ''میرا ایک دوست آر۔ ایف۔ او (رینج فاریسٹ آفیسر) ہے۔ کچھ دنوں قبل میری اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ بتا رہا تھا کہ حکومت کی زمین پر ایک شخص نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ وہاں کیلے کاشت کر رہا ہے اور فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کو کرائے کا ایک پیسہ ادا نہیں کرتا۔ کوئی اس حرام خور کے خلاف کارروائی کرنے پر آمادہ نہیں کیوں کہ وہ صوبائی گورنمنٹ کے وزیر کا سالا ہے۔ میرے دوست نے اب اس کے خلاف کارروائی شروع کی ہے لیکن پورا ڈپارٹمنٹ اس پر یخ پا ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ پورا ڈپارٹمنٹ حرام خور ہے۔ بہ جز استثناء۔ پورے پورے جنگلات کٹ رہے ہیں۔ ان کی لکڑی نا جائز فروخت ہو رہی ہے اور فاریسٹ ڈپارٹمنٹ لکڑی کے سپاہی کی طرح اس بربادی کو دیکھ رہا ہے۔ بس یار...... کیا بتاؤں...... ایسی ایسی ہوش ربا داستانیں ہیں کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے...''
''آہم...... بڑا دردناک فسانہ ہے...... تو اب تم کن خطوط پر سوچ رہے ہو؟؟ اس نظام کو قبول کر لو گے؟؟''
''ہرگز نہیں...'' نعمان نے تیزی سے سر

جھٹکا تھا۔ ''یہ اتنا تعفن زدہ نظام ہے کہ مجھے ابکائی آنے لگتی ہے۔ گو کہ میں اس کا حصہ ضرور ہوں لیکن میں اس نظام کو کبھی دل سے قبول نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری توانائیاں اس گلے سڑے نظام کی حفاظت کے لیے صرف ہوں۔ میں اپنی طاقت اور اہلیت اس سسٹم کو root out کرنے کے لیے استعمال کروں گا۔''

اتنے میں ویٹر نے کافی لا کر رکھ دی۔

اسماء نے کپ اس کی طرف سرکایا اور خود بھی دوسرا کپ اٹھا کر بولی۔

''لیکن تم کیا کر لو گے؟؟ کتنی گند صاف کر لو گے؟؟ تم تھک جاؤ گے نعمان لیکن اس بدبودار نظام کی گندگی صاف نہیں ہوگی... اسے جڑ سے کاٹنا ہوگا ورنہ اس فرسودہ نظام کے آکٹوپس کی طرح نئے بازو بنتے رہیں گے...''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو...'' اس نے سرد آہ بھری۔

اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ چہرے سے فکرمندی ٹپک رہی تھی۔

''اچھا...... یہ بتاؤ...... تم شادی کب کر رہے ہو...؟؟ رشتہ طے ہو گیا تمہارا...؟'' یکایک اسماء نے سوال کیا۔ شاید بہت جلد ہی اس نے پوچھ لیا تھا۔ نعمان کو امید نہیں تھی۔ شاید اس کو یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے یہ سوال بھی کر سکتی ہے۔ وہ متحیر رہ گیا۔ کئی سوالات اس کی سوچوں میں ابھر کے معدوم ہو گئے۔

''گھر والے لڑکی دیکھ رہے ہیں۔ سال کے اختتام تک متوقع ہے۔ لیکن کیوں...؟؟''

''گڈ۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی تھی۔ چند لمحات ان کے مابین خاموشی رہی۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کے درمیان میں وہ یونی ورسٹی ایئرز والی خلیج پھر سے ابھر آئی ہو۔ اسماء کے لب ہلے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن اس کے ہونٹ کچھ متحرک ہو کر ساکت ہو گئے۔

مگر وہ بات بہرحال اسے کرنی تھی۔

''کیا تم کسی ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جو ماضی میں تمہیں ٹھکرا چکی ہو؟؟ اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''کیا تم ایسے لڑکے کی درخواست قبول کر لو گی جس نے تمہیں کبھی تمہیں قبول نہ کیا ہو اور متعدد بار حقارت سے جھٹک دیا ہو؟؟'' جواب دینے کی بہ جائے اس نے سوال کر ڈالا تھا۔ اس کا انداز تبدیل ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس چمک کو کوئی عنوان نہ دے سکی۔ شاید وہ ایسی لہر تھی جو ایک فاتح کی آنکھوں میں فتح کے وقت ابھر آتی ہے۔

''پتا نہیں۔'' اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اسماء کے سوال کے بعد ماحول ہی بدل گیا تھا۔

''لیکن اسماء...... میں کبھی اس ہاتھ کو نہیں تھاموں گا جس نے میری محبت کی تذلیل کی ہو۔ اسے مال و دولت کے پیمانوں پر پرکھا ہو۔'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔ اسماء کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا جیسے نعمان کا دل اس وقت ڈوب رہا تھا جب وہ اسے ریجیکٹ کر کے جا رہی تھی۔ رد کیا جانا' ایک مرد کے لیے بہت تکلیف دہ عمل ہوتا ہے لیکن ایک عورت کے لیے؟ شاید اس سے بھی زیادہ۔ شاید درد زہ سے بھی زیادہ ریجیکٹ کیا جانا اس کے لیے اذیت ناک ہوتا ہے۔

''لیکن میں نے تمہارے جذبے کی تحقیر کبھی نہیں کی۔''

''تمہارے طرز عمل کو میں نے کبھی تحقیر کے علاوہ

کچھ اور نہیں سمجھا۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔''

''یہ ان حالات کا تجزیہ ہے جو مجھ پر بیتے ہیں۔''

''تو اگر اب میں تمہیں پروپوز کروں تو تمہارا جواب نفی میں ہوگا؟؟'' وہ کمزور سی آواز میں بولی تھی۔

''قطعی...... اس میں تمہیں بالکل شک نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے میں اب شگفتگی نہیں رہی تھی۔ وہ کافی کے کپ کو گھور رہا تھا۔ سپاٹ انداز میں جواب دے کر اس نے لب یوں بند کر لیے تھے جیسے اسماء وہاں سے اٹھ کر چلی گئی ہو۔ وہ وہاں موجود ہی نہ ہو یا اس کی موجودگی نعمان کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔ شاید اس کی نظروں میں وہ تمام مناظر گھوم رہے تھے جب اسماء بے حسی سے اسے ٹریٹ کیا کرتی تھی۔ وہ اپنے آپ کے سامنے ہی کتنا ذلیل ہوا تھا اس کے ہاتھوں۔ یونی ورسٹی کا سب سے خوبرو لڑکا اس کے پیچھے کتنا خوار ہوا تھا' اور اسماء نے اس کو کبھی قابل توجہ ہی نہ سمجھا۔

آج حالات بدلے ہوئے تھے اور وہ بھی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔

نہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اسماء نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ ان دونوں کے خیالات کی رو مخالف سمتوں میں بہہ رہی تھی۔ اسماء کو سب کچھ بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اب اس کو اس راز سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے نعمان کو مدعو بھی اس مقصد کے لیے کیا تھا۔

''تم کبھی یقین نہیں کرو گے کہ...... میں میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ''لیکن اس بات سے نہ تم واقف تھے نہ عینی کیوں کہ میں نے یہ راز چھپائے رکھا۔ میں مجبور تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے نعمان...''

یہ الفاظ نعمان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھے۔ کچھ دیر کے لیے وہ ششدر رہ گیا۔ اسے اس سوال کی امید نہیں تھی جو اسماء نے کیا تھا لیکن اس اقرار کی امید تو اسے اس وقت بھی نہیں تھی جب وہ اس کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ان الفاظوں کو سننے کے لیے وہ کتنا ترستا رہا تھا۔ لیکن اس نے بھی کس موڑ پر اقرار کیا تھا جہاں بے اعتباری کے اندھیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''یقیناً یہ حادثہ میرے سی۔ ایس۔ ایس کر جانے کے بعد ہوا ہے؟؟''

''تمہیں یقین نہیں ہو رہا؟؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''یقین کرنے کی کوئی وجہ ہوتی تو بھی میں یقین نہیں کرتا۔'' اس نے اس کے آنسوؤں کو اسی بے حسی سے نظر انداز کر دیا تھا جیسے چھ سال قبل وہ کیا کرتی تھی۔

'' کیا تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے سی۔ ایس۔ ایس کر لیا ہے تو میں تم سے محبت کا ڈھونگ رچا رہی ہوں؟؟'' اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

'' سی۔ ایس۔ ایس ایسا ہی calibre ہے۔''

''تم لوور مڈل کلاس والی باتیں کیوں کر رہے ہو؟؟ میری بہت سی فرینڈز لوور مڈل کلاس کی ہیں لیکن ایسی باتیں ان لوگوں نے بھی کبھی نہیں کی ہیں۔'' وہ اب سنبھل گئی تھی۔ '' تم سی۔ ایس۔ ایس کو کیا سمجھتے ہو؟؟ تم اریب علی کو جانتے ہو؟؟''

''ہاں کیوں؟؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس کا چونکنا فطری امر تھا۔

''اریب علی تمہارے ہی بیچ کا ہے۔ تمہاری تھرڈ پوزیشن رہی تھی' اس کی فرسٹ پوزیشن ہے اور مجھے اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کتنا ہینڈسم ہے' تمہاری ملاقات رہی ہوگی اس سے؟؟''

''ہاں ہاں۔ آگے تو بولو۔'' اس نے بے چینی سے کہا۔

''اس کا رشتہ آیا تھا میرے لیے۔ اس وقت جب وہ allocation کے بعد واشنگٹن جا رہا تھا۔'' اس نے بہت سادہ سے انداز میں بتایا اور اس نے یہ دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ نعمان کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو رہے تھے۔

''تم عینی سے اس بات کو کنفرم کر سکتے ہو۔ یہ رہا میرا اسیل فون۔ میری والدہ سے بات کر کے تصدیق کر سکتے ہو۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔ ''تم مجھے دولت اور عہدے کی ہوس زدہ سمجھتے ہو۔ کس کس کو حیرانی نہیں ہوئی تھی جب میں نے اریب علی کے رشتے کے لیے انکار کیا تھا لیکن کیا تم یقین کرو گے وہ انکار تمہاری وجہ سے تھا۔ سب نے مجھے سمجھایا تھا۔ پاپا نے بھی سمجھایا تھا لیکن انھوں نے مجھ پر زور نہیں دیا ورنہ انکار پر ڈٹ جانا میرے لیے ممکن نہیں رہتا۔''

وہ اب اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے چند لمحے قبل اس نے رعونت کے ساتھ نظریں پھیر لی تھیں۔ مگر اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''تم نے جو گری ہوئی باتیں کی ہیں' میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ نہ کروں اور یہ راز اپنے ساتھ لیے مر جاؤں۔'' وہ کہتی رہی۔ ''لیکن میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم لاعلم رہے ہو اور تمہارا ردعمل بڑی حد تک فطری ہے۔ تمہیں لاعلمی کا فائدہ دیا جا سکتا ہے۔ عینی کے طعنوں کو بھی میں اس لیے بھول جایا کرتی تھی کہ اسے بھی علم نہیں تھا اور شاید میں نے اسے لاعلم رکھ کر اس کے ساتھ ناانصافی کی کیوں کہ وہ میری سب سے اچھی دوست ہے۔ مگر اس سے چھپانا بھی ناگزیر تھا ورنہ وہ تمہیں ضرور بتا دیتی۔''

نعمان کی بے چینی میں اچھا خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات اٹھے تھے۔ اس کی سوچوں میں ہل چل مچ چکی تھی لیکن وہ اس لیے خاموش رہا کہ سلسلۂ کلام نہ ٹوٹے۔ اسماء اسے حقیقت بتانے ہی جا رہی تھی اور وہ اسے روکنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسماء کو اس کے تجسس کی پروا نہیں تھی۔

''میں نے تمہیں اس وقت دیکھا تھا جب تم نے مجھے نہیں دیکھا تھا اور مجھے اس وقت ہی تم سے محبت ہو گئی تھی جب تمہیں نہیں ہوئی تھی۔'' اس کے جملے نعمان کے لیے گرینیڈ سے کم نہیں تھے۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے قبل مجھے تمہارا پس منظر معلوم ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے پاپا کے متعلق ایک بہت بڑی غلط فہمی تھی جو اس وقت دور ہوئی جب وہ موت کے بہت قریب آ چکے تھے۔''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ نعمان بہت حیرت سے پلکیں جھپک رہا ہے۔ وہ اسے ماضی کا قصہ سناتے سناتے خود بھی ماضی میں گم ہو رہی تھی۔

''میں یہ سمجھتی رہی کہ پاپا Status

conscious ہیں۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ مغالطہ رہا کہ پاپا اپنے عہدے کے متعلق بہت حساس ہیں۔ اس ہی غلط فہمی کی کوکھ سے اس دوسری غلط فہمی نے جنم لیا کہ پاپا میری شادی کبھی ایسے شخص سے نہیں کریں گے جس کے پاس مال و دولت اور عہدہ نہ ہو۔ جو معاشرے میں فی الوقت رائج معیارات کے مطابق کم رتبہ سمجھا جاتا ہو۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی اور تم سے بات کرنے سے قبل ہی یہ خواہش میرے دل میں پیدا ہو چکی تھی کہ میں تمہیں اپنا شریک حیات بنالوں لیکن وہ Fallacy ایک پہاڑ کی طرح میرے سامنے آ کھڑی ہوئی کہ اگر پاپا نہیں مانے تو کیا ہو گا؟ مجھے تم سے بہت محبت تھی لیکن پاپا سے محبت کے آگے تمہاری محبت کی حیثیت ہی کیا تھی؟ میں نے اپنی خواہش اور محبت کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی لیے میں نے تم سے کبھی بات نہیں کی اور جب تم پہلی دفعہ مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے تو مجھے سنگ دلی دکھانے کے لیے اپنے دل پر بہت بڑا پتھر رکھنا پڑا تھا۔ پھر جب بھی تم نے مجھ سے بات کی، میں نے تمہیں جھڑک دیا تا کہ تم اس راستے پر آگے ہی نہ بڑھو۔ میرے لیے بہت مشکل ہوتا تھا یہ سب۔ تم ذہین بھی تھے اور مجھے امید بھی تھی کہ تم سی۔ایس۔ایس کر جاؤ گے۔ پھر شاید پاپا مان جاتے لیکن یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا؟ چار سال ہم ساتھ گزار دیتے اور تمہارا سی۔ایس۔ایس نہ ہوتا اور پاپا انکار کر دیتے تو ہمارے پاس اس کے سوا کیا ہوتا کہ ہم نے بغیر کسی جائز قانونی تعلق کے اتنا عرصہ ساتھ گزارا؟ ہمارے پاس تکلیف دہ پچھتاووں اور تکلیف دہ یادوں کے سوا کیا ہوتا؟ ساتھ گزارنے سے میری مراد کوئی اور تعلق نہیں ہے بل کہ وہ الفاظ جو کوئی اپنے شریک حیات سے ہی کہہ سکتا ہے؟ وہ اقرار جو کوئی اپنے شریک حیات سے ہی کر سکتا ہے؟ میں لڑکوں سے دوستی کی قائل نہیں رہی۔ چناں چہ کس بنیاد پر ہم چار سال ساتھ گزارتے؟ لیکن مجھے تم سے محبت تھی اور آج میں نے تم سے وہ الفاظ کہہ بھی دیے ہیں جو میں اپنے شریک حیات کے علاوہ کسی سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے تمہارے علاوہ کسی اور کو سوچا بھی کب تھا؟ میں نے کب سوچا تھا کہ تمہارے علاوہ کسی اور سے یہ سب کہوں گی۔ میں نے یہ ہی سوچا تھا کہ تم سے شادی ممکن نہ ہوئی تو کسی سے بھی نہیں کروں گی، اسی لیے میں نے اریب علی سے رشتے کے لیے انکار کر دیا تھا۔ پاپا نے مجھ سے انکار کی وجہ بہت پوچھی لیکن میں الٹے سیدھے بہانے بنا کر ٹالتی رہی۔

دن گزرتے رہے۔ پاپا بیمار ہو گئے۔ ان کی بیماری بڑھتی گئی۔ میرے لیے بہت تکلیف دہ وقت تھا۔ میرا باپ، جس کی انگلی پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا اور جس نے پھولوں کی طرح میری پرورش کی، بستر مرگ پر تھا۔ میں...... میں کیسے بتاؤں، وہ لمحات کیسے تھے؟''

وہ رک گئی کیوں کہ بولنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی اور آنسو پھر اس کی آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔

وہ دم بہ خود ہو کے سن رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا لیکن اسماء کا لہجہ اور اس کی آنکھیں جواب بھیگ چلی تھیں، اسے یقین کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ ساکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جانے پر وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا لیکن اسے اپنے حواس ساکن ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

''حوصلہ رکھو۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ پایا۔

''بہر حال...... جب پاپا علیل تھے تو انھوں نے مجھ سے میری شادی کے موضوع پر گفت گو کی تھی۔'' اس نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''میں جھجکتی رہی' ٹالتی رہی۔ مگر وہ بہت فکر مند تھے۔ ایک اریب علی کا رشتہ نہیں تھا جس کے لیے میں نے انکار کیا تھا۔ متعدد ایسے رشتے تھے جن کے لیے منع کرنے سے قبل کسی بھی کلاس کی لڑکی کئی بار غور کرتی۔ پاپا نے پھر ایک روز مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا تم کسی کو پسند کرتی ہو؟ کیا تم کسی کی راہ تک رہی ہو بیٹی؟؟''

میں پریشان ہوئی کہ پاپا کو کیا جواب دوں؟ اگر نہ کہتی تو اب تک جو رشتے آئے تھے' ان کے انکار کا کیا جواز پیش کرتی؟ آئندہ کوئی پروپوزل آتا تو کس بنیاد پر منع کرتی؟ اور پاپا کی بات کا ہاں میں جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

''واللہ...... میں نے آپ کی عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی پاپا۔'' میں بس یہ ہی کہہ پائی۔

''مجھے یقین ہے بیٹا......'' انھوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ ''لیکن کسی کو پسند کر لینا گناہ نہیں ہے۔ تم کسی کو پسند کرتی ہو یا کوئی بہ صد خلوص تمہارے ساتھ مل کر اپنا گھر بسانا چاہتا ہے تو تم مجھے بتاؤ بیٹا۔ تمہارا باپ اتنا ظالم نہیں ہے کہ اپنی بیٹی کی جائز آرزو پوری ہونے میں رکاوٹ بنے گا۔''

تب میں نے حوصلہ پا کر پاپا کو ساری بات بتا دی۔ میں نے انھیں تمہارے متعلق ساری تفصیلات بتا دیں۔ مجھے اب بھی اندازہ نہیں تھا کہ پاپا کا ردعمل کیا ہوگا۔

''مجھے نہیں معلوم بیٹا کہ میرے کس عمل سے میری بیٹی کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ اس کا باپ مادہ پرستی اور معاشرے کے موجودہ معیارات پر یقین رکھتا ہے۔ میری غلطی ہے بیٹا۔ شاید زندگی میں میرا طرز عمل ہی ایسا رہا ہے جس سے تمھیں یہ مغالطہ ہوا۔ یہ درست ہے میں اپنی بیٹی کے لیے ایسے ہی لڑکے کا انتخاب کرتا جو اسے تمام آسائشیں مہیا کر سکے لیکن اگر میری بیٹی کسی ایسے لڑکے کو پسند کرتی ہے جس کا مستقبل غیر یقینی ہے تو میں اپنی بیٹی کو اسے ٹھکرانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ تم چاہو تو کسی ذریعے سے اسے پیغام ارسال کر سکتی ہو کہ وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھیج دے۔''

پاپا کے ان الفاظ نے میرے اندر مسرت بھر دی تھی۔ میری کبھی کوئی خواہش رد نہیں ہوئی اور میں اس وقت بھی خوش قسمت ثابت ہوئی۔ جس شخص کو میں نے چاہا' اس کے لیے میرے گھر والے معترض نہ ہوئے۔ پاپا اگر بیمار نہ ہوتے تو میری خوشی بہت زیادہ ہوتی لیکن مجھے ان کی بہت فکر تھی۔ پاپا کی منظوری کے بعد میں تم سے کونٹیکٹ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پاپا کی خراب طبیعت کی وجہ سے میرا دل ہی نہیں چاہا۔ میں نے سوچا کہ پاپا ٹھیک ہو جائیں تو کسی نہ کسی طرح تم سے بات کروں گی۔ اس وقت میرے پاس تمہارا کونٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ مجھے تمہارے متعلق کچھ نہیں پتا تھا۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ تم کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ پاپا ٹھیک نہ ہوئے اور موت انھیں ہم سے بہت دور لے گئی۔ ان کے انتقال کے بعد عینی نے مجھے اطلاع دی تھی کہ اس کا تم سے رابطہ ہوا ہے۔ آگے کے واقعات تمہیں پتا ہی ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ نعمان بالکل ساکت تھا۔ اس کے لیے یہ سب آخری حد تک نا

قابل یقین تھا۔ وہ اس کو پری محسوس ہوا کرتی تھی اور اب یہ کہانی بھی اسے کوئی خواب ناک داستان محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اسماء کے لہجے میں' الفاظوں میں سچائی جھلک رہی تھی۔ اس کی بتائی ہوئی کہانی اسے کیوں سچ معلوم ہو رہی تھی' اس احساس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''مجھے...... مجھے یہ سب نا قابل یقین لگ رہا ہے۔'' اس نے خالی کپ کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔ ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟؟''

''ہاں میرے پاس ایک ثبوت ہے لیکن اگر تم اس کے بعد بھی یقین نہیں کرو تو پھر میں کسی بھی طرح تمہیں یقین نہیں دلا سکوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ بتاؤ۔ اس داستان کو سچ ثابت کرنے کے لیے کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟؟''

''مس صدف صدیقی...'' اس نے بہت دھیمی آواز سے کہا تھا اور آگے کچھ بولنے سے قبل نعمان نے شدید حیرت کی کیفیت میں اس کا جملہ قطع کیا تھا۔

''اپنی مس صدف؟؟ جو classical poetry پڑھاتی تھیں؟؟''

مس صدف صدیقی' جب وہ فورتھ ائیر میں تھے' انتقال کر گئی تھیں۔ بس اچانک ہی ان کی فوتیدگی ہوئی۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ پورا ڈیپارٹمنٹ بل کہ پوری یونی ورسٹی سکتے میں آ گئی تھی۔ اور ان کے سٹوڈنٹس کتنے ہی دنوں تک صدمے کی کیفیت سے نہیں نکل پائے تھے۔

''ہاں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ میں مس صدف سے بہت کلوز تھی۔''

''میں نے انھیں سب کچھ تو نہیں بتایا تھا لیکن کچھ باتیں بتا دی تھیں اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس راز کو کبھی افشاء نہیں کریں گی۔ انھوں نے وعدہ نبھایا۔ ان پر موت آ گئی اور وہ اس بھید کو چھپائے اس دنیا سے چلی گئیں۔ اب یہ راز تم پر آشکار ہوا ہے۔ میں نے یونی ورسٹی کے سیکنڈ ائیر میں ایک خط تمہارے نام لکھا تھا اور ان کے پاس امانتاً رکھوایا تھا۔۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا اب بھی ان کی پرسنل ڈائری میں رکھا ہوگا۔ اس میں اقرار محبت تھا۔ جو الفاظ میں نے آج تم سے کہے ہیں' وہ میں چار سال قبل ہی لکھ کر مس صدف کے پاس رکھوا چکی تھی۔ تم ان کے گھر جا کر درخواست کرو تو شاید ان کے شوہر تمہیں ان کی ڈائری دکھا سکتے ہیں۔''

''کیا واقعی؟؟'' اس نے اپنی حیرت کو محدود کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

پھر اسے مس صدف صدیقی کے گھر سے ڈائری مل گئی تاہم اس کے لیے اس کو اسماء کو ہمراہ لے جانا پڑا تھا۔ مس صدف کے شوہر اسماء کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی زندگی میں ہی وہ کئی بار ان کے گھر آئی تھی۔

''صدف نے ڈائری کے حوالے سے مجھے تاکید کی تھی کہ جب بھی اسماء دیکھنے کی خواہش ظاہر کرے' میں بلا تامل دکھا دوں۔'' انھوں نے اسماء کی درخواست کے جواب میں کہا تھا۔ ''ڈائری میں ایک چھوٹا سا لفافہ جو انھوں نے مجھے آپ کے حوالے کرنے کی تاکید کی تھی۔''

مس صدف نے اس پرچے کو لفافے میں لفافہ بند کرنے کی جگہ پر اپنے دست خط کر دیے تھے۔ تاکہ کوئی بھی حتیٰ کہ ان کے شوہر بھی اس تحریر کو نہ پڑھ سکیں۔

انھوں نے لفافہ لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا' معذرت کرتے ہوئے اجازت لی تھی اور چلے آئے

تھے۔

اسماء نے لفافہ نعمان کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ نعمان نے کار روک دی۔ وہ لفافہ کھول رہا تھا۔ اسماء بائیں جانب شیشہ کھول کر باہر پھیلی دھند کو دیکھنے لگی تھی۔ اسے اب پروا نہیں رہی تھی کہ نعمان کا ردعمل کیا ہوگا؟ اس نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب وہ کیا فیصلہ کرے گا' وہ اس متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے لفافہ کھول لیا تھا اور اب وہ برآمد ہونے والے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھی تحریر پڑھ رہا تھا۔

''نعمان

یہ تحریر لکھتے وقت میں جذبوں کی ان لہروں میں ہلکورے لے رہی ہوں جن کو تم محبت کہہ سکتے ہو بلکہ اس تحریر کا محرک ہی محبت ہے۔ میں تمہیں چاہنے کے باوجود بھی نہیں بتا سکتی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ مجبوری میں انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے؟ میں تمہیں اپنا شریک حیات منتخب کرنا چاہتی ہوں لیکن شاید یہ خواہش پوری ہونے کے لیے نہیں ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب تم مجھ سے بات کرتے ہو لیکن تمہیں جھڑک دینے پر میں مجبور ہوں۔ جب بھی تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی اور میں نے تمہیں جھڑکا' تو یقین تو کرو کہ میں گھر جا کر بہت روئی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن اپنے آپ کو مجبور پاتی ہوں کہ اس راز محبت کو اپنے وجود تک محدود رکھوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں؟ مجھے تم سے محبت ہے۔

اسماء''

نعمان نے تحریر پڑھ لی تھی۔ وہ اب دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ وہ تحیر سے اپنے برابر براجمان اس لڑکی کو دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ باہر ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ یہ جاننے کے لیے بھی نہیں کہ اس کے تاثرات کیا ہیں؟ وہ جھلملاتے ستاروں کو تکنے لگی تھی۔

وہ دوسری بار بھی پڑھ چکا تھا اور اب... اس کی کیفیت تبدیل ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے برابر میں وہ ہی فرسٹ ائیر والی اسماء بیٹھی ہو۔ اس کے اندر اپنائیت' فکر اور محبت کے وہ ہی جذبات بے دار ہونے لگے جو ان دنوں اسے گھیرے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ حیران تھا اس لڑکی پر۔ اس لڑکی کے محبت کے جذبے پر۔ اس لڑکی کی بے غرضی پر۔ اس لڑکی کی سادگی پر۔ اس سے کہیں زیادہ اس بات پر کہ اسے اس تحریر پر اور اس کی کہی گئی داستان پر یقین ہونے لگا تھا۔

وہ کتنی دیر سناٹے کی کیفیت میں رہا۔ پھر اس نے لب کھولے تھے۔

''سنو۔''

''یہ تحریر جس قلم سے لکھی گئی ہے' وہ اب مارکیٹ نہیں آتے ہیں۔'' سننے کی بجائے اس نے کہا تھا۔ ''یہ قلم صرف ان دنوں ہی آئے تھے۔ ایک مختصر عرصے کے بعد ہی اس کمپنی نے اس طرح کے قلم تیار کرنا بند کر دیے تھے اور صرف تین افراد وہ مخصوص قلم استعمال کرتے تھے۔ میں عینی اور تم۔ اس لیے تم یہ خوبی سمجھ سکتے ہو کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ تحریر حال ہی میں لکھی گئی ہو۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہی تھی۔ اس کا رخ اب بھی باہر کی جانب تھا۔

''تم اب بھی میری محبت اور اس تحریر کے سچ ہونے پر یقین نہ کرو تو میرے پاس کوئی اور طریقہ نہیں ہے' جس سے تمہیں یقین دلا سکوں۔''

''اگر میں کہوں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے تمہاری محبت اور اس تحریر کی سچائی پر' خلوص میں گندھے ان الفاظوں پر؟؟''

''دھند بڑھ رہی ہے۔ کیا تم مجھے گھر یا کسی

ایسی جگہ ڈراپ کر دو گے جہاں سے مجھے ٹیکسی مل سکے؟؟"

"ناراض ہو؟؟"

"آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟؟" اس نے اب تک نعمان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"سوری۔"

"آپ کو اس لڑکی سے سوری نہیں کرنی چاہیے جو محض آپ کے عہدے کی وجہ سے آپ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ سٹیرنگ پر مضبوطی سے جم گئے۔ وہ باہر پھیلی نومبر کی آخری راتوں کی دھند کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ دھند اس کے وجود پر چھا رہی ہو۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے؟؟ وہ حالات ہی ایسے تھے جب میں تمہارے بارے میں منفی سوچ اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ آخر تم بھی تو یہ ہی چاہتی تھیں کہ یہ ہی سوچ میرے دل و دماغ میں پرورش پاتی رہے۔ آخر غلطی بھی تو تمہاری تھی۔" وہ اپنے وجود پر پھیلتی دھند سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہیں اس بات پر شکایت ہے کہ میں نے تمہارے متعلق یہ کیوں سوچا کہ تم سی۔ ایس۔ ایس ہو جانے کے بعد مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟؟ تم بتاؤ' میں اس کے علاوہ اور کیا سوچتا؟؟"

وہ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا اور اس کی بات اتنی غلط نہیں تھی کہ وہ قائل نہ ہوتی۔

"لیکن پھر بھی میں سوری کرتا ہوں۔"

اسماء نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اسے محسوس ہوا جیسے آس پاس پھیلی دھند تحلیل ہو رہی ہو۔

"سوری پلیز..." نعمان نے دوبارہ کہا تھا۔

'نعمان کی بات ٹھیک ہے۔' اس نے نعمان کی سوری کا جواب نہیں دیا تھا لیکن دل میں سوچا تھا۔

"سوری یار..."

نعمان کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ مجبور ہوگئی۔ اس نے دھیرے سے پہلو بدلا تھا اور نعمان کی طرف دیکھا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟؟" نعمان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

وہ کچھ نہ بول سکی۔ وہ نعمان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"اگر تمہیں میری محبت کا یقین آگیا ہے تو میرا جواب وہ نہیں ہے جو یونی ورسٹی میں ہوا کرتا تھا۔"

نعمان کے سینے سے اطمینان آمیز سانس خارج ہوئی۔ اور اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"آخر مجھے محبت مل ہی گئی۔" اس نے خود سے کہا تھا۔

اگلے دن اسماء نے عینی کو ساری داستان سے آگاہ کر دیا تھا اور پھر مسلسل تین دن وہ عینی کو مناتی رہی تھی کیوں کہ وہ اس بات پر شدید ناراض تھی کہ اسماء نے اس سے وہ سب کیوں چھپائے رکھا۔ اس کی شکایت درست تھی۔ اسماء اس کو کم سے کم اس وقت ہی مطلع کر سکتی تھی جب اس نے نعمان کو حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ بہر حال اس کی مسلسل سوری سے عینی کی رنجش دور ہو گئی تھی تاہم وہ بعد ازاں وقتاً فوقتاً مصنوعی ناراضی دکھاتی رہتی تھی تا وقت یہ کہ اسماء اور نعمان کا نکاح نہیں ہو گیا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

فاطمہ خان

مقدمہ

''میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ دلاور صاحب...... میری ایک بیٹی بھی ہے۔ مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔'' امامہ نے چبا چبا کر اپنے الفاظ ادا کیے۔
حیرت ہے، تم ایک عدد شوہر کے ہوتے ہوئے ساری ساری رات مجھ سے فون پر......

کبھی کبھی زندگی ہمارے ساتھ بہت عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ ہم اپنی کامیابیوں کے زعم میں بہت آگے جا رہے ہوتے ہیں کہ زندگی اچانک ہمارے پیروں تلے سے زمین کھینچ لیتی ہے اور ہم منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔ ایسے میں ہماری حیرت ہی ختم نہیں ہوتی کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے ایسا سوچتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کا سبب ہماری ہی غلطیاں ہوتی ہیں جو ہر وقت ہمارے ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور جیسے ہی انہیں موقع ملتا ہے وہ اپنا کام کر دکھاتی ہیں۔

ایسا ہی کچھ امامہ منصور کے ساتھ ہوا تھا جسے اپنی وکالت اور کامیابیوں پر بڑا ناز تھا جو یہ سمجھتی تھی کہ منصور جیسے شوہر کے ہوتے ہوئے اُس کی گرہستی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بھلا منصور بھی اُسے چھوڑ سکتا ہے مگر جب منصور نے اُسے چھوڑا تو اُسے لگا کہ اُس روئے زمین پر اُس سے زیادہ بدقسمت کوئی لڑکی نہیں ہے۔

امامہ سے منصور کی محبت کی شادی تھی۔ وہ اُن دنوں اپنے گاؤں سے نیا نیا شہر منتقل ہوا تھا۔ زرعی سائنس میں ماسٹرز ڈگری مکمل کرنے کے بعد اُسے شہر میں ہی ایک سرکاری ادارے میں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اپنی زمینوں کے معاملات کے سلسلے میں اُس کا اکثر عدالتوں کا چکر لگتا رہتا تھا اور وہیں اُس کی حادثاتی طور پر امامہ سے ملاقات ہوگئی۔ اُسے امامہ کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اُس کے پُراعتماد انداز نے بھی بہت متاثر کیا تھا۔ امامہ خاندانی نوعیت کے مقدمات دیکھتی تھی جبکہ منصور کا معاملہ مختلف تھا اس کے باوجود وہ اپنی جائیداد کے ضمن میں اُس سے مشورے لینے لگا۔ اُس کی ذہانت اور قابلیت کے قصے وہ کئی دوسرے وکیلوں سے سن چکا تھا۔

چند ملاقاتوں کے بعد ہی اُس نے امامہ کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ امامہ کا تعلق ایک متوسط طبقے کے خاندان سے جبکہ منصور کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ اس لیے جب منصور نے رشتہ بھیجا تو اُسے نہایت آسانی سے قبول کرلیا گیا اور یوں تھوڑے ہی عرصے میں امامہ اور وہ ایک خوبصورت رشتے میں بندھ گئے۔

امامہ سے شادی کے بعد منصور کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کام کے معاملے میں کس قدر جنونی واقع ہوئی تھی۔ منصور نے شادی سے پہلے امامہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی وکالت پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کرے گا اور ہر طرح سے اُس کے ساتھ تعاون کرے گا مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہی وعدہ اُس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ شادی کے ایک سال بعد جب سحر اُن کی زندگی میں آئی تو انہیں لگا کہ اب وہ دونوں مکمل ہو گئے ہیں۔ سحر کی پیدائش کے بعد امامہ نے جب گھر پر توجہ دینی شروع کی تو منصور کو اطمینان ہوا کہ اب وہ گھر کو نظر انداز کرنے کی روش ترک کر دے گی مگر اُس کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا کیونکہ چند مقدمات جیتنے کے بعد امامہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

سحر کی دیکھ بھال کے لیے امامہ نے ایک بارہ سالہ بچی رخشندہ کو رکھ لیا تھا جس کے بارے میں امامہ کا فلسفہ تھا کہ کم عمر بچیاں زیادہ بہتر کام کر سکتی ہیں۔ سحر اب دو سال سے اوپر کی ہو چکی تھی مگر امامہ کی گھریلو معاملات سے لاتعلقی ہنوز برقرار تھی۔

اس کا چند ایک بار منصور سے جھگڑا بھی ہوا تھا مگر وہ اپنی روش پر قائم تھی۔ اس سے لاکھ اختلافات کرنے کے باوجود اُس کی کامیابیوں پر منصور کو فخر بھی ہوتا تھا مگر اب منصور تھکنے لگا تھا۔ امامہ کے کام کے جنون میں منصور اور سحر کتنے نظر انداز ہو رہے تھے۔ اس کا امامہ کو احساس تک نہیں تھا۔ منصور مرد تھا اور اُس کے سامنے اور بھی کئی راستے تھے۔ اب وہ انہی دوسرے راستے کی طرف دیکھنا شروع ہو گیا تھا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' امامہ جو اپنے کسی کیس کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھی۔ اُس نے آواز کی سمت دیکھا تو دلاور خان مسکراتی آنکھوں سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں موجود سرخ گلابوں کا گلدستہ دیکھ کر امامہ بھی مسکرانے لگی تھی۔ اُس نے سر اثبات میں ہلا کر اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ شہر کے متوسط علاقے میں واقع امامہ کا وہ چیمبر بھی اُن گلابوں کی خوشبو سے مہکنے لگا تھا۔ دلاور خان اب اُس کمرے میں موجود

اُسی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا جہاں وہ اُس سے پہلے بھی کئی بار بیٹھ چکا تھا۔ مگر اس بار جیت کی خوشی نے اُس کی شخصیت کو ہی بدل دیا تھا۔ گلدستہ اُس نے امامہ کی میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ مسلسل امامہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''اِس کی کیا ضرورت تھی؟'' امامہ نے ان گلابوں کی مہک اپنے اندر اُتارتے ہوئے کہا۔

''ضرورت کے لیے نہیں خوشی اور کامیابی کے لیے مس امامہ...... آپ نے میرا بیٹا مجھے واپس دلوا دیا ہے...... اُس دو نمبر عورت سے میری نسل کو بچا لیا ہے۔'' دلاور خان نے جذباتی انداز میں کہا۔

''میں اپنے ہر کیس پر بہت محنت کرتی ہوں مسٹر دلاور...... آپ نے اس کام کے لیے مجھے اچھا خاصا معاوضہ دیا ہے۔ ایمانداری سے کام کیا جائے تو نتیجہ بھی توقع کے مطابق ہی آتا ہے۔'' امامہ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

''آپ کی صلاحیتوں کے تو ہم قائل ہو گئے ہیں۔'' دلاور خان نے عجیب سی نظروں سے امامہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے میری کامیابیوں کو سراہا ہے ورنہ اکثر کلائنٹس تو مقدمہ جیتنے کے بعد ہمیں بھول ہی جاتے ہیں۔'' امامہ نے بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر امامہ کے پاس بیٹھنے کے بعد دلاور خان تو واپس چلا گیا تھا۔ مگر امامہ بہت دیر تک اپنی مداح سرائی کے حصار میں گم رہی۔ دلاور خان کے کچھ خوبصورت جملوں نے اُس کے اندر ایک عجیب سی طمانیت اُتار دی تھی۔

''آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں سر......'' منصور نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے اُس کی سیکریٹری کشمالہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اُسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بلاشبہ قیامت خیز حسن کی مالک تھی اور حسن تو وہ ہتھیار ہے جسے استعمال کر کے مضبوط مرد کو لمحوں میں ڈھیر کیا جا سکتا ہے اور کشمالہ اس ہتھیار کا استعمال بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے منصور کو اپنی طرف راغب کرنے میں اُسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ منصور کو تو امامہ کی بے اعتنائی نے اندر سے بری طرح توڑ رکھا تھا ایسے میں کشمالہ کی توجہ اُسے کسی ایسے مسیحا کی طرح لگتی تھی جو بہت نرمی سے اُس کے سارے زخموں کو آرام پہنچا رہی تھی۔

''میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ منصور کے تھوڑا اور قریب ہو گئی تھی۔ اُس کا قرب منصور کے حواسوں کو جیسے سلب کرتا جا رہا تھا۔

''مجھ سے شادی کر لو کشمالہ۔'' منصور نے خود سے ہار مانتے ہوئے کہا۔

''مگر سر......'' کشمالہ کے لیے یہ سب بہت حیران کن تھا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ منصور اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کر سکتا ہے مگر منصور تو بڑے بڑے فیصلے لمحوں میں ہی کر لیتا تھا۔

''میں خود سے لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں کشمالہ، امامہ کو مجھ سے نہیں صرف اپنے کام سے محبت ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' منصور نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ کشمالہ نے جواباً اپنی مسکراہٹ سے منصور کو اپنی محبت کا یقین دلایا تھا۔ زندگی اُس پر ایک دم اتنی مہربان ہو جائے گی۔ ایسا تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''مسٹر دلاور...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' امامہ نے ضبط کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ دلاور خان سے تو اب اُس کی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اعلیٰ حکومتی عہدے پر فائز تھا اور امامہ

نے اُس کے اثر و رسوخ سے کافی فوائد حاصل کیے تھے مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دلاور اس دوستی کا بہت غلط فائدہ اٹھائے گا۔

''اُس میں غلط کیا ہے...... میری اور تمہاری اتنی دوستی ہے۔ اگر میں تعلق کو کوئی نام دینا چاہتا ہوں تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔'' دلاور خان نے حیرت سے کہا۔

''میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ دلاور صاحب...... میری ایک بیٹی بھی ہے۔ مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔'' امامہ نے چبا چبا کر اپنے الفاظ ادا کیے۔

''حیرت ہے، تم ایک عدد شوہر کے ہوتے ہوئے ساری ساری رات مجھ سے فون پر باتیں کرتی رہتی ہو...... اور ابھی بھی تمہیں محبت ہے۔'' دلاور یہ کہتے ہوئے بہت بری طرح ہنس رہا تھا۔

امامہ واپس اپنے چیمبر آ گئی تھی مگر دلاور کے الفاظ اُس کے دماغ پر کوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ دلاور نے اُسے آئینہ دکھایا تھا جس میں اُس کی شکل اُسے بہت بھیانک نظر آ رہی تھی۔ اُسے اب گھر جانا تھا اپنے منصور کو منانا تھا۔ اس سے پہلے کہ دیر ہو جاتی اُسے اپنا گھر ہر حال میں بچانا تھا۔

کشمالہ سے شادی کا فیصلہ گو کہ منصور نے ایک جذباتی لمحے کی زد میں آ کر کیا تھا مگر اب اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ کشمالہ نے چند دنوں میں ہی ثابت کر دیا تھا کہ اُسے منصور کی ذات کے گرد گھومنا اچھا لگتا ہے اور منصور کو اُس کی انہی اداؤں نے مسحور کر رکھا تھا۔ شادی کے بعد چند دن ہوٹل میں گزارنے کے بعد اب منصور اُسے اپنے گھر لے کر جا رہا تھا۔ اُسے امامہ کے کسی ردِعمل کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کسی کی محبت نے اُسے بے خوف بنا دیا تھا۔ اپنی بیٹی کا احساس نہ ہوتا تو شاید وہ امامہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا مگر سحر کی خاطر اُس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کیونکہ بہر حال اُسے اپنی بیٹی عزیز تھی۔

☆......☆......☆

گھر میں داخل ہوتے وقت پہلی بار اُسے ایک عجیب قسم کا احساس ہوا۔ یہ گھر اتنا ویران تھا یا شاید اُسے لگ رہا تھا۔ نجانے گھر کو دیکھے اُسے کتنے برس بیت گئے تھے۔ سحر اُس وقت سو رہی تھی۔ اور منصور کے آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اُس کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ اپنے منصور کے لیے خود کو تیار کرے۔ اُس نے اپنی پسند کی ساڑھی نکالی جو شادی کے ابتدائی دنوں میں منصور نے اُسے تحفے کے طور پر دی تھی۔

پسندیدہ ڈنر اور کیک اور ساتھ ہی مناسب میک اپ کے ساتھ وہ تیار تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ امامہ ٹیرس سے اُسے گاڑی سے اُترتے دیکھ رہی تھی مگر منصور کے ساتھ ایک اور وجود کو دیکھ کر اُس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں وہ بھاگ کر ڈرائنگ روم میں گئی تو منصور اُس وجود کو لے کر اندر داخل ہو گیا تھا۔

''امامہ......'' اُس نے حیرت سے امامہ کی طرف دیکھا۔

''کیا کہیں جا رہی ہو۔'' منصور کے اجنبی لہجے نے اُسے بہت تکلیف دی تھی۔

''خیر...... ان سے ملو یہ میری بیوی ہیں اور اب یہ اُس گھر میں میرے ساتھ ہی رہیں گی۔'' منصور نے بہت عام سے انداز میں کہا۔

امامہ نے نم آنکھوں سے منصور کی طرف دیکھا۔ منصور نے بالآخر اُسے چھوڑ دیا تھا اور وہ امامہ جو اب تک کوئی مقدمہ نہیں ہاری تھی۔ اپنی زندگی کا اہم ترین مقدمہ بہت برے طریقے سے ہار گئی تھی۔

☆......☆......☆

ناولٹ

فرزانہ نگہت

دلنشین

"ایسی خوفناک حد تک بدصورت عورت کا ہر دم سامنا واقعی بڑے دل گردے کی بات ہے۔ لیکن علی وہ کیا واقعی اندھی ہے؟ اس کا سارا چہرہ اور سر جھلس گئے لیکن آنکھیں سلامت رہیں۔ یہ بات مجھے بے حد عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو اس کی آنکھوں سے......

"آخر کب تک اس منہ جلی تجی اندھی کے ساتھ گزارا کرتے رہو گے علی؟ سال بھر ہونے کو آرہا ہے۔ وہ نہ تمہارا پیچھا چھوڑ رہی ہے نہ مرنے کا نام لے رہی ہے۔ تم آخر اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی تدبیر کیوں نہیں کرتے؟" قریب سے آتی ہوئی وہ جھنجلائی ہوئی غصہ بھری آواز سن کر دلنشین کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ ایک دم زمین پر بیٹھ گئی۔ اس جگہ خوشبودار پھولوں سے لدی گھنی جھاڑیاں بکثرت اُگی ہوئی تھیں۔ وہ ان جھاڑیوں کے درمیان انچ انچ سرکتی ان میں اُگے ایک گھنے چوڑے تنے والے درخت کی آڑ میں ہوگئی۔ وہ اس آواز کو پہچان گئی تھی وہ شاہ گل کی آواز تھی اس کی بچپن کی عزیز از جان سہیلی کی جس کا گھر اس کی حویلی کے سامنے واقع تھا۔ اس کے خاندان کے اس کے خاندان سے سالہا سال سے دوستانہ تعلقات چلے آرہے تھے۔ درخت کے پیچھے دبک کر اس نے اس آواز کی سمت کان لگا دیے۔ اس وقت شاید علی شیر اور شاہ گل وہاں سے کچھ فاصلے پر جھاریوں میں موجود تھے۔ یہ بھی اللہ کا شکر تھا کہ انہیں وہاں اس کی آمد کی خبر نہ ہوئی تھی۔ ورنہ وہ اب جو کچھ سننے والی تھی وہ کبھی نہ سن پاتی۔

"میں آخر کیا کروں؟ اسے زہر دے دوں؟ اسے آگ لگا دوں؟ ذرا عقل کے ناخن لو۔ اسے کچھ ہوگیا تو سب سے پہلے مجھ پر ہی شک ہوگا۔ میں اس کا منگیتر ہوں۔ اس کی حویلی میں رہ رہا ہوں۔ اس کی بے اندازہ جائیداد اور مشکوک موت ...... یہ میری کیا پوزیشن بنا دیں گے۔" علی شیر کی آواز میں بے بسی اور جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

"تو میں آخر کب تک انتظار کروں؟" شاہ گل کی آواز غصہ بھری تھی۔

"وہ چڑیل تو ایسی ہٹی کٹی اور تندرست ہے کہ شاید عمرِ خضر ہی پا جائے۔ اس سے پہلے تو میں ہی قبر میں چلی جاؤں گی۔ کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ اس سے چھٹکارہ بھی مل جائے اور ہم بھی محفوظ رہیں۔"

"تمہیں معلوم ہی ہے اتنے عرصے سے میں برابر اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچتا آرہا

ہوں۔ سچ پوچھو تو اب میرا دل چاہنے لگا ہے کہ اس بھتنی کا گلا دبا دوں۔ اس کی خبر گیری کرتے اس سے جھوٹی محبت کا کھیل رچاتے۔ اب میرا تو پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا ہے۔

''ایسی خوفناک حد تک بدصورت عورت کا ہر دم سامنا واقعی بڑے دل گردے کی بات ہے۔ لیکن علی وہ کیا واقعی اندھی ہے؟ اس کا سارا چہرہ اور سر جھلس گئے لیکن آنکھیں سلامت رہیں۔ یہ بات مجھے بے حد عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو اس کی آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔''

''وہم ہے تمہارا تمام ڈاکٹر یہ فیصلہ دے چکے ہیں کہ اس کی آنکھیں ہر چند کے سلامت رہیں، ان کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ اچھا اب مجھے چلنا چاہیے وہ کہیں میری اتنی دیر کی غیر حاضری سے مشکوک ہی نہ ہو جائے۔''

دلنشین فوراً اپنی چھڑی سنبھالے درخت کے تنے کے عقب میں رہتے ہوئے انتہائی احتیاط سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اپنی حویلی کے چپے چپے سے وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واقف تھی۔ انتہائی احتیاط سے پیچھے سرکتے سرکتے وہ گھنے درختوں کے جھنڈ میں جا پہنچی۔ آگے قدِ آدم پھولدار پودوں کا ایک جنگل سا آتا تھا۔ وہ جھکے جھکے ان پودوں کے درمیان سے گزرتی حویلی کے ایک پہلو کی طرف جا نکلی۔ سامنے لمبے لمبے گھنے درختوں کی قطاروں کے آگے ایک وسیع صحن آتا تھا۔ اس میں سے گزر کر وہ مرمریں زینہ چڑھ کر ایک لمبے چوڑے برآمدے میں آ گئی۔ اس کے مرمریں ستونوں سے لپٹی پھولدار بیلیں ہوا سے ہلکورے لے رہی تھیں۔ وہ ان کے سائے میں رہتے ہوئے برآمدے میں آگے بڑھتی گئی۔ پھر ایک بند دروازے کے سامنے جا کر رُک گئی۔ یہ اس کے کمرے کا باہر چمن کے رُخ کھلنے والا دروازہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں دبی چابی اس کے قفل میں گھمائی۔

اور اسے کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ لاک کیا اور تیزی سے اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی اور چھڑی دیوار سے ٹکاتے ہوئے بستر پر لیٹ کر نرم و گرم کمبل اپنے شانوں تک کھینچ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے باہر کوریڈور میں مخصوص قدموں کی چاپ سنی۔ وہ اسے پہچانتی تھی، یہ علی شیر تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ دلنشین اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ علی شیر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بستر کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا اُسے دیکھتا رہا پھر مڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد دلنشین نے باہر پورٹیکو میں کار کا دروازہ بند ہونے اور اس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ شاید وہ کہیں جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ یہ کوئی پہلی مرتبہ نہیں تھی جب اس نے علی شیر اور شاہ گل کی باتیں سنی تھیں۔ وہ اس سے پہلے بھی بارہا اُن کی باتیں سن چکی تھی۔ ان کی باتوں کا موضوع اس کی ذات ہوتی تھی جس سے ان دونوں کو شدید نفرت تھی۔ جو ان کے ملاپ میں اک سنگِ گراں کی طرح حائل تھی۔ جسے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے وہ مسلسل منصوبے سوچتے رہتے تھے۔

اس نے بستر سے اترتے ہوئے دیوار سے لگی اپنی چھڑی سنبھالی اور اٹھنے ہی لگی تھی کہ پورٹیکو میں کسی کار کے رُکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی اس نے چھڑی دیوار سے ٹکائی اور بستر پر اوپر بیٹھتے ہوئے کمبل ٹانگوں پر کھینچ لیا۔ اس وقت اسے کوریڈور میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نپے تلے

بھاری قدموں کی چاپ وہ خوب پہچانتی تھی۔ یہ شاہ میر تھا اس کا پھوپی زاد بھائی، اس کے بچپن کا ہمجولی، اس کا پُرخلوص ساتھی، وہ بے پناہ مسرور ہو اٹھی۔ اس کی آمد پر اسے اسی طرح بے پناہ خوشی ہوا کرتی تھی۔ تسلی اور اطمینان بھی محسوس ہوتا تھا۔

پھر وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

''السلام علیکم نشی، کہو کیسی ہو؟ خیریت تو رہی نا؟'' اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح بے پناہ اپنائیت اور خلوص سے لبریز تھا۔

''ہاں میں بالکل خیریت سے رہی ہوں۔ تم تو بہت دنوں بعد آئے شاہ میر، کیا کہیں گئے ہوئے تھے؟''

''ہاں گاؤں...... بی بی جان کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ انہیں دیکھنے گیا تھا۔''

''اوہ...... اب کیسی ہیں پھوپی جان؟'' دلنشین نے مضطربانہ استفہام کیا اسے اپنی ان جان چھڑکنے والی پھوپی سے بے پناہ پیار تھا۔

''بالکل صحت مند اور تندرست ہیں۔ انہوں نے یہ کچھ چیزیں تمہارے لیے بھجوائی ہیں۔'' شاہ میر نے ایک بڑا سا لفافہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

''انہوں نے تمہیں بہت بہت دعائیں اور پیار کہا ہے۔ عائشہ بھی تمہیں بہت یاد کرتی رہی۔''

''کیسی ہے وہ؟ اس کا ایف اے کا رزلٹ کیا آ گیا؟''

''ابھی تک تو نہیں آیا۔ لیکن اسے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کا پختہ یقین ہے۔ اس کے بعد اسے انشاء اللہ فرنٹیئر کالج میں داخلہ مل جائے گا۔'' شاہ میر اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''وہ ماشاء اللہ بہت لائق بچی ہے۔''

''ہاں دیکھو بی بی جان نے تمہارے لیے کیا چیزیں بھیجی ہیں۔ تمہارے لیے سویٹر تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے۔''

''محبت ہے اُن کی۔'' دلنشین لفافہ کھول کر اس میں سے چیزیں نکالنے لگی۔ خوبصورت گرم شال، مخملیں سوٹ کا کپڑا، سویٹر......

شاہ میر سگریٹ کے کش لیتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ کار کے حادثے نے اس کے قیامت خیز حد تک حسین چہرے کو کس بری طرح بگاڑ ڈالا تھا۔ وہ جل کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کی کھال کھنچ گئی تھی جس سے وہ جھریوں بھرا دکھائی دینے لگا تھا۔ حسین ناک بے حد بدہیئت بن چکی تھی۔ خوبصورت فراخ پیشانی پر جلنے سے بدنما داغ پڑ چکے تھے۔ دل میں ہیجان برپا کرنے والے حسین رسیلے ہونٹ جل کر انتہائی بدنما اور بے ترتیب سے ہو گئے تھے۔ اس کے سر کے گھنے دراز سیاہ گھنگھریالے بال سر کی کھال سمیت جل گئے تھے۔ اب وہ سر چھپانے کے لیے اس پر ہر دم ایک بڑا سا رومال باندھے رکھتی تھی۔ لیکن حیرت ناک طور پر اس کی بڑی بڑی روشن سیاہ سحر طراز آنکھیں اور لمبی سیاہ گھنی پلکیں صحیح سلامت تھیں۔ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ لیکن وہ بینائی سے محروم ہو چکی تھیں۔ اسے اکثر شک گزرتا تھا کہ وہ ہرگز اندھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بینائی محفوظ تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی لیکن یہ شک، شک ہی رہتا تھا۔ کیونکہ اسے اس شک پر یقین کرنے کا آج تک موقع نہ ملا تھا۔ اس حادثے میں اس کے جسم کو بہت کم نقصان پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں محفوظ رہے تھے۔ وہ با آسانی چل پھر سکتی تھی۔ لیکن عام اندھوں کی طرح وہ بھی سفید چھڑی کی محتاج ہو گئی تھی۔

اس نے شوقِ مصوری، سنگ تراشی، فوٹو گرافی، حسنِ فطرت سے بھرپور مقامات کی سیر، سب ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر چیز کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والی اب ان چیزوں کو صرف چھو کر ہی محسوس کر سکتی تھی۔

اس نے بے حد دکھ سا محسوس کیا۔ اسے اپنی بچپن کی اس ساتھی سے کتنی محبت تھی۔ وہ شروع ہی سے اس کا بے حد پُر خلوص اور وفا کش ساتھی چلا آ رہا تھا۔ اس کی خوشیوں اور مسرتوں کا خیال رکھنے والا، اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو اٹھنے والا، اس کے ہر کام آنے والا، اس کا سچا رفیق، ہمدرد، عہدِ شباب میں قدم رکھنے کے بعد اپنی بچپن کی ساتھی کے لیے اس کے دوستانہ اور جانثارانہ جذبات میں محبت کا حسین رنگ گھل گیا تھا۔

وہ چپکے چپکے اسے اپنے نہاں خانہ دل کی سند پر بٹھائے اس کی پرستش کرنے لگا تھا۔ اس کے حصول اور دائمی رفاقت کے لیے بے تاب رہنے لگا تھا۔ اس کی بچپن کی پیاری پیاری سی بھولی عہدِ شباب میں قدم رکھتے ہی ایسی حسین وجمیل دوشیزہ بن چکی تھی جس کے قیامت حسن نے خاندان کے ہی نہیں خاندان کے باہر بھی ہر عمر کے مردوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ انہیں بے چین و بے سکون کر رکھا تھا ہر کوئی اس سے شادی کے لیے بے تاب اور اس کے حصول کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ لیکن دلنشین ان سب سے بے نیاز اپنی تعلیم مکمل کرتی جا رہی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کا اسے شروع ہی سے بے حد شوق تھا۔ فائن آرٹس میں ماسٹر ڈگری لینے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس چلی گئی تھی۔ جہاں سے دو سال بعد جب وہ واپس آئی تھی تو اس کے والد شہباز آفریدی نے اس کا رشتہ اپنی خالہ زاد بہن خانم مریم کے بیٹے علی شیر سے کر دیا تھا۔ دلنشین نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا اور علی شیر کے ہاتھ سے انگوٹھی پہن لی تھی۔ اس پر اس کے دل پر قیامت ہی گزر گئی تھی۔ کتنے ہی دنوں تک وہ سب سے چھپ چھپ کر روتا جلتا کڑھتا رہا تھا۔ لیکن اس نے بڑی فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دلنشین کو مبارکباد دی تھی۔ اس کے لیے نیک اور پُر خلوص تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ دلنشین کے رویے سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس رشتے پر بے حد خوش تھی۔ وہ جو اس کی خوشیوں کو ہمیشہ عزیز رکھتا چلا آ رہا تھا اسے خوش دیکھ کر اپنا غم و کرب دل میں دبائے خوش ہو رہا تھا۔

دلنشین کے والد شہباز خان آفریدی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے تھے تو انہیں وہاں ایک اطالوی دوشیزہ پسند آ گئی تھی۔ انہوں نے اس سے شادی کر لی تھی۔ ان کے ماں باپ جو ہمیشہ اُن کی خوشیوں کو عزیز رکھتے رہے تھے۔ اس شادی پر بے حد خوش ہوئے تھے۔ پھر جب شہباز آفریدی اپنی بیوی کے ساتھ واپس وطن پہنچے تھے تو انہوں نے اپنی اطالوی بہو کو بڑی گرمجوش پذیرائی بخشی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کے ہاں ایک بڑی حسین وجمیل بیٹی نے جنم لیا تھا۔ جس پر سب کو بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔ اس کی خوب ناز و نعم سے پرورش ہونے لگی تھی۔ لیکن اس بچے کی قسمت میں قلیل مدت کے لیے ہی ماں کی محبت لکھی تھی۔ جب وہ تین سال کی ہوئی تو اس کی ماں کار کے حادثے میں انتقال کر گئی۔ شہباز آفریدی اس وقت بالکل جوان العمر تھے۔ لیکن اپنے ماں باپ عزیزوں رشتہ داروں کے لاکھ سمجھانے بجھانے پر بھی وہ دوبارہ شادی پر تیار نہ ہوئے اور اپنی پہاڑ سی جوانی اپنی اکلوتی لختِ جگر کو اپنی تمام تر محبتوں اور شفقتوں کا مرکز بنائے گزار دی۔ اس دوران ان کے ماں باپ آگے پیچھے انتقال کر گئے۔ دلنشین اس وقت یونیورسٹی میں پہنچ چکی تھی۔

تعلیم کے معاملے میں شہباز آفریدی نے ہمیشہ اس کی مرضی کا احترام کیا تھا لیکن اس کی شادی وہ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کا رشتہ اپنی خالہ زاد بہن

کے بیٹے علی شیر کے ساتھ کر دیا تھا۔ خانم مریم کے شوہر شیر گل اسکول ماسٹر تھے، ساتھ ہی کافی زمینوں کے مالک بھی تھے۔ وہ چند سال ہوئے انتقال کر چکے تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا علی شیر تھا۔ جس نے ایم ایس سی تک تعلیم پائی تھی۔ وہ کوئی ملازمت کرنے کے بجائے اپنی زمینوں کا انتظام سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ بڑا وجیہہ وحسین، دراز قامت اور عمدہ رکھ رکھاؤ کا مالک تھا۔ اس کی گفتگو بھی متاثر کن ہوتی تھی ،طور طرائق بھی، شہباز آفریدی اُسے ہر لحاظ سے اپنی بیٹی کے لائق سمجھتے تھے اور مطمئن تھے اس کی زندگی اس کی رفاقت میں سکھ چین سے گزرے گی۔

دلنشین کے اس رشتے کا شہباز آفریدی کی بڑی بہن صفیہ خانم کو بے حد رنج و ملال ہوا تھا۔ وہ شہباز آفریدی کی بہن ہونے کے ناطے سے دلنشین پر اپنا حق سمجھتی تھیں۔ اُن کا اکلوتا بیٹا شاہ میر ہر چند کہ مردانہ حسن ووجاہت اور قد وقامت میں علی شیر سے دبتا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس کے مقابلے میں بہترین اوصاف واطوار کا مالک تھا۔ زیادہ تعلیم یافتہ تھا، ایک بڑے اور امیر کبیر زمیندار گھرانے کا فرد ہونے کے سبب ہر چند کہ اسے ملازمت وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے شوق سے فوجی ملازمت کر رہا تھا اور اس وقت میجر کے عہدے پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ ہر طرح سے دلنشین کے لائق تھا مگر شہباز آفریدی نے جانے کیوں اسے نظر انداز کر کے علی شیر سے اس کا رشتہ کر دیا تھا۔

وہ شروع ہی سے اپنے بیٹے کے دلنشین کی جانب جھکاؤ سے واقف تھیں۔ اب اس کی محرومی اور تہی دامنی پر سوائے صبر اور خاموشی کے اور کیا کر سکتی تھیں۔

علی شیر کے ساتھ دلنشین کا رشتہ ہو جانے کے بعد بھی شاہ میر برابر اس سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ دلنشین کے لیے اس کی محبت، اپنائیت اور خلوص پہلے ہی جیسے تھے۔

دلنشین اور علی شیر کی منگنی کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ شہباز آفریدی انتقال کر گئے۔ وہ دل کے پرانے مریض تھے۔ حملہ قلب سے جانبر نہ ہو سکے۔ صفیہ خانم کو اپنے بھائی کی موت کا غم تو ہونا ہی تھا۔ خانم مریم نے بھی اس کا بڑا غم کیا اور شہباز آفریدی کے چہلم کے بعد بھی دلنشین کی ہمدردی میں کئی ماہ تک حویلی میں ٹھہری رہیں۔ علی شیر بھی کئی کئی دن وہاں آ کر ٹھہرتا رہا۔ صفیہ خانم چہلم کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئی تھیں۔ شاہ میر جو پشاور چھاؤنی میں تعینات تھا اکثر دلنشین کی خیریت وخبر کے لیے حویلی آ جایا کرتا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ان دنوں دلنشین کچھ اُلجھی اُلجھی اور خاموش سی دکھائی دینے لگی تھی۔ جیسے کوئی بات اسے اُلجھا رہی ہو۔ پریشان کر رہی ہو۔ اس نے کئی بار اس سے اس بارے میں دریافت بھی کیا تھا۔ لیکن وہ ہر بار اُسے ٹال گئی تھی۔

پھر اس کے ساتھ وہ منحوس حادثہ پیش آ گیا تھا۔ وہ اپنی بنائی ہوئی تصاویر کی نمائش کا انتظام کرنے اسلام آباد گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر اس کی کار ایک زبردست حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ اس حادثے میں ڈرائیور خان گل موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ جبکہ دلنشین شدید زخمی حالت میں اسپتال میں لے جائی گئی تھی۔ کار میں بھڑکنے والی آگ سے اس کا چہرہ بری طرح سے جھلس گیا تھا۔ جسم پر بھی چوٹیں لگی تھیں۔ اس کے جھلسے ہوئے چہرے کی طویل عرصہ تک سرجری ہوتی رہی تھی پھر جب وہ گھر واپس آئی تھی تو اس حالت میں کہ اس کا راہزن ہوش وتمکین، قیامت خیز حد تک حسین چہرہ ایسا کریہہ المنظر بن چکا تھا اسے دیکھنا بھی محال معلوم ہوتا تھا۔

عزیزوں رشتہ داروں نے واجبی ہمدردی کی

جبکہ صفیہ خانم اور شاہ میر کے رنج و کرب کا ٹھکانہ رہا۔ صفیہ خانم کو وہ اور بھی عزیز اور پیاری ہو گئی جبکہ شاہ میر کے اس کے لیے محبت، اپنائیت اور خلوص کے جذبات میں بے پناہ ہمدردی اور دلبستگی کا رنگ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی ہر ممکن دلجوئی کرتا اس کی حوصلہ افزائی کرتا اس سے اچھی اچھی باتیں کرتا اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

خانم مریم اور علی شیر نے بھی اس حادثے پر بڑے رنج وغم کا اظہار کیا تھا اور دلنشین سے ہر ممکن ہمدردی اور اس کی دلجوئی کی تھی۔ علی شیر تو اب دلنشین کی حویلی میں ہی رہنے لگا تھا۔ اس پر رشتہ داروں نے اعتراضات بھی کیے تھے۔ لیکن اس کا کہنا تھا کہ اس طرح وہ دلنشین کی بہتر دیکھ بھال اور نگہداشت کر سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عنقریب اسے پلاسٹک سرجری کے لیے امریکہ لے جائے گا تا کہ اس کا چہرہ ٹھیک ہو سکے۔ لیکن وقت گزرتا جا رہا تھا۔ وہ بدستور دلنشین کی حویلی میں مقیم تھا۔ اس کی ہر چیز استعمال کر رہا تھا۔ وہ لمبی چوڑی قیمتی کاریں بھی جو شہباز آفریدی کا شوق ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ابھی تک اس نے دلنشین کو امریکہ لے جانے کی بات کی تھی نہ ہی اس کے لیے کچھ کیا تھا۔ شاہ میر نے جب کبھی بھی اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ وہ اسے بڑی خوبی سے ٹال گیا تھا۔ اس امر نے شاہ میر کو اس کی طرف سے مشکوک بنا دیا تھا۔ لیکن اس نے اس کا اظہار کبھی دلنشین سے نہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

”بڑا پیارا سویٹر ہے یہ خوب نرم و گرم...... پھوپی بھی تمہارے ساتھ آ جاتیں تو اچھا ہوتا۔ عرصہ ہو گیا ہے ان سے ملے......“ دلنشین سویٹر کو پھیلائے اس پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

”وہ ضرور تم سے ملنے آئیں گی۔ ذرا ان کے گھٹنوں کی تکلیف کم ہو لے، سردیوں میں یہ تکلیف انہیں کچھ زیادہ ہی ستانے لگتی ہے۔ ہاں یہ چوڑیاں تمہیں عائشہ نے بھیجی ہیں۔“ شاہ میر نے ایک پیکٹ کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”سبز رنگ کی سنہری چوڑیاں ہیں یہ...... ایسی چوڑیاں تمہیں ہمیشہ پسند رہی ہیں نا؟“

”بہت اچھی ہے عائشہ...... مجھ سے محبت کرتی ہے نا۔“ دلنشین مسکرا کر بولی۔ کٹے ادھڑے جھلسے ہونٹوں میں موتیوں جیسے سفید آبدار دانتوں کی ہموار قطار اپنی جھلک دکھا گئی۔

شاہ میر اسے چوڑیاں ڈبے سے نکال کر ٹٹولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی گول و گداز سفید چمکتی کلائیوں میں وہ چوڑیاں واقعی خوب بہار دیتیں۔

”وہ کہہ رہی تھیں میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ تمہارے لیے مٹھائی کا ڈبہ اور دوسرے تحفے لے کر آئے گی۔“

”وہ مجھ سے بھی ڈھیروں ڈھیر تحفے لے گی۔ بہن کا پیار بھی کیا ہوتا ہے شاہ میر۔“

”ہاں واقعی...... بہن واقعی ایک بے حد پیاری چیز ہے۔“ شاہ میر نے سگریٹ کا کش لیا۔

”ہاں یہ علی شیر کہاں ہے؟“

”کہیں گیا ہوگا۔ مجھے بتا کر نہیں گیا کیونکہ میں سو رہی تھی۔“ شاہ میر کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور پیشانی پر شکن تھی۔

”اس نے تم سے امریکہ جانے کی بات کی تھی؟ تمہارے حادثے کو سال بھر ہونے کو آ رہا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک جانے کن مصروفیات میں اُلجھا ہوا ہے۔“ دلنشین کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اگر اس کے ہونٹ صحیح حالت میں ہوتے تو شاہ میر دیکھ لیتا کہ وہ مسکراہٹ طنز بھری تھی۔

”ہاں وہ واقعی اپنی ذاتی قسم کی مصروفیات میں

اُلجھا ہوا ہے۔ میں نے اس سے کبھی ان مصروفیات کی نوعیت نہیں پوچھی۔ وہ کہتا ہے جونہی اس نے فراغت پائی وہ مجھے امریکہ لے چلے گا۔''

''وہ بھلا شاہ میر کو کیا بتاتی کہ وہ اس وقت کس قسم کی مصروفیات میں اُلجھا ہوا تھا۔

''لیکن سال بھر کی مدت بہت ہوتی ہے نشی...... تم کبھی کی ٹھیک ہو چکی ہوتیں اگر اتنا وقت ضائع نہ کیا جاتا۔'' شاہ میر افسوس بھرے لہجے میں بولا۔

''میں بھی یہی کچھ محسوس کرتی ہوں لیکن کیا کروں؟ میں ہر معاملے میں اس پر انحصار کرنے پر مجبور ہوں۔'' دلنشین بولی۔ وہ اس وقت بڑی احتیاط سے سب چیزیں لفافے میں رکھ رہی تھی۔ شاہ میر نے دکھ سا محسوس کیا۔ مگر خاموش رہا۔

اسی وقت حویلی کی پرانی ملازمہ جو دلنشین کی ملازمۂ خاص بھی تھی، چائے کی ٹرالی لیے اندر چلی آئی۔

''زینب یہ چیزیں میری الماری مین رکھ دو۔'' دلنشین نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''شاہ میر نے کپوں میں چائے بنائی اور ایک کپ دلنشین کی طرف بڑھا دیا۔

''چائے نشی۔'' دلنشین نے ہاتھ آگے بڑھا کر کپ اس سے لے لیا۔ شاہ میر نے ایک پلیٹ میں کچھ لوازمات ڈال کر پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

''یہ لو کچھ لوازمات بھی ہیں۔''

''شکریہ...... تم میرا بہت خیال رکھتے ہو شاہ میر...... پہلے کی طرح...... ورنہ میری اس حالت میں میرے سامنے بیٹھنا بھی صبر و برداشت کا ایک کڑا امتحان ہوا کرتا ہے۔'' دلنشین فگار سے لہجے میں بولی۔

''نشی!'' شاہ میر ایک دم تڑپ اٹھا۔ اس نے فوراً ہی کپ تپائی پر رکھ دیا۔

''کیا باتیں کر رہی ہو نشی؟ میں تمہیں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ایسی باتیں مت کیا کرو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر تم مانتی ہی نہیں۔''

دلنشین کے جھلسے ہوئے چہرے کی جھریوں میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی اس کی آنکھوں میں آنسو موتیوں کی طرح جھلملانے لگے۔

''معاف کرنا شاہ میر مگر میں بھی کیا کروں، اپنی حالت پر میں یہی تبصرہ کر سکتی ہوں۔''

''تم ایسی باتوں کے بارے میں سوچا بھی نہ کرو نشی، شکل وصورت کیسی ہی بن جائے دل تو وہی رہتا ہے۔ اصل خوبصورتی دل کی خوبصورتی ہے۔ فطرت و سیرت کی خوبصورتی ہے اور اس دولت سے تم مالا مال ہو۔ تمہیں اگر اپنے چہرے کے بگڑ جانے کا غم ہے تو یہ قدرتی بات ہے۔ لیکن تم مایوس مت ہو، پلاسٹک سرجری کے بعد تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' شاہ میر کا لہجہ ہمدردانہ اور ناصحانہ تھا۔

دلنشین نے ٹشو پیپر سے آنکھیں خشک کیں۔

''ٹھیک ہے شاہ میر...... آئندہ احتیاط کروں گی۔ ہاں تم چترال گئے ہوئے تھے۔ ذرا اس سیاحت کا احوال تو سناؤ۔''

''ہاں ہم فوجیوں کا ایک دستہ برف میں پھسلنے کی تربیت لینے بھیجا گیا تھا۔ مت پوچھو اس تربیت کے دوران کیسے کیسے مضحکہ خیز واقعات رونما ہوئے۔'' شاہ میر انہیں ان واقعات کی تفصیل سنانے لگا۔

انہی باتوں کے دوران شام ڈھلنے کو آ گئی۔ ملازمہ زینب نے کمرے میں داخل ہو کر اس کی روشنیاں جلا دیں۔ اس کے ساتھ ہی شاہ میر وہاں سے جانے کے لیے اٹھ گیا۔

''اب مجھے چلنا چاہیے نشی...... آج مجھے یہاں کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی۔ تم خوش رہنا، کسی پریشانی اور فکر کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دینا۔ میں

اگلے ہفتے ضرور تم سے ملنے آؤں گا۔''

''ضرور آنا...... تم آتے ہو تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے، اطمینان اور تحفظ کا احساس بھی ہوتا ہے۔'' شاہ میر نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا برف سا سفید گداز حسین ہاتھ اپنے مضبوط گرم ہاتھوں میں لے لیا۔

''مجھے خوشی ہے نشی جو تم میرے بارے میں ایسے جذبات رکھتی ہو۔ تم انشاء اللہ مجھے ہمیشہ اپنا مخلص اور خیر خواہ پاؤ گی۔'' اس نے اس کے ہاتھ نرمی سے دبا کر چھوڑ دیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

''اچھا اب خدا حافظ...... میں اگلے ہفتے ضرور تم سے ملنے آؤں گا۔''

''خدا حافظ شاہ میر۔''

شاہ میر کے جانے کے بعد دلنشین تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کا ذہن آج کے واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔

شاہ گل، شاہ جہان خان کی بیٹی تھی۔ جو شہباز آفریدی کے اس وقت سے گہرے دوست چلے آ رہے تھے جب انہوں نے اُن کی حویلی کے عقب میں سڑک پار کی کوٹھی میں آ کر رہائش اختیار کی تھی۔ وہ بھی خاص زرعی زمینوں اور باغات کے مالک تھے۔ لیکن شہباز آفریدی کے مقابلے میں کمتر حیثیت کے تھے۔ ان کے سات بچے تھے، چار بیٹے اور تین بیٹیاں شاہ گل ان سب میں بڑی تھی۔ وہ بچپن ہی سے دلنشین کی گہری سہیلی چلی آ رہی تھی۔ وہ اسی کی ہم عمر تھی۔ انہوں نے ایک ہی اسکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ شاہ گل تو بی اے کر چکنے کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی۔ لیکن دلنشین اعلیٰ تعلیمی مراحل طے کرتی رہی تھی۔

شاہ گل کوئی ایسی حسین تو نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو خوب بنا سنوار کر رکھتی تھی۔ اور کشش اور خوبصورت نظر آنے کے تمام لوازمات سے ہر دم آراستہ رہتی تھی۔ دلنشین کو عرصہ دراز تک علم نہ ہو سکا تھا کہ اس نے کب علی شیر کو اپنی طرف راغب کرنا اور اپنی محبت کے جال میں پھنسانا شروع کیا تھا۔ پھر جب اسے اس کا علم ہوا تھا تو اس کے رنج و کرب کی انتہا نہ رہی تھی۔ بچپن کی ایسی گہری اور پُر خلوص سہیلی یوں مارِ آستین بن کر اسے ڈسنے کی کوشش کرے گی یہ تو اس کے سان و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ ان دنوں علی شیر چند دنوں سے حویلی آیا ہوا تھا۔ اسی شام شاید وہ کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ موسم بہار کے حسین نظاروں کا لطف اٹھانے چمن کی سیر کرتے کرتے حویلی کے عقبی حصے میں جا نکلی تھی۔ وہاں گھنے چھتنار درختوں کا جنگل سا آباد تھا اور بکثرت پھولدار پودے اور جھاڑیاں اُگے ہوئے تھے۔ وہ ان پھولوں کو سونگھتی عطر بیز ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے چوڑے تنے کے پیچھے سبز رنگ کا ریشمی آنچل لہراتے دیکھ کر چلتے چلتے ایک دم رُک گئی۔ وہاں کون ہو سکتا تھا؟ پہلے تو اس نے سوچا وہ فوراً ہی وہاں جا کر دیکھے۔ پھر کوئی خیال آتے ہی وہ درختوں کے تنوں کی آڑ لیتے پودوں اور جھاڑیوں سے بچ بچا کر گزرتے دبے پاؤں اس درخت کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دور آگے جا کر اس نے دیکھا کہ حویلی کے اس عقبی حصے میں کھلنے والا چھوٹا سا دروازہ اس وقت تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ حویلی کے اس عقبی حصے کے باہر چھوٹی سی ویران سڑک کے پار شاہ گل کی کوٹھی تھی۔ اس کے ذہن میں شک کا ناگ سرسرایا تھا۔ وہ دبے پاؤں آگے

بڑھتے بڑھتے اس درخت سے کچھ فاصلے پر اُگے ہوئے ایک درخت کے چوڑے تنے کے عقب میں پہنچ کر تنے سے چپک گئی تھی۔ اسی وقت ایک مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''اس کی طرف سے تو ابھی شادی کا اشارہ نہیں ہوا۔ ابھی شہباز خالو کا غم تازہ ہے۔ اسے سنبھلنے میں کچھ عرصہ لگے گا۔'' وہ اس آواز کو پہچان گئی تھی۔ وہ علی شیر کی آواز تھی۔ اسے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ وہ بے جان سی درخت کے تنے سے لگی نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

حواس مختل ہونے لگے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ایسی تاریکی چھا گئی تھی کہ کتنی ہی دیر تک اسے کچھ سجھائی نہ دیا تھا۔ پھر جب آہستہ آہستہ اس کے ہوش وحواس بحال ہوئے تھے تو اس نے شاہ گل کی آواز سنی تھی۔

''لیکن تمہاری والدہ اس کی تنہائی کے پیشِ نظر ضرور جلد شادی کرنا چاہیں گی۔ پھر تم کیا کرو گے؟''

''شادی تو ظاہر ہے مجھے کرنی ہی ہے، کرلوں گا۔'' علی شیر کی آواز آئی تھی۔

''وہ بے حد حسین جمیل ہے اور بے اندازہ جائیداد کی مالک، یہ شادی واقعی تمہیں دنیا کا خوش قسمت ترین مرد بنادے گی۔'' شاہ گل کا لہجہ حسد و رقابت بھرا تھا۔ اس میں نفرت اور کینہ کی واضح جھلک بھی موجود تھی۔

علی شیر آہستہ سے ہنسا تھا۔

''ہاں...... حسین وجمیل بیوی کے ساتھ ہی اگر ڈھیروں ڈھیر دولت بھی مل رہی ہو تو ایسے مرد کو واقعی دنیا کا خوش قسمت ترین مرد کہنا چاہیے۔''

''ہاں واقعی......'' شاہ گل کا لہجہ جلا کٹا سا تھا۔

''لیکن فرض کرو اس کے پاس بے اندازہ دولت ضرور ہوتی لیکن وہ خود اچھی خاصی بدصورت ہوتی تو تم کیا اس سے شادی رچالیتے؟''

''میں......'' علی شیر کا لہجہ کچھ تذبذبانہ سا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا شاہ گل کی گھبرائی ہوئی آواز بلند ہوئی تھی۔

''اوہ حمیرا بھابی آگئیں، یہ تو ہیں ہی میری دشمن، وہ مجھے گھر سے غائب پائیں گی تو جانے کیا قیامت کھڑی کریں گی؟ اماں بھی انہی کی سنتی ہیں۔'' حمیرا بھابی شاہ گل کے تایا زاد بھائی کی بیوی تھیں اور انتہائی شکی مزاج اور کینہ پرور......

دلنشین نے بیٹھے بیٹھے درخت کے تنے کے پیچھے سے تھوڑا سا آگے ہو کر جھانکا تھا۔

شاہ گل تیز تیز چلتی ہوئی حویلی کے عقبی کھلے ہوئے دروازے کی طرف جارہی تھی۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے سڑک پار اس کی کوٹھی کے کھلے ہوئے پھاٹک میں نیلے رنگ کی ایک لمبی چوڑی کار داخل ہو رہی تھی۔ پھر شاہ گل دروازے سے باہر نکل گئی تھی اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا تھا۔

دلنشین پیچھے ہٹ کر درخت کے تنے سے چپک گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد خشک پتوں کے قدموں تلے چرمرانے کی آواز سنی تھی۔ علی شیر اسی طرف آرہا تھا۔ دلنشین نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ علی شیر اپنے خیالوں میں گم اس کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

دلنشین کی حالت اس وقت بے حد خستہ ہو رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک وہیں درخت کے تنے سے لگی بیٹھی رہی تھی۔ اس کا دل بھر بھر آرہا تھا۔ آنکھیں بھیگی جارہی تھیں۔ شاہ گل اور علی

شیر...... اتنے طویل عرصے کی دوستی کے بعد اسے اب معلوم ہوا تھا کہ اس کی عزیز از جان سہیلی اندر ہی اندر اس سے کتنی نفرت اور حسد کرتی تھی۔ اس سے کتنا جلتی تھی، کیسے اس کی کاٹ میں رہتی تھی۔ اس کا اپنا اب تک کہیں رشتہ نہ ہو پایا تھا۔ کیونکہ وہ آئیڈیل پرست تھی۔ اسے اب تک اپنا آئیڈیل نہ ملا تھا۔ اب شاید علی شیر کی صورت میں اسے اپنا آئیڈیل مل گیا تھا اور وہ اسے اس سے ہتھیانے کے درپے ہوگئی تھی۔ جانے اس نے کب اس سے ملنا جلنا شروع کیا تھا اور علی شیر بھی یہ جانتے بوجھتے کہ وہ اس کا منگیتر تھا، اس کی طرف راغب ہوتا چلا گیا۔ اب ان کے درمیان تعلقات اس حد تک استوار ہو چکے تھے کہ ان کے درمیان کوئی غیریت نہ رہ گئی تھی جیسا کہ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ رشتے اور دوستی کے تقدس کی دھجیاں اُڑ گئی تھیں۔ اخلاقی اقدار اور اصول بری طرح سے پائمال ہوگئے تھے۔ اس کے اعتماد کے آبگینے کو شدید ٹھیس لگی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ کتنی ہی دیر تک جلتی کڑھتی اور آنسو بہاتی رہی تھی۔ ایسے اندھیاروں میں بھٹکتی رہی تھی جن میں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ اسے نہ سوجھ رہا تھا۔ جن میں روشنی کی ایک کرن بھی نہ آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کیا کرے؟ اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ بالکل تنہا تھی۔ وہ کسی سے اپنا دکھ درد نہ کہہ سکتی تھی۔ کسی کو اعتماد میں نہ لے سکتی تھی۔ شاہ میر کو بھی نہیں، جو یہ سب کچھ سن کر شدید غصے میں آجاتا اور جانے کیا کر بیٹھتا۔ دوسرے رشتہ داروں سے تو ہمدردی اور مدد کی امید ہی عبث تھی۔ جو اس کی دولت پر دانت گاڑے بیٹھے تھے اور اس کے علی شیر سے رشتے پر بے حد جلے بھنے ہوئے تھے۔

اپنے کمرے کی تاریک فضا میں وہ اپنے بستر پر بیٹھی کتنی ہی دیر تک یونہی پراگندہ خیالوں کے گرداب میں چکراتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی خادمہ خاص زینب نے آکر کمرے کی روشنیاں جلائی تھیں اور اسے یوں اندھیرے میں بیٹھے بے حد حیران و پریشان سی ہوگئی تھی۔ اس نے اس سے ہمدردانہ اس کی طبیعت کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ لیکن وہ اسے ٹال گئی تھی۔ اسی وقت علی شیر بھی کمرے میں چلا آیا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے اندر ایک کھولاؤ سا پیدا ہوا تھا لیکن وہ بڑی خوبی سے اپنے تاثرات چھپا گئی تھی اور ملازمہ زینب کو چائے لانے کا کہہ کر بستر سے اتر کر علی شیر کے سامنے صوفے پر آ بیٹھی تھی۔ علی شیر کو شاید اس کی بکھری بکھری سی حالت نے نہ چونکایا تھا۔ اسی لیے وہ اس سے حسب عادت بڑے کھلے اور شگفتہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔

وہ دل ہی دل میں اس کی منافقت پر پیچ و تاب کھاتی بظاہر اُس کی باتوں کا لطف لیتی رہی تھی۔ پھر اس نے اس سے ایک دم ہی پوچھ ڈالا تھا۔

''علی شیر...... میں نے تمہیں ہر طرح سے اپنا سچا ہمدرد اور مخلص پایا ہے۔ تمہیں دیکھتے ہوئے مجھے ڈیڈی کے انتخاب پر بے پناہ خوشی اور اطمینان ہی نہیں فخر کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ویسے سچ کہنا اگر میں ایسی خوبصورت نہ ہوتی بلکہ خاصی بدصورت اور بدہیئت ہوتی تو کیا تم مجھ سے شادی پر آمادہ ہو جاتے؟''

علی شیر کے چہرے نے ایک دم ہی رنگ بدلا تھا۔ چائے کی پیالی تھامے اس کا ہاتھ کپکپا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے آثار ابھرے تھے۔ لیکن اس نے فوراً ہی سنبھلتے

ہوئے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل اور پُرخلوص بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔
''تمہیں ایسا خیال کیونکر آیا نشی؟ تم کیسی بھی ہوتیں مجھے دل و جان سے قبول اور عزیز ہوتیں۔ میرے لیے دنیا کی عزیز ترین متاع تم ہی ہو ہمیشہ رہو گی۔''
آگے بھی اس نے بے حساب چاپلوسانہ اور چکنی چپڑی باتیں کی تھیں۔ اسے اپنی محبت وخلوص کا یقین دلانے کی بھرپور کوششیں کی تھیں۔ بار بار اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے لیے صرف اور صرف وہی سب کچھ تھی۔ وہ خواہ کیسی بھی ہوتی اسے دل و جان سے عزیز ہوتی، اس کے پاس جو کچھ تھا اسی کی ملکیت رہنا تھا۔ اسے اس سے کوئی واسطہ نہ رکھنا تھا۔
دلنشین اس کی منافقت اور اداکاری کو دل ہی دل میں سراہتی یوں اس کی باتیں سنتی رہی تھی گویا اسے اس کے کہے ایک ایک لفظ کا یقین آرہا ہو۔ وہ اس کے کہے پر ایمان لے آئی ہو۔
اس رات کھانے کی میز پر علی شیر کا رویہ اس کے ساتھ بے حد فدویانہ اور جانثارانہ تھا۔ وہ اس کے سامنے یوں بچھ بچھ جارہا تھا گویا وہ اس کا میزبان تھا اور وہ اس کی معزز مہمان...... اپنی تمام تر مسکراہٹوں اور ہنسی قہقہوں کے وہ کچھ گھبرایا ہوا اور اُلجھا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں چہل قدمی کے لیے ٹیرس پر آگئے تھے۔ علی شیر اس وقت بھی اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ باتیں بھی وہ بے ربط سی کر رہا تھا۔ جس کا شاید اسے احساس نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کی چہل قدمی کے بعد اسے نے تھکاوٹ اور نیند کا بہانہ بنایا تھا اور اندر چلا گیا تھا۔
وہ بھی چپکے چپکے اس کے پیچھے پیچھے اندر ہولی تھی۔ اس نے نیم تاریک کوریڈور میں پہنچ کر ایک چوڑے ستون کی آڑ سے علی شیر کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور اس کا مقصد سمجھتے ہوئے بڑی تیزی سے مگر بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی ملحقہ ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی تھی اور ایکسٹینشن فون کو کان سے لگا کر سانس روک لی تھی۔ جلد ہی فون پر علی شیر اور شاہ گل کے درمیان ہائے ہیلو کی آوازیں ابھریں تھیں پھر علی شیر کی گھبرائی ہوئی آواز اس کے گوش گزار ہوئی تھی۔
''شاہ گل جانم...... آج شام جب ہم چمن میں باتیں کر رہے تھے تو وہاں تمہیں دلنشین تو نہیں دکھائی دی تھی؟ اس نے آج ایسی باتیں کی ہیں کہ میں بری طرح سے پریشان ہوگیا ہوں۔''
''کیسی باتیں؟ ذرا بتاؤ۔'' شاہ گل بھی ایک دم پریشان ہو اٹھی تھی۔ علی شیر نے اسے دلنشین کی باتیں سنائی تھیں اور بولا تھا۔
''اگر اس وقت وہ وہاں موجود تھی اور اس نے ہمیں آپس میں ملتے دیکھ لیا تھا اور ہماری باتیں بھی سن لی تھیں تو یہ بہت ہی برا ہوا۔ جانے وہ اب کس ردِعمل کا اظہار کرے گی۔''
''میں نے تو وہاں آس پاس کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن تم اتنے پریشان اور خوف زدہ ہو تو میں کل اس سے مل کر اسے کُریدتی ہوں۔ اس کی باتیں کوئی چونکا دینے والی نہیں، ایسی باتیں ہر لڑکی کر سکتی ہے۔'' شاہ گل اُسے تسلی دیتے ہوئے بولی تھی۔ لیکن اس کا لہجہ اس کی پریشانی اور گھبراہٹ کا غماز تھا۔
''اللہ کرے خیریت ہی رہے ورنہ ہمارے حسین خواب ہمیشہ کے لیے بکھر جائیں گے۔'' علی شیر کا لہجہ بدستور پُرتشویش اور گھبرایا ہوا تھا۔
''تم پریشان مت ہو علی شیر...... میں کل

دلنشین سے مل کر اسے کریدوں گی۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اس وقت چمن میں دور دور تک کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ دراصل چوری چھپے کی ملاقاتیں اسی طرح ذہن میں خوف اور وسوسے پیدا کیا کرتی ہیں۔'' شاہ گل نے اُسے تسلی دی تھی۔

''ہوسکتا ہے بہرحال..... تم کل اس سے مل کر ضرور پتہ چلانے کی کوشش کرنا۔ اب ہمیں آپس میں ملنے جلنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔'' علی شیر کی آواز آئی تھی۔

پھر دونوں کے درمیان الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا تھا اور رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ دلنشین کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ سی طنزیہ مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی تھی۔

اگلے دن ناشتے کی میز پر علی شیر کا رویہ ویسا ہی خوشامدانہ اور چاپلوسانہ سا تھا۔ ناشتے کے دوران وہ مسلسل اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کا لہجہ واضح طور پر اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کی چغلی کھا رہا تھا۔ پھر وہ اپنی زمینوں پر کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے اپنا بیگ سنبھالے حویلی سے رخصت ہوگیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے دلنشین سے خوب چکنی چپڑی باتیں کی تھیں۔ حسین مستقبل کے خواب دکھائے تھے اور کہا تھا کہ وہ جا کر اپنی والدہ سے جلد شادی کی بات کرے گا۔

اس کے جانے کے بعد دلنشین لاؤنج میں چلی آئی تھی اور صوفے پر بیٹھ کر عمیق سوچوں میں گم ہوگئی تھی۔ سوچوں کے اس بحرِ ذخار سے وہ اس وقت باہر نکلی تھی جب شاہ گل 'ہیلو نشی......!' کی بلند چہکار کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔

''آؤ گل بیٹھو..... میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔'' دلنشین نے دل ہی دل میں شدید کبیدگی محسوس کرتے ہوئے بظاہر بڑی خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا تھا۔

شاہ گل اونچی آواز میں ہنس دی تھی۔

''گویا میں شیطان ہوگئی، جونہی یاد کیا وہ حاضر......!''

پھر اُن کے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں چھڑ گئی تھیں۔ دلنشین نے محسوس کیا تھا جیسے شاہ گل دلوز شگفتہ باتوں کے باوجود کچھ اُلجھی اُلجھی ہوئی سی تھی اور کچھ بے چین سی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی وجہ وہ بخوبی سمجھتی تھی لیکن انجان بنی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شاہ گل انتہائی چالاک اور ہوشیار واقع ہوئی تھی۔ وہ بے لاگ ولپیٹ کبھی اپنی بات پر نہ آئے گی۔ بلکہ اُسے خوب چکر دے گی اور اپنی بات نکلوا لے گی۔ اس سے باتیں کرتے کرتے اس نے بڑی ہوشیاری سے باتوں کا رُخ موسم کی طرف موڑ دیا تھا۔

''اس علاقے کے موسمِ بہار کی اپنی شان ہے نشی..... اس حویلی کے باغات و چمن میں اس کی جلوہ گری کے نظارے اپنے اندر بے پناہ حسن و دلکشی سمیٹے ہوئے ہیں۔ تمہارا تو اِن کی سیر سے جی نہیں بھرتا ہوگا۔''

''میں تو آج کل اسلام آباد میں اپنی تصاویر کی نمائش کی فکر میں ہوں۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ باغوں چمنوں میں گھومتی پھروں۔ فرصت ملی تو اِن کی سیر بھی کرلوں گی۔'' دلنشین نے رکھائی سے جواب دیا تھا۔

اس کے اس جواب پر شاہ گل کے چہرے پر جو اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی اس پر وہ دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''حیرت ہے تم ایک بار بھی اِن کی سیر کے

لیے نہیں نکلیں؟ میرا تو خیال تھا تم ہر شام اِن کی سیر کا لطف اٹھاتی ہوگی۔'' شاہ گل کا لہجہ مصنوعی حیرت بھرا تھا۔

''فرصت ملے تب نا؟ آج کل تو مجھے ذرا بھی فرصت نہیں۔'' شاہ گل اب مطمئن ہی نہیں خوش بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

پھر ملازمہ چائے کی ٹرے لیے اندر چلی آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شاہ گل نے اُس کی شادی کی باتیں چھیڑ دی تھیں۔

''علی بھائی نے تم سے شادی کی بات کی؟ اب تو شہباز چچا کے انتقال کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اب تو تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیے۔''

''ہاں...... علی شیر اسی لیے آج صبح اپنے گاؤں چلا گیا ہے کہ وہ خالہ سے اس سلسلے میں بات کرے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جلد ہی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''اچھا...... ہاں شادی کے بعد تم اسی حویلی میں رہو گی یا علی بھائی کے گاؤں چلی جاؤ گی؟''

''یہیں رہوں گی۔ میں اس اتنی بڑی حویلی کو نوکروں، نوکرانیوں کے سپرد کر کے کہیں نہیں جاسکتی۔''

اگر علی بھائی اصرار کریں کہ تم گاؤں اُن کی والدہ کے پاس چل کر رہو؟''

''کبھی کبھی چلی جایا کروں گی کچھ دنوں کے لیے...... لیکن رہوں گی یہیں اپنی حویلی میں، علی شیر کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''علی بھائی بڑے اچھے منتظم ہیں۔ شادی کے بعد شاید وہ اس قلعہ نما حویلی کے ساتھ تمہاری زمینوں وغیرہ کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیں؟'' جانے کس خیال کے زیرِ اثر شاہ گل روانی میں کہہ گئی تھی۔

''اس کی ضرورت نہیں، ہمارے خاندان کے قدیم نمک خوار یہ ذمہ داریاں بطریقِ احسن سنبھالے ہوئے ہیں۔ میں اِن پر ہر طرح سے اعتماد کرتی ہوں۔ پھر وکلاء کی ایک فرم بھی میری جائیداد سے متعلق تمام امور کی نگران ہے۔'' دلنشین نے سرد مہری سے جواب دیا تھا۔

شاہ گل کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا تھا۔

''کیوں؟ کیا تم علی بھائی پر اس سلسلے میں اعتماد نہیں کرتیں؟''

''یہ بات نہیں...... دراصل جائیداد وغیرہ کے انتظامات سب بطریقِ احسن چل رہے ہیں اس لیے علی شیر کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں۔''

''لیکن وہ یہ خود چاہیں گے کہ انہیں ان معاملات سے الگ تھلگ نہ رکھا جائے۔''

''یہ بعد کی باتیں ہیں۔ ذرا شادی ہو لے پھر ہی دیکھا جائے گا۔ لیکن تمہیں اِن معاملات سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'' دلنشین نے چبھتے ہوئے سے لہجے میں استفہام کیا تھا۔

شاہ گل کچھ ٹپٹائی تھی لیکن فوراً ہی سنبھل گئی تھی۔

''بس یونہی...... دراصل مالی امور کچھ زیادہ ہی اہم ہوا کرتے ہیں۔'' اتنا کہنے کے ساتھ ہی وہ جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد دلنشین ایک بار پھر گہری سوچوں میں غرق ہوگئی تھی۔ اب ان سوچوں میں پریشانی، تفکرات، اور اندیشہ ہائے دور و دراز بھی گھلے ملے ہوئے تھے۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے تھے۔ اس ملاقات کے بعد پھر شاہ گل سے اس کی ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ علی شیر بھی اپنے گاؤں سے نہ لوٹا تھا۔ وہ

اسلام آباد میں اپنی تصاویر کی نمائش کے انتظامات میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں اسے آئے دن وہاں کے چکر لگانے پڑ رہے تھے۔ پھر ایک دن اسلام آباد سے واپس آتے ہوئے اُس کے ساتھ وہ منحوس حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس نے اس کا حسن و جمال تباہ کر کے اسے انتہائی کریہہ المنظر بنا دیا تھا۔

اس دن جب وہ اسلام آباد سے واپس آ رہی تھی تو درہ آدم خیل جاتے ہوئے راستے میں شدید بارش کے سبب ڈرائیور بابا خان گل کی انتہائی کوشش کے باوجود گاڑی سڑک سے پھسل کر اس کے کنارے اُگے ہوئے ایک درخت سے جا ٹکرائی تھی۔ اس میں فوراً ہی آگ لگ گئی تھی۔ ڈرائیور خان گل موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ جبکہ دلنشین کو جو اس ٹکر سے کار کا دروازہ کھلتے ہی باہر جا گری تھی۔ شدید چوٹیں لگی تھیں۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے گزرنے والوں نے پشاور کے فرنٹیئر اسپتال پہنچایا تھا۔ جلتے پٹرول کی بوچھاڑوں نے اس کے چہرے کو بری طرح سے جھلسا دیا تھا۔ وہاں کئی ہفتوں تک اس کا علاج ہوتا رہا تھا۔

☆......☆......☆

اب اس کی زندگی حویلی تک ہی سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ تنہائی پسند ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن سراپا یاسیت اور قنوطیت کا غلبہ نہ ہوا تھا۔ وہ ٹی وی ڈراموں فلموں سب میں دلچسپی لیتی تھی۔ گیت اور موسیقی کا لطف لیتی تھی، کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ باغات و چمن کی سیر کرتی تھی۔ ملاقاتی رشتہ داروں سے پُر لطف گفتگو کرتی تھی۔ کبھی کبھار موٹر میں گھومنے بھی چلی جاتی تھی یوں اس نے اپنے آپ کو صحت مند اور تندرست رکھا ہوا تھا۔

اس کا بچپن کا ساتھی مخلص اور ہمدرد شاہ میر اس سے باقاعدگی سے ملنے آتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اچھی اچھی باتیں کرتا تھا۔ اس کا حوصلہ بہت بندھاتا رہتا تھا۔ اسے اس کے مستقبل کی بے حد فکر رہتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ علی شیر اسے جلد از جلد پلاسٹک سرجری کے لیے امریکہ لے جائے تاکہ اس کا چہرہ ٹھیک ہو جائے پھر وہ اس سے شادی کر لے، لیکن علی شیر اب تک کوئی نہ کوئی عذر کر کے اُسے ٹالتا چلا آ رہا تھا۔ اس پر شاہ میر کو غصہ بھی آتا تھا اور افسوس بھی ہوتا تھا۔ دلنشین اس کی وجہ بخوبی جانتی تھی لیکن اس نے شاہ میر کو بھی کچھ نہ بتایا تھا۔ اب تو اس کی عزیز از جان سہیلی شاہ گل نے بھی اس کے پاس آنا قریب قریب چھوڑ دیا تھا۔

شروع شروع میں اس نے اس کے ساتھ خوب ہمدردی جتائی تھی۔ اس کے حادثے اور چہرے کی تباہی پر آنسو بہائے تھے۔ وہ ہر روز اس کے پاس آ جاتی تھی اور دیر تک بیٹھی بڑی میٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی آمد میں وقفے پڑنے لگے تھے۔ اس کی باتوں میں بھی سردمہری اور بیزاری کا رنگ پیدا ہونے لگا تھا۔ اب اس کا آنا یوں ہو گیا تھا گویا وہ غلطی سے وہاں آ نکلی ہو۔ لیکن دلنشین کبھی اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہمیشہ جیسی اپنائیت اور محبت سے پیش آتی تھی۔

علی شیر کا رویہ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ اس سے خوب ہمدردی جتانے والا، اسے خوب تسلی دلاسے دینے والا، اسے ہر دم اپنی محبت و چاہت کا یقین دلانے والا علی شیر بھی اب اس سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ اب بھی شہد آگیں

تھا لیکن اس میں گھلی ہوئی کڑواہٹ اور بیزاری اسے صاف محسوس ہوتی تھی۔ اس میں ایک طرح کی نفرت اور کراہیت کی جھلک ہوتی تھی۔ اس کی لگاوٹ بھری باتوں میں منافقانہ سی گرمجوشی بھی اب مفقود ہوتی جارہی تھی۔ اکثر اوقات وہ جھنجھلایا ہوا سا بھی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دلنشین کی خبر گیری اور دیکھ بھال وہ بدستور پہلے جیسی کر رہا تھا۔

اسی طرح وقت گزرتے گزرتے سال ہونے کو آچکا تھا۔ اس نے اب دلنشین کی حویلی میں ہی ڈیرے ڈال دیے تھے۔ جہاں نوکروں چاکروں کی بھاری تعداد ہر دم اس کی خدمت پر کمر بستہ رہتی تھی۔ حویلی کی ہر چیز اس کے تصرف میں رہتی تھی۔ وہ اس کے ہر معاملے میں دخیل تھا۔ شادی سے پہلے ہی وہ وہاں کا مالک بنا ہوا تھا۔ اس کے اور شاہ گل کے تعلقات بھی اب خوب ترقی کر رہے تھے۔ دلنشین ان سے خفیہ ان کی باتیں بھی سنتی رہتی تھی اور ان کی اپنے بارے میں سازشوں سے بھی آگاہ ہوتی رہتی تھی۔ وہ دونوں اس سے اب اس حد تک نفرت کرنے لگے تھے کہ اس کی جان لینے تک کا سوچنے لگے تھے۔

دلنشین کے ہونٹوں پر ایک طنز و تمسخر بھری مسکراہٹ بکھرتی چلی گئی۔ ان کے لیے اسے زہر دے دینا، کسی حادثے میں ہلاک کر دینا یا ہمیشہ کے لیے کہیں غائب کر دینا بالکل آسان تھا۔ لیکن وہ ایسا کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ایسی صورت میں علی شیر ہی مشکوک ٹھہرتا۔ پھر ایک وجہ اور بھی تھی کہ اس سے شادی نہ ہونے پر دلنشین کی بے اندازہ دولت اور جائیداد اسے ہرگز نہ مل سکتی تھی علی شیر کئی مرتبہ اشاروں، اشاروں میں اور بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ شادی کے بعد وہ کیا ایسا ارادہ رکھتی تھی کہ اپنی تمام جائیداد اس کے نام لکھ دے؟ یا اُسے اپنے مالی امور کی ذمہ داری سونپ دے؟ اور ایسے ہر موقع پر اس نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے وہ اس کی باتیں سمجھی نہیں تھی۔

دلنشین کے ہونٹوں پر طنز و تمسخر بھری مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

اس رات کھانے کی میز پر وہ تنہا تھی۔ علی شیر جانے کہاں گیا ہوا تھا جو اب تک نہ لوٹا تھا۔ اس نے آرام سے کھانا کھایا اور باہر ٹیرس میں آگئی۔ خنک و عطر بیز ہوا میں چہل قدمی کرتے وہ مسلسل گہری سوچوں میں مستغرق رہی۔

اگلے دن علی شیر واپس آگیا۔ اس وقت وہ حسبِ عادت سر پر چادر لیے رومال سے آدھا چہرہ چھپائے صوفے پر بیٹھی تھی۔

"ہیلو نشی! سناؤ کیسی ہو؟" وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں تم کہیں گئے ہوئے تھے؟"

"ہاں پشاور...... تم اس وقت سوئی ہوئی تھیں اس لیے میں نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔"

"کوئی کام تھا کیا؟"

"بہت ضروری کام...... اس کی تفصیل تمہیں بور ہی کرے گی۔ ہاں تم گھبرائی تو نہیں پیچھے سے؟"

"نہیں تمہارے جانے کے بعد شاہ میر آگیا تھا۔ اس کے ساتھ وقت اچھا کٹ گیا۔"

"وہ کس لیے آیا تھا یہاں؟" علی شیر کے لہجے میں رقابت اور خفگی کی جھلک تھی۔

"وہ تو آتا ہی رہتا ہے یہاں...... خواہ تم یہاں موجود ہو یا نہ ہو۔"

"وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے نا؟" علی شیر کا

لہجہ ویسا ہی کاٹ دار تھا۔

''ہاں وہ میرا بچپن کا ساتھی ہے، بے حد مخلص اور سچا رفیق، میری پھوپی کا بیٹا ہے۔ خون کے رشتے سے میں بھی اس سے محبت رکھتی ہوں۔''

''مجھ سے بھی زیادہ؟'' دلنشین نے ایک دم چہرہ اس کی طرف پھیرا۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو علی؟ ان رشتوں کی محبت میں جو فرق ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ شاہ میر سے میں خون کے رشتے سے محبت رکھتی ہوں اور تم سے دوسری حیثیت سے......'' اس کے لہجے میں خفگی کی واضح جھلک تھی۔

''اوہ معاف کرنا میں بھی کیا باتیں چھیڑ بیٹھا، ہاں تم نے کیا سوچا ہے؟'' علی شیر کا لہجہ ایک دم ہی گھلاوٹ بھرا ہو گیا تھا۔

''کس بارے میں؟''

''شادی کے بارے میں، اب تو ہماری شادی ہو جانی چاہیے نشی۔'' علی شیر کے بظاہر نرم و شیریں لہجے میں کسی تمنا یا خواب کا رنگ نہیں تھا۔

دلنشین نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی۔

''شادی...... تم ایسی حالت میں مجھ سے شادی کرو گے؟ پہلے میرے چہرے کی پلاسٹک سرجری تو ہو لے۔ یہ پہلے جیسا نہیں تو کچھ گوارا سا تو دکھائی دینے لگے۔ پھر ہی شادی کی سوچنا، میرے تو بال بھی نہیں رہے۔ وہ بھی لگوانے پڑیں گے۔''

''یہ سب کام بعد میں بھی ہو سکتے ہیں نشی، پہلے شادی ہو لے، اماں بھی اس پر راضی ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے وہ تمہیں کتنا عزیز رکھتی ہیں۔ تم خواہ کیسی بھی ہو، انہیں دل و جان سے عزیز ہو۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم جیسے وجیہہ و حسین دولہا کے پہلو میں لوگ ایک منہ جلی، گنجی، اندھی کو کھڑے دیکھیں۔''

''لوگوں کو چھوڑو، تمہیں میرا خیال کرنا چاہیے۔ میری خوشی، میری خواہ سب پر مقدم رکھنی چاہیے۔''

علی شیر کے لہجے میں غصے اور جھنجلاہٹ کے ساتھ ہی نفرت کی جھلک بھی دلنشین کو صاف محسوس ہوئی تھی۔

''ناراض نہ ہو علی...... مجھے ہمیشہ تمہاری مرضی کا احترام رہا ہے تم جانتے ہی ہو۔''

''پھر تم شادی سے کیوں کترا رہی ہو؟ اپنی رضامندی کیوں نہیں دے دیتیں؟''

''اس سلسلے میں تم پھوپی صفیہ سے بات کرو۔ ڈیڈی کے بعد وہی میری بزرگ ہیں۔''

''وہ کیا مان جائیں گی؟ یہ قدغن تو نہ لگائیں گی کہ پہلے پلاسٹک سرجری ہو لے پھر ہی شادی ہو۔''

''وہ میری مرضی کے خلاف کچھ نہ کریں گی۔ رہا شاہ میر تو اسے ہمیشہ میری خوشیاں عزیز رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں جلد ہی اُن کے گاؤں جا کر اُن سے بات کرتا ہوں۔ اماں کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔''

اسی وقت ملازمہ نے کمرے میں داخل ہو کر انہیں کھانا لگنے کی اطلاع دی اور دونوں وہاں سے اُٹھ کر ڈائننگ روم میں چلے آئے۔

کھانے کی میز پر علی شیر مسلسل باتیں کرتا رہا۔ شادی کے پروگرام اور مستقبل کے منصوبے بناتا رہا۔ دلنشین بڑے پُرسکون انداز میں کھانا کھاتے ہوئے خاموشی سے اس کی باتیں سنتی

رہی۔ پھر جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو علی شیر تھکاوٹ اور نیند کا بہانہ بنا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دلنشین تھوڑی دیر کوریڈور میں کھڑی سن گن لیتی رہی۔ پھر محتاط قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج کی ملحقہ ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی اور وہاں ایکسٹینشن کا فون اٹھالیا۔ اور سانس روک لی۔ جلد ہی اسے علی شیر اور شاہ گل کی ہائے ہیلو کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر علی شیر بولا۔

''میں نے اس گھناؤنی چڑیل کو شادی پر آمادہ کرلیا ہے شاہ گل جانم...... چند دنوں بعد میں اماں کو لے کر اس کی پھوپی کے پاس جاؤں گا تاکہ وہ اُن سے مل کر شادی کی بات کریں۔ پھر آگے ہمارے منصوبے پر کام کرنا بالکل آسان ہوجائے گا۔''

''اچھا...... ذرا تفصیل سے تو بتاؤ۔''

علی شیر نے اسے اپنے اور دلنشین کے درمیان ہونے والی تمام باتیں بتائیں پھر بولا۔

''وہ بھتنی تو شادی سے پہلے پلاسٹک سرجری پر اصرار کیے جارہی تھی۔ لیکن میں نے اسے اس سے پہلے شادی پر آمادہ کر ہی لیا۔ شادی کے بعد بھلا کس احمق نے اسے پلاسٹک سرجری کروانے امریکہ لے جانا ہے۔'' دوسری طرف سے شاہ گل کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

''اور کیا...... اس نے تو شادی کے بعد قبر میں جانا ہے۔ تم کیا لے آئے پشاور سے وہ گولیاں؟''

''ہاں خاصی بھاری مقدار میں لایا ہوں۔ بس شادی کے پہلے ہی دن سے میں اس بھتنی کو چائے یا کوفی میں یہ گولیاں ڈال کر دینا شروع کرتا ہوں۔ ان گولیوں کے زیر اثر اس کا دماغ آہستہ آہستہ ماؤف ہونا شروع ہوجائے گا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں تباہ ہونے لگیں گی۔ اس طرح ہم اس سے اس کی جائیداد کی منتقلی کی قانونی دستاویزات پر باآسانی دستخط کروالیں گے۔'' اتنا کہہ کر علی شیر نے ایک قہقہہ بلند کیا۔

دوسری طرف شاہ گل کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

''خون منصوبہ ہے۔ بس تمہاری جلد از جلد اس بھتنی سے شادی ہوجائے۔ اس کی اس طرح کی موت سے کہ ان گولیوں کے زیر اثر وہ آہستہ آہستہ مفلوج ہوکر موت کے منہ میں چلی جائے گی۔ کسی کو تم پر شک نہ ہوگا۔ تمہیں اس سے چھٹکارا بھی مل جائے گا۔ اس کی بے اندازہ جائیداد بھی تمہارے قبضے میں آجائے گی۔''

''اور تم بھی......'' علی شیر نے قہقہہ لگایا۔

''پھر شاہ گل جانم ہمارے مزے ہی مزے ہوگے۔'' شاہ گل ہنسی۔

''ہاں واقعی...... اللہ وہ دن جلد لائے۔ لیکن تم ذرا احتیاط برتنا۔ وہ کم بخت شاہ میر تمہیں شروع ہی سے شک کی نگاہ سے دیکھتا چلا آرہا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے مجھے اس شخص سے سخت نفرت ہے۔ شادی کے بعد میں اس کا حویلی میں داخلہ بند کرواؤں گا۔ اس کی ماں کا بھی، مجھے وہ بڑھیا بڑی حرفوں کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔''

''وہ مجھے بھی ذرا نہیں بھاتی...... وہ مجھے جانے کیوں مشکوک نظروں سے دیکھتی ہے۔''

''خیر...... شادی کے بعد سب کا علاج ہوجائے گا۔ ہاں اب تم مجھ سے ملنے یہاں نہ آنا۔ شادی ہوجانے تک ہمیں انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

دونوں کے درمیان الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ پھر سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دلنشین اپنا فون کریڈل پر رکھ کر باہر آگئی۔ اس وقت اس کے

ہونٹوں پر بے پناہ طنزیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

شام کی چائے سے فارغ ہونے کے بعد جب علی شیر اپنے کسی کام سے حویلی سے باہر چلا گیا تو دلنشین لاؤنج میں چلی آئی۔ وہاں اس نے فون پر کافی وقت گزارا۔ پھر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم سے تاثرات پھیلے ہوئے تھے لیکن وہ پُرسکون تھی۔

رات کے کھانے پر علی شیر غیر حاضر تھا لیکن دلنشین نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول کچھ دیر ٹیرس پر چہل قدمی کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر سو رہی۔

اگلی صبح جب وہ ناشتے کی میز پر پہنچی تو علی شیر بھی وہاں چلا آیا۔

''ہیلو نشی...... کیسی ہو، رات اچھی نیند آئی نا؟'' اس کے لہجے میں اس کی مخصوص منافقانہ سی گھلاوٹ تھی۔

''اوہ علی تم کب آئے؟''

''رات آ گیا تھا۔ یہی گیارہ بارہ بجے، تم اس وقت سونے جا چکی تھیں۔'' ناشتے کے دوران ان کے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد علی شیر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے آج میں گاؤں چلا جاؤں۔ وہاں سے اماں کو لے کر تمہاری صفیہ پھوپی کے پاس شادی کی بات کی جائے۔''

''نہیں علی آج نہیں...... کل یا کسی اور دن چلے جانا۔ آج کچھ مہمان یہاں آ رہے ہیں۔ اس لیے یہاں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔''

''مہمان؟ یہ کون لوگ ہیں۔'' علی شیر کمرے سے جاتے جاتے رُک گیا۔

''ڈیڈی کے دوست ہیں، بہت پرانے...... تمہیں اُن سے مل کر خوشی ہوگی۔''

''اچھا...... کب آ رہے ہیں یہ؟'' علی شیر کا لہجہ کچھ ناخوشگوار اور جھنجلاہٹ کی جھلک لیے ہوئے تھا جیسے اسے ان مہمانوں کی ایسی غیر متوقع آمد اچھی نہ لگی تھی۔

''بس دس بجے تک...... وہ یہاں ٹھہریں گے نہیں۔ مل کر چلے جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے میں رُک جاتا ہوں۔ لیکن گاؤں جانے کی تیاری تو مجھے کرنی ہی ہے۔''

اس کے جانے کے بعد دلنشین کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کے جھلسے ہوئے کٹے پھٹے ہونٹوں پر ناقابلِ فہم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اس کے کمرے میں اس کی ملازمۂ خاص زینت جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔

''بی بی...... آپ کے کپڑے تیار کر دیے ہیں۔'' اس نے دلنشین کو اطلاع دی۔

''شکریہ...... آؤ ذرا میرا ایک کام کرو۔'' دلنشین بولی اور ڈریسنگ روم میں داخل ہوگئی۔ وہاں اس نے ایک وارڈروب کھول کر اس کے ایک کیبنٹ سے ایک چھوٹا سا پیکٹ اور ایک لمبا سا سفید لفافہ نکالا اور ڈریسنگ روم سے باہر آ گئی۔

''یہ لو زینب، یہ پیکٹ اور یہ خط تم شاہ گل کو دینا اور اسے کہنا کہ یہ خط وہ اپنے کمرے میں جا کر پڑھے، یہ چیزیں تم اسے کسی کے سامنے نہ اُسے دینا۔''

''اچھا بی بی...... میں ابھی جا کر انہیں یہ چیزیں دے آتی ہوں۔'' زینب مستعدی سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب علی شیر نے پورٹیکو میں کاروں کے رُکنے کی آوازیں

سنیں۔

''شاید وہ مہمان آ گئے......؟'' اس وقت اس پر خاصی بھناہٹ طاری ہو رہی تھی۔ غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنا گاؤں جانے کا پروگرام ہرگز کل تک ملتوی نہ کرے گا بلکہ ان مہمانوں کے جانے کے بعد فوراً ہی گاؤں روانہ ہو جائے گا اور اگلے ہی دن اپنی ماں کو لے کر پھوپی صفیہ کے گاؤں چلا جائے گا۔ اب جبکہ مستقبل کے تمام منصوبے عملدرآمد کے لیے تیار ہو چکے تھے تو شادی میں دیر کرنا حماقت ہی ہوتی۔

وہ بیگ میں کپڑے رکھ ہی رہا تھا کہ ملازم کریم خان کمرے میں داخل ہو گیا۔

''صاحب...... مہمان آ چکے ہیں۔ نشی بی بی نے آپ کو بلوایا ہے۔''

''اچھا چلو میں آتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ اور اپنا لباس ٹھیک کیا۔ بال سنوارے اور کمرے سے نکل کر لاؤنج کی سمت ہو لیا۔

جب وہ لاؤنج میں پہنچا تو اندر کا نظارہ دیکھ کر اسے حیرت و بے یقینی کا ایسا شدید دھچکا لگا کہ وہ غش کھاتے بچا۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگوں میں ایک تو شاہ میر تھا۔ دوسرے شہباز آفریدی کے دوست ڈاکٹر جہاں زیب، تیسرا فرد بابا خان گل ڈرائیور تھا جو کار کے حادثے میں مر چکا تھا اور چوتھا فرد، وہ دلنشین تھی۔ منہ جلی، گنجی، اندھی نہیں تھی بلکہ وہی مجسمۂ حسن و جمال...... فتنہ گر...... راہزن ہوش و تمکین...... وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ فریبِ نظر کا شکار ہو رہا تھا۔ کمرے میں موجود افراد اس کی کیفیات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر جہاں زیب پکارے۔

''اندر آ جاؤ علی شیر! تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔''

علی شیر بدستور حیرتوں اور بے یقینیوں کے گرداب میں چکرا رہا تھا۔ اور کچھ خوف زدہ اور سراسیمہ سا بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ اس میں قدم اٹھانے کی قوت تھی نہ ہمت، وہ کسی سنگی ستون کی طرح اپنی جگہ پر گڑ کر رہ گیا تھا۔

''آ بھی چکو علی شیر...... ہمارے ساتھ آ کر بیٹھو۔'' ڈاکٹر جہاں زیب پھر پکارے۔ لیکن علی شیر بدستور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دلنشین کو دیکھے جا رہا تھا۔

''نشی...... یہ تم...... تم......'' اس کی زبان سے بمشکل تمام لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے نکلا۔

''ہاں میں...... یہ تم کوئی خواب نہیں دیکھ رہے علی شیر...... میں دلنشین سائرہ آفریدی واقعی تمہارے سامنے موجود ہوں۔'' دلنشین مسکرا کر بولی۔

''لیکن...... لیکن......'' علی شیر نے بمشکل تمام گردن موکر ڈرائیور خان گل کی طرف دیکھا۔

''بیٹھ جاؤ علی شیر...... تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' شاہ میر بولا۔

اس کے اشارے پر خان گل اٹھا اور علی شیر کو بازو سے پکڑ کر ایک صوفے پر لا بٹھایا۔

''تم حیران ہو رہے ہو گے نا علی شیر کہ میں اس وقت وہ منہ جلی، گنجی، اندھی، بھتنی جیسا کہ تم اور تمہاری محبوبہ دلنواز شاہ گل مجھے کہا کرتے تھے کیوں نہیں دکھائی دے رہی اپنی اصل شکل و صورت میں کیوں دکھائی دے رہی ہوں اور یہ بابا خان گل بھی کیوں زندہ سلامت دکھائی دے رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حادثہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ سب محض ایک ڈرامہ تھا۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

علی شیر بری طرح سے چونکا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن محض پہلو بدل کر رہ گیا۔

''ہاں یہ ایک ڈرامہ تھا جس کی تیاری میں بابا خان گل اور انکل جہاں زیب نے میری مدد کی۔ اسے انہی کی مدد سے میں نے ترتیب دیا تھا۔ اس دن اسلام آباد سے آتے ہوئے جب راستے میں موسلادھار بارش ہو رہی تھی تو طے شدہ منصوبے کے مطابق بابا خان گل نے مجھے پشاور انکل جہاں زیب کے گھر اُتارا اور خود کار لے کر اپنے گاؤں جمرود چلے گئے۔ جہاں انہیں اس وقت تک پوشیدہ رہنا تھا جب تک انہیں میری طرف سے حویلی پہنچنے کی ہدایت نہ مل جاتی۔ منصوبے کے مطابق میں انکل جہاں زیب کے گھر دو ہفتے تک مقیم رہی۔ پھر ایک دن انہوں نے میرے سر اور چہرے پر ایک بے حد بھیانک سا ماسک جو انہوں نے باہر سے منگوایا تھا چڑھوا دیا۔'' اس نے رُک کر علی شیر کو عمیق مگر مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

''لیکن...... لیکن...... تم نے ایسا کیوں کیا نشی؟'' علی شیر کے منہ سے بمشکل ہی آواز نکل سکی۔

''اس کا جواب تمہیں ابھی مل جاتا ہے۔'' دلنشین مسکرا کر بولی اور اپنے سامنے میز پر پڑا ہوا چھوٹا سا سیاہ رنگ کا پرزہ سا اٹھا لیا۔

''یہ ڈیوائس تم دیکھتے ہو علی شیر کتنی چھوٹی سی ہے۔ اسے کسی بھی چھوٹی سی جگہ میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ڈیوائس میری سفید چھڑی کے دستے میں بنے ہوئے ایک خفیہ خانے میں فٹ تھی۔ یہ بہت طاقتور ڈیوائس ہے۔ اس میں دور اور قریب کی آوازیں صاف اور واضح طور پر ریکارڈ ہو سکتی ہیں۔ میں جب فرانس گئی تھی تو وہاں سے یہ خرید کر لائی تھی اس وقت میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال موجود نہ تھا کہ مجھے اسے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن یہ میرے واقعی بہت کام آئی۔ اس میں جو کچھ ریکارڈ ہوتا رہا ہے وہ انکل جہاں زیب اور شاہ میر سن چکے ہیں۔ اب تم بھی سن لو۔'' اتنا کہہ کر اس نے میز پر رکھا چھوٹا سا ریکارڈر اپنی طرف سرکایا اور اس کا سوئچ آن کر دیا۔ جلد ہی اس میں علی شیر اور شاہ گل کے درمیان ہونے والی باتیں سنائی دینے لگیں۔

علی شیر کا یہ حال کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑ چکی تھی۔ وہ انتہائی خوف زدگی اور حواس باختگی کے عالم میں ریکارڈر کو گھور رہا تھا۔ پھر جب ریکارڈر خاموش ہوا تو وہ نیم جان سا صوفے پر ایک طرف لڑھک گیا۔

دلنشین کے اشارے پر بابا خان گل نے اسے گلاس ٹھنڈا پانی بھر کر پلایا۔

جب اس کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو دلنشین بولی۔

''علی شیر...... اب تو تمہیں معلوم ہو گیا نا کہ نہ وہ حادثہ ہوا تھا نہ کار جلی تھی نہ بابا خان گل ہلاک ہوئے تھے اور نہ ہی میرا چہرہ بگڑا تھا۔ جب میرا چہرہ درحقیقت صحیح سلامت تھا تو ظاہر ہے آنکھیں بھی صحیح سلامت تھیں۔ میں سب کچھ دیکھا کرتی تھی۔ شاہ گل کی بات اور ہے اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر اگر منہ بگاڑتی نفرت و کراہیت ظاہر کرتی تھی تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن تم جو تاثرات ظاہر کیا کرتے تھے یعنی تنفر و کراہیت سے منہ بنانا، گھن کھانا، نفرت بھری نظروں سے دیکھنا۔ اکثر تھوک بھی دینا وہ میرے لیے تمہارے جذبات کے واضح عکاس ہوتے تھے۔ انہی کیفیات کا اظہار تمہاری والدہ محترمہ کے تاثرات سے بھی ہوتا تھا۔

صرف شاہ میر تھا جو میرے ساتھ ہمیشہ کی طرح پُر خلوص رہا۔ میرا سچا ہمدرد، بے غرض اور بے لوث ساتھی رہا۔ اور پھوپی صفیہ بھی...... وہ مجھ سے پہلے سے بھی بڑھ کر محبت کرنے لگی تھیں۔'' اتنا کہتے ہوئے اُس نے رُک کر شاہ میر کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراتی ہوئی سحر طراز آنکھوں میں بے پناہ پیار کی قندیلیں جل رہی تھیں۔

''مجھے اس بات پر بے حد حیرت ہوا کرتی تھی کہ ڈیڈی نے آخر اپنی بہن پھوپی صفیہ کی بجائے میرا رشتہ اپنی خالہ زاد بہن خالہ مریم کی طرف کیوں کر دیا تھا؟ اس کا جواب مجھے لائبریری میں محفوظ ڈیڈی کی خفیہ ڈائری میں ملا۔ دادی نے اپنی بہن سے خالہ مریم کو ڈیڈی کے لیے اس وقت مانگ لیا تھا جب وہ بمشکل چند ماہ کی ہی تھیں۔ یہ بات بہنوں بہنوں میں ہی طے ہوئی تھی اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ دادا کو بھی نہیں...... ڈیڈی کو بھی اس سے لاعلم رکھا گیا۔ دراصل دادی حضور چاہتی تھیں کہ جب ڈیڈی جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئیں تو انہیں اس رشتے سے آگاہ کرتے ہوئے اُن کی شادی خالہ مریم سے کر دی جائے۔ لیکن ڈیڈی کو وہاں میری ماں پسند آ گئیں وہ انہیں بیاہ لائے۔ اس وقت دادی نے انہیں بتایا کہ انہوں نے اُن کا رشتہ شروع ہی سے اپنی بہن کے گھر طے کر رکھا تھا۔ ڈیڈی کو ظاہر تھا اس پر افسوس ہونا ہی تھا۔ شاید انہیں خالہ مریم کے ساتھ ہونے والی بے انصافی اور ظلم کا احساس ہوگا جو انہوں نے ماما کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کی۔ اور میرا رشتہ علی شیر سے کر دیا۔

خالہ مریم شاید اس رشتے پر کبھی آمادہ نہ ہوتیں لیکن انہیں ڈیڈی کی طرف سے ٹھکرائے جانے کا شدید غم وغصہ تھا۔ حالانکہ اس میں ڈیڈی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر انہیں دادی شروع ہی سے اس رشتے کے بارے میں بتا دیتیں تو وہ ہرگز ماما سے شادی نہ کرتے اور وطن واپس آ کر خالہ مریم سے شادی کر لیتے۔ ان کی ماما سے شادی نے خالہ مریم کو شدید دکھ ہی نہیں پہنچایا بلکہ انہیں شدید توہین و تذلیل کا احساس بھی دلایا۔ جس نے اُن میں شدید قسم کے انتقامی جذبات پیدا کر دیے۔ ان جذبات کو وہ اپنے بیٹے علی شیر میں منتقل کرتی رہیں۔ یوں علی شیر بھی ڈیڈی اور میرے خلاف سازش میں شریک ہو گیا۔

ان ماں بیٹا کی سازش یہ تھی کہ شادی کے بعد کسی ترکیب سے، موثر قسم کی چالوں سے میری تمام جائیداد پر قبضہ جما لیا جائے پھر مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا جائے۔ یہ باتیں مجھے خالہ مریم کے گھر کی ایک ملازمہ نے بتائیں جو یہاں حویلی میں کام کرنے والی ایک پرانی ملازمہ کی رشتہ دار ہے۔''

دلنشین نے علی شیر کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ جس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''وہ خادمہ اب تمہیں اپنے گھر میں نہیں ملے گی علی شیر...... وہ اب تمہارے گھر سے جا چکی ہے۔ خیر...... مجھے اس سازش کا یقین نہیں تھا۔ اس لیے میں نے علی شیر کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ اس نے جس طرح شاہ گل سے تعلقات استوار کیے اور جس طرح اسے میرے خلاف سازشوں میں شریک کیا وہ سب آپ لوگ سن چکے ہیں۔ یہاں ایک بات اور سامنے آئی تھی کہ علی شیر کو میری دولت کے ساتھ ہی میرے حسن و جمال نے بھی مسحور کر رکھا تھا۔ وہ دونوں چیزوں کا حریص تھا۔ میں ن، ہر چند کہ اس کی ضرورت نہیں تھی، اُسے آزمانے کا فیصلہ کیا کہ اگر میں ایسی خوبصورت نہ ہوتی بلکہ خاصی بدصورت بلکہ کریہہ النظر ہوتی تو کیا وہ مجھ سے شادی پر آمادہ ہو جاتا یہ ڈرامہ رچانے کا فیصلہ کیا۔ جس کی تفصیل آپ لوگوں کو معلوم ہو چکی

ہے۔" اتنا کہتے ہوئے اُس نے نفرت بھری نظریں علی شیر پر ڈالیں اور بولی۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا علی شیر کہ میں تمہیں اور تمہاری محبوبہ نواز شاہ گل کو اقدامِ قتل کے جرم میں حوالۂ پولیس کر دوں۔ لیکن مجھے رشتہ داری کا لحاظ ہے اور خاندانی عزت و وقار کا خیال...... اب تم یہ کرو کہ یہاں سے اپنا سامان اٹھاؤ اور ہمیشہ کے لیے دفعان ہو جاؤ۔ میں تمہاری محبوبہ دلنواز شاہ گل کو بھی اس ریکارڈ کی ایک نقل بھجوا چکی ہوں اور خط بھی کہ اس پر بھی اب میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ میں اسے بھی گرفتار کروا سکتی تھی لیکن حقوقِ ہمسائیگی کا خیال ہے اور شرافت وضع داری کا بھی۔" اتنا کہتے ہوئے وہ بابا خان گل کی طرف مڑی۔

"بابا خان گل آپ جا کر دوسرے ملازموں کی مدد سے اس بدبخت کا سامان بندھوائیے اور اسے حویلی سے باہر نکال دیجیے۔" بابا خان گل اپنی جگہ سے اُٹھ کر علی شیر کی طرف بڑھ گئے۔ جواب شدید خوف و گھبراہٹ کے ساتھ ہی شدید احساس توہین و تذلیل سے لرزاں وحشت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

"چلیے...... اٹھیے اپنی جگہ سے......"

علی شیر صوفے سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت ڈاکٹر جہاں زیب جو اب تک خاموش بیٹھے سگار سے لطف اندوز ہوتے رہے تھے نے ہاتھ اٹھایا۔

"ذرا رکو......" علی شیر ایک دم ہی چلتے چلتے زمین میں گویا گڑ سا گیا۔

ڈاکٹر جہاں زیب نے اپنے سامنے میز پر رکھا بھورے رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ اپنی طرف سرکایا اور اس میں سے ایک نیلے رنگ کا بڑا سا پیکٹ باہر نکال لیا۔ اس پر نظریں پڑتے ہی علی شیر کی حالت غیر ہونے لگی۔

"تم نے واقعی نشی بیٹی کو ہلاک کرنے کا خوب طریقہ ڈھونڈا علی شیر...... ان گولیوں نے اس پر واقعی تمہارے حسب الخیال اثر کرنا تھا۔ تمہاری اور شاہ گل کی فون پر ہونے والی باتیں سننے کے بعد نشی بیٹی نے تمہاری غیر حاضری میں تمہارے کمرے میں یہ گولیاں تلاش کی تھیں اور انہیں بحفاظت اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب میں انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ یہ گولیاں اور تمہاری باتوں کا ریکارڈ تمہیں باآسانی پھنسوا سکتے ہیں۔ اس لیے تم آئندہ نشی بیٹی کو کوئی نقصان پہنچانے کا مت سوچنا سمجھے تم......"

علی شیر میں کچھ کہنے کی ہمت تھی نہ سکت...... وہ حواس باختہ اور سحر زدہ سا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ بابا خان گل نے آگے بڑھ کر اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"چلیے صاحب زادے...... نکلیے یہاں سے۔"

علی شیر مرے مرے لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا بابا خان گل کے ساتھ کمرے میں سے نکل گیا۔

ڈاکٹر جہاں زیب نے قریب اختم سگار ایش ٹرے میں کچلا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

"دلنشین بیٹی...... یہ ڈرامہ بالآخر اپنے انجام کو پہنچا۔ تمہارا مقصد پورا ہو گیا۔ میری دعا ہے کہ تم اور شاہ میر ایک دوسرے کی رفاقت میں شاد و آباد رہو۔ شاہ میر تمہارے لیے بہترین شوہر ثابت ہوگا اور تم اس کے لیے بہترین بیوی...... اللہ تعالیٰ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ ہاں اپنی شادی میں مجھے مدعو کرنا نہ بھولنا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے دلنشین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شاہ میر سے مصافحہ کیا اور میز پر سے وہ بھورا لفافہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئے۔

دلنشین شاہ میر کی طرف مڑی۔ گہرے نیلے رنگ کے قیمتی مخملیں لباس میں ملبوس شانوں پر

تاروں بھرا دوپٹہ لیے اس وقت کوئی ماورائی مخلوق معلوم ہورہی تھی۔ اس کے بے پناہ حسین وتابناک چہرے پر انوکھی چمک اور بڑی بڑی روشن سیاہ سحر طراز آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اس کے بے تحاشہ گھنے دراز سیاہ گھنگھریالے بال بڑی نفاست اور خوبصورتی سے سنورے تھے۔ اسے دیکھتے ہوئے شاہ میر کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جارہی تھی۔ وہ بے اختیار سا ہوا جارہا تھا۔

کل رات دلنشین کے گھر کا پرانا ملازم کریم خان اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے اسے دلنشین کی طرف سے ایک پیکٹ اور خط دیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ اس وقت ایک ضروری کام سے جمرود جارہا تھا۔ اس کام کی نوعیت اس نے اس سے نہ پوچھی تھی۔ پھر جب اس نے دلنشین کا وہ لمبا چوڑا خط پڑھا تھا جس میں اول تا آخر تمام واقعات کی تفصیلات لکھی تھیں اور اس پیکٹ میں بند علی شیر اور شاہ گل کی باتوں کا ریکارڈ سنا تھا تو وہ کتنی ہی دیر تک گم سم سا رہا تھا۔ شدید غیظ وغضب، نفرت، رنج اور صدمے کی تیز وتند لہریں بار بار اس پر حملہ آور ہوتیں رہی تھیں۔ وہ بری طرح سے پیچ وتاب کھاتا جلتا بھنتا رہا تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ ابھی جا کر علی شیر کو گولی ماردے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس بات پر بھی کچھ غصہ اور رنج سا محسوس ہوتا رہا تھا کہ دلنشین نے اُسے اعتماد میں نہ لیا تھا۔ ہر بات اس سے چھپائی تھی۔

''تمہیں مجھ سے شکایت ہوگی نا شاہ میر کہ میں نے اس معاملے میں تمہیں اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟'' دلنشین کے حسین سرخ ہونٹوں پر چمکتی دمکتی شوخ سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''قدرتی بات ہے نشی...... تم نے ایسا کیوں کیا؟'' شاہ میر کا شاکی لہجہ خفگی کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

''اس لیے کہ تم شدید غصے میں آجاتے اور معاملہ بگڑ جاتا جبکہ میں نہایت پُرامن طریقے سے سب کچھ طے کرنا چاہتی تھی۔ اس میں بے شک وقت زیادہ لگا۔ لیکن نتیجہ اچھا نکلا۔

''بہت اچھا...... بہت ہی اچھا......'' شاہ میر نے اس کے حسین ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لیے۔

''میں نے شروع ہی سے تمہیں اپنا سمجھا تھا نشی...... میرا خیال تھا ماموں مجھے تمہارے لیے پسند کرلیں گے۔ لیکن جب انہوں نے میرے بجائے علی شیر کو تمہارے لیے پسند کرلیا تو مجھے ناقابلِ بیان رنج اور صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن میں خاموش ہی رہا۔ نشی...... میں نے ہمیشہ تم سے محبت رکھی۔ تم ہر حالت میں مجھے عزیز رہیں۔ میں تمہارے لیے ہر ایثار، ہر قربانی دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہا۔ عزیز از جان نشی...... میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میرے دل میں تمہارے لیے کیسے جذبات موجزن ہیں۔''

دلنشین نے اپنی خوبصورت روشن پیشانی اس کے چوڑے شانے سے ٹکادی۔

''میرے اچھے شاہ میر...... میرے اصل حقدار تو تم ہی تھے۔ ڈیڈی یہ بات نہ سمجھ سکے۔ میں بھی اس خیال سے علی شیر سے رشتے پر آمادہ ہوگئی کہ ڈیڈی دل کے پرانے مریض چلے آرہے تھے۔ میرا انکار انہیں کوئی نقصان نہ پہنچادے۔ یہ مجھ پر مبنی ظلم تھا تم پر بھی...... اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے شاہ میر...... اب ہم دونوں مل کر اپنی زندگی کے حسین ترین سفر کا آغاز کریں گے۔''

''بہت جلد......'' دلنشین کا حسین وجود شاہ میر کے بازوؤں میں سمٹ گیا۔

''بہت جلد نشی...... بہت جلد......''

☆☆......☆☆......☆☆

مِنی ناول

نسرین اختر نینا

سپنے سہانے

''مرد کبھی بھی اُس عورت سے شادی نہیں کرتا جو اُسے شادی کے بغیر ہی حاصل ہو جائے۔'' وہ سمجھ چکی تھی کہ سکندر بھی فواد کی طرح محض اُس کے ساتھ وقت گزاری کر رہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا۔ سستے قسم کے رومانوی ناول اور رسالے پڑھ کر اور رومانٹک فلمیں دیکھ دیکھ کر وہ خود کو......

معاشرے کے اُتار چڑھاؤ سے جڑا ایک بہت خاص ناول **چوتھا حصہ**

شاپنگ کے بعد پنکی بولی۔ ''پاپا آپ نے تو شاپنگ کروا کر تھکا دیا۔ اب ہمیں پی سی میں ڈنر کروائیں۔'' اور لاکھوں روپے کی شاپنگ کرنے والے پاپا کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی اور وہ خوشدلی سے مان گئے۔ شاپنگ مال سے باہر آ کر وہ اپنی ہونڈا سوک میں بیٹھے اور ڈرائیور کو پی سی جانے کا آرڈر دیا۔

پی سی کے یخ بستہ ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر عالی نے اردگرد کا طائرانہ جائزہ لیا۔ ہال مکمل طور پر فل تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں کھانا مفت بٹ رہا ہو۔ اتنا رش تو داتا صاحب پر نیاز کا کھانا لینے والوں کا بھی نہیں ہوتا جتنا رش یہاں اِس قدر مہنگا کھانا کھانے والے امیرزادوں کا ہے۔ ایک طرف اس قدر غربت ہے کہ لوگ ایک وقت کے کھانے کے لیے ترستے ہیں اور دوسری طرف اس قدر دولت کی ریل پیل ہے۔'' عالی اپنی ہی سوچوں میں غرق تھا۔

''عالی کیا سوچ رہے ہیں جوس لیں۔'' پنکی نے عالی کو مخاطب کیا تو وہ چونک پڑا اور سامنے پڑے جہاز سائز کے پائن ایپل جوس کو اپنے قریب کر کے ہلکے ہلکے سپ اسٹرا کے ذریعے لینے لگا۔

''ویسے انکل آپ کا کھانے کا ذوق بہت اچھا ہے۔'' عالی نے سر کو کھانے کا آرڈر دیتے ہوئے سن کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''بیٹے لاہوری جو ٹھہرے، پھر ہم نے خالص خوراکیں کھائی ہیں جب سستے زمانے تھے، صاف ستھرا کھانا چھوٹے سے چھوٹے ہوٹل میں بھی مناسب داموں میسر ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بیرے باپ اڑاتے کھانے کے ڈونگے اٹھائے آ گئے۔ کھانے میں بریانی، کوفتے، تکے، چکن بون لیس ہانڈی اور ساتھ روغنی نان، سلاد اور رائتہ تھا۔ کولڈ ڈرنکس میں سیون اپ تھی۔ خوشگوار اور دلچسپ ماضی کے قصے سناتے ہوئے فخر عالم صاحب نے کھانے کے ماحول کو مزید پُرلطف بنا دیا تھا۔ کھانے کے بعد ٹوٹی فروٹی آئس کریم آ گئی۔ جسے ان لوگوں نے خوب انجوائے کیا۔ مزیدار کھانا، فخر عالم صاحب کی دلچسپ باتیں اور یخ ڈائننگ ہال کھانا کھانے والوں کا ہجوم، بیروں کی مؤدب انداز میں گاہکوں کو سروس ہلکی ہلکی سرگوشیوں میں باتیں کرتے بے فکرے خوبصورت چہرے یہ سب کچھ بہت اچھا اور پرفسوں محسوس ہو رہا تھا۔ عالی کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت کی طنابیں کھینچ کر کسی طرح وقت کو بڑھنے سے روک

دے۔ اور یہیں پر زندگی تمام ہو جائے۔ اُس کی نگاہیں اپنی معمولی شکل وصورت کی منگیتر کی بجائے ہال میں موجود دیگر حسین چہروں کا طواف کر رہی تھیں۔ ایک بس حسن ہی کی تو کمی تھی۔ ورنہ ہر چیز کتنی اچھی پرفیکٹ تھی۔ اُس کی خواہش اور آرزو کے مطابق اعلیٰ عہدے پر فائز اعلیٰ تعلیم یافتہ سسر دولت کی ریل پیل اور مختصری فیملی، بس کاش عینی بھی دیگر لڑکیوں کی طرح خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی تو عالی خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا۔

لیکن اگر عینی خوبصورتی کی دولت سے مالا مال ہوتی تو پھر اُس کے سسرال والوں کی نگاہِ انتخاب عالی کی بجائے کسی اپنے ہی طبقے کے نوجوان پر ٹھہرتی۔ پھر عالی کو کون پوچھتا۔ اس لیے عالی نے دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس کی ہونے والی بیوی کی کم روی نے اُسے اس طبقے میں شامل ہونے کا گولڈن چانس مہیا کیا ہے۔ خوبصورتی اور تعلیم تو ایسی صورت میں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں حسن عدم موجودگی پر کمپرومائز کیا جاسکتا ہے مگر اسٹیٹس اور دولت کے بغیر زندگی گزارنا ایک کار مشقت ہی ہوتا ہے۔ عالی کا سارا ماضی اس بات کا گواہ تھا اور اب وہ بھولے سے بھی اس اذیتوں بھری زندگی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

کھانے کے بعد ایک بھاری رقم بطور بل پے کر کے فخر عالم صاحب عینی اور عالی کے ہمراہ ہوٹل سے باہر آگئے۔ جہاں ڈرائیور اُن کا منتظر تھا۔ کھانا اتنا زیادہ تھا جو کم از کم چھ سات افراد پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔ ان تین افراد نے کتنا کھانا تھا۔ چنانچہ بہت سا کھانا بچ گیا تھا ایسے میں کسی کو بھی اُس غریب ڈرائیور کا خیال نہیں آیا جو باہر گاڑی میں جانے کب کا بھوکا پیاسا بیٹھا تھا۔ کیا تھا اگر انکل کچھ کھانا بے چارے ڈرائیور کے لیے ہی پیک کروا لیتے۔'' عالی نے ڈرائیور کو دیکھ کر سوچا۔ شاید ابھی اُس میں اپنے نچلے طبقے کی تھوڑی بہت ہمدردی کی رمق موجود تھی۔ جسے جانے کب سے فخر عالم صاحب فراموش کر چکے تھے اور عینی تو خیر تھی ہی اونچے طبقے کی پروردہ جو اپنے ملازموں کو کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ اُن کے کتے بلیاں زیادہ شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

''ہاں تو عالی بیٹے اب آپ نے کہاں جانا ہے۔'' فخر عالم صاحب نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی مجھے تو شامی روڈ پر اپنے ایک دوست کی طرف جانا تھا اگر مجھے ڈرائیور وہاں ڈراپ کردے ورنہ میں ٹیکسی پر چلا جاتا ہوں۔'' عالی نے کہا۔

''مگر عالی آپ کی گاڑی تو گھر میں کھڑی ہے۔'' عینی نے کہا۔

''اُس کا کوئی مسئلہ نہیں وہ غیور (ڈرائیور) بعد میں چھوڑ آئے گا۔ غیور پہلے عالی صاحب کو اُن کے دوست کے گھر ڈراپ کر دو۔ پھر گھر چلنا ہے۔'' فخر عالم صاحب نے کہا۔ چنانچہ ڈرائیور نے پی سی سے باہر نکل کر گاڑی میاں میر برج کی طرف موڑلی۔

''پاپا ہم کافی دن سے فورٹیرس اسٹیڈیم نہیں آئے۔ یہاں کافی نئی بوتیکس کھلی ہیں۔ جہاں ڈریسز کی بڑی اچھی ورائٹی ہے۔ میری دوست عرفہ بتا رہی تھی۔'' پنکی نے میاں میر پُل کے اوپر سے گزرتے ہوئے فورٹیرس اسٹیڈیم کی جانب دیکھ کر کہا۔

''بیٹا جی میرے پاس تو اتنا ٹائم نہیں ہوتا۔ آپ کسی دن اپنی ماما یا عالی بیٹا کے ساتھ آجانا اور جتنے ڈریسز خریدنے ہوں خرید لینا۔'' فخر عالم صاحب نے پیار سے عینی کے سر کو تھپتھپا کر کہا۔

''او کے پاپا......!'' عینی نے جواب دیا اور پھر عالی سے مخاطب ہوئی۔

''عالی آپ کس وقت فارغ ہوتے ہیں۔''

''میں شام کو پانچ بجے کے بعد فارغ ہی ہوتا ہوں۔ جب کہیں میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' عالی نے اگلی سیٹ سے مڑ کر کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے آپ نیکسٹ سنڈے کو آجائیں۔ میں اپنی ایک دو فرینڈز کو بھی انوائٹ کرلوں گی۔ ڈنر ہم وہیں پر شزان میں کریں گے۔'' عینی نے فوراً ہی پروگرام بنا ڈالا۔

''ٹھیک ہے جو آپ مناسب سمجھیں۔'' عالی نے جواب دیا۔ اسی اثناء میں شامی روڈ پر واقع عالی کے

دوست وقار علوی کا گھر آ گیا۔

''تمہارے دوست کے والد ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں؟'' فخر عالم صاحب نے گیٹ پر لگی تختی دیکھ کر کہا۔

''جی انکل...... آپ آیئے نا تھوڑی دیر کے لیے، انکل علوی بہت ملنسار اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ آپ اُن سے مل کر خوش ہوں گے۔'' عالی نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا پھر کبھی سہی، اس وقت تو مجھے گھر جانے کی جلدی ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہوگئی ہے۔ تمہاری آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''او کے انکل جی، او کے فی امان اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر عالی گیٹ کی جانب بڑھ گیا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہفتے کی شام تھی۔ پنکی اپنی تین الٹرا ماڈ سہیلیوں کے ساتھ لان میں بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ یہ اُس نے اپنی ایک دوست کے مشورے پر شروع کیا تھا کہ اُس کا وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے وہ ایکسرسائز کرنے کے ساتھ ساتھ کوئی گیم بھی کھیلا کرے۔ جس سے وہ نا صرف ایکٹو رہے گی بلکہ وزن بھی کم ہو جائے گا۔ ورنہ اپنے اسمارٹ شوہر کے ساتھ وہ بہت بھدی لگے گی اس لیے کچھ دنوں سے وہ باقاعدگی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتی تھی رات کے کھانے کے بعد واک بھی شروع کر دی تھی۔ گیم ختم کر کے وہ لان چیئرز پر آ کر بیٹھ گئیں اور ٹیبل پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو لے کر اپنا پسینہ خشک کرنے لگیں۔ اسی دوران ایک ملازم جوس کے گلاس لے آیا۔

''یار تمہیں کم از کم آج تو یہ گیم نہیں کرنی چاہیے تھی۔ نہا کر اور تیار ہو کر آئے تھے۔ پسینے نے ساری تیاری غارت کر دی۔'' پنکی کی دوست روبی نے منہ بنا کر کہا۔

''تو تم نے وہاں کس کو دکھانا ہے۔ آج کل گرمی میں تو سب کا ہی حلیہ ٹائیٹ ہوا ہوتا ہے۔'' پنکی نے جوس کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہاں خود تو محترمہ ابھی جا کر نہا کر خوبصورت سا ڈریس پہن کر خود کو خوشبوؤں میں بس کر اپنے صاحب بہادر کے سامنے آئیں گی۔ اور ہمیں اس خراب حلیے میں ساتھ باڈی گارڈز کے طور پر لے کر جائیں گی۔'' ثمن نے کہا۔

''ارے بابا اس قدر مرچیلی کیوں ہو رہی ہو۔ تم لوگ بھی تیار ہو جاؤ۔ نہا کر کپڑے بدل کر خود کو خوشبوؤں میں بسا لو۔ تم لوگوں کا اپنا گھر ہے روکا کس نے ہے تمہیں۔'' پنکی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''چلو نہا بھی لیتے ہیں پرفیوم بھی تمہاری استعمال کر لیں گے۔ مگر کپڑوں کا کیا کریں گے۔'' نازی نے کہا۔

''میری وارڈ روب کس لیے ہے بے شمار سوٹ ایسے ہیں جو میں نے کبھی پہنے بھی نہیں۔'' پنکی نے احساس تفاخر سے کہا۔

''تمہارے کپڑے ہا...... ہا......'' روبی نے پنکی کے سراپے کو دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ وہ تینوں لمبی بھی تھیں اور خاصی سلم تھیں۔ جبکہ چھوٹے سے قد کی گول مٹول پنکی اُن کے سامنے عجیب سی لگ رہی تھی۔

''یار اب طنز تو نا کرو۔ میں جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں اللہ نے بنایا ہے میں نے کب چاہا تھا کہ میرا قد چھوٹا ہو۔ رنگ سانولا ہو اور جسم بھدا ہو۔'' پنکی نے روہانسی ہو کر کہا۔

''ارے...... ارے میری پیاری سی گڑیا مائنڈ کر گئی میں...... میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' روبی نے پنکی کو گلے سے لگا کر چمکار کر کہا۔ تو اُس کے جامنی ہونٹوں پر ہلکی سی افسردہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ تمہارے مسٹر ہینڈسم آتے ہی ہوں گے۔'' ثمن نے اپنی کلائی پر بندھی نازک سی ریسٹ واچ کو دیکھ کر کہا۔

''ویسے پنکی تم اگر برا نا مانو تو ایک بات کہوں۔'' نازی نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہاں...... ہاں کہو۔'' پنکی نے کہا۔

''یار یہ ٹھیک ہے کہ عالی بھائی ہینڈسم ہیں پڑھے لکھے ہیں اچھے عہدے پر فائز ہیں مگر کچھ دبے دبے سے ہیں اُس کی فیملی کے افراد بھی کچھ یونہی سے ہیں تمہاری منگنی کی تقریب میں دیکھا تھا اُس کی ماں بہن اور والد کو نا تو انہوں نے ڈھنگ کے کپڑے پہن رکھے

تھے نا ہی اُن کا رویہ ہمارے طبقے کے مطابق تھا۔ لگتا تھا یہ لوگ زیادہ ویل آف نہیں ہیں۔''

''اصل میں تم تو جانتی ہو کہ پاپا کے سارے دوست بہت ہائی سوسائٹی کے افراد ہیں جبکہ ہم بنیادی طور پر نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں امیر کبیر لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں سے دوستیاں تو کر لیتے ہیں مگر اُن سے رشتے ناطے نہیں کرتے۔ پھر میری شکل و صورت بھی یونہی سی ہے اس لیے پاپا نے عالی کا صرف عہدہ دیکھا ہے۔ اُس میں ہمارے طبقے میں ایڈجسٹ ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ رہی اُس کی فیملی تو ہمیں اُن سے کیا لینا دینا۔'' پنکی نے لاپرواہی سے کہا اور پھر تیار ہونے کے لیے گھر کے اندر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد عالی بھی آ گیا۔ تب تک پنکی اور اُس کی سہیلیاں تیار ہو چکی تھیں۔ پھر وہ سب فخر عالم صاحب کی لینڈ کروزر میں شاپنگ کے لیے نکل گئے۔

☆......☆......☆

انیلہ گہری نیند سو رہی تھی کہ کسی نے زور زور سے اُس کے پاؤں کا انگوٹھا ہلایا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ پہلے تو اُس کو کچھ سمجھ نا آئی کہ وہ ہے کہاں اُس نے بڑی مشکل سے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو کمرے کے ملگجے اندھیرے میں سامنے ہی سکندر ہونٹوں پر انگلی رکھے کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' انیلہ نے اُس سے پوچھا۔ اس پر سکندر نے اُسے باہر آنے کا اشارہ کیا تو وہ چپل پہن کر سکندر کے پیچھے پیچھے چلتی کمرے سے باہر آ گئی۔ باہر دوسری منزل کے صحن میں ایک طرف اوپر سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ جہاں سکندر کا کمرہ تھا۔ انیلہ سیڑھیاں چڑھنے لگی تو وہ لڑکھڑا سی گئی دراصل نیند کی اس قدر شدت تھی کہ اُسے صحیح طرح نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس پر سکندر اسے سہارا دے کر اوپر اپنے کمرے میں لے آیا کمرے میں آ کر سکندر نے دروازہ بند کر دیا۔

''سکندر کا کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ وال ٹو وال کارپٹ، بڑا سا ڈبل بیڈ دروازوں کھڑکیوں پر بھاری ویلوٹ کے پردے، اے سی اور اٹیچڈ باتھ، اُس نے اپنا کمرہ اپنے ذوق اور پسند کے مطابق ڈیکوریٹ کر رکھا تھا۔ باقی گھر کی نسبت اس کمرے کی ہر چیز میں نفاست تھی۔ اے سی کی ٹھنڈک میں کمرے کا ماحول بہت خوابناک سا معلوم ہو رہا تھا۔

''یار تم رات کو اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ اُسی وقت تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔'' سکندر نے انیلہ کے چہرے کو وفورِ شوق سے تکتے ہوئے کہا۔

''تو تم نے مجھے یہ کہنے کے لیے نیند سے جگایا ہے۔'' انیلہ نے جھنجلا کر کہا۔

''نہیں کچھ اور بھی کہنا ہے۔'' سکندر نے شوخ لہجے میں کہا۔

''اچھا...... اچھا جو کہنا ہے جلدی کہو مجھے بہت نیند آ رہی ہے ابھی تو مشکل سے آنکھ لگی ہی تھی کہ تم نے آ کر جگا دیا۔'' انیلہ نے نیند سے مندی مندی آنکھوں سے سکندر کے چہرے کو دیکھ کر کہا جو اُسے نیند کے خماری کی وجہ سے دھندلا دھندلا سا لگ رہا تھا۔ اُس کے بعد پتہ نہیں سکندر کیا کیا سرگرمیاں کرتا رہا مگر انیلہ بے خبر ہو کر اُس کی بانہوں میں جھول گئی۔

''خاموشی، سناٹا، کمرے کا ٹھنڈا پرسکون ماحول اور دو نوجوان دل جو ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ سکندر اپنے جذبات پر قابو نا رکھ سکا۔ اور پھر وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

جب جذبات کا طوفان تھما تو دونوں کے پاس سوائے پچھتاوؤں کے اور کچھ نہیں تھا۔ انیلہ رو رو کر سکندر ہی کو الزام دیے جا رہی تھی اور اُس کے پاس سوائے دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

انیلہ باتھ روم میں جا کر دیر تک خود کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی رہی۔ اُسے اپنا وجود بہت گندا لگ رہا تھا۔ اپنے آپ سے اُسے گھن آ رہی تھی۔ پھر وہ نیچے فروا کے کمرے میں آئی تو ابھی تک بھی لڑکیاں سو رہی تھیں۔ اُسے اُن پر رشک آیا کہ کس قدر بے فکری سے اور آرام سے سو رہی ہیں۔ اُن کے چہروں پر کیسا تقدس اور پاکیزگی ہے اور ایک وہ ہے کہ ایک مکار شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنا سب کچھ لٹا کر تہی داماں

ہوگئی ہے۔ وہ نیچے اپنے بستر پر لیٹ گئی اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ مگر نیند تو شاید ہمیشہ کے لیے اُس کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ نیند سے بے حال ہو رہی تھی۔ اور اب یہ نعمت اُس سے چھن گئی تھی۔ رہ رہ کر پچھتاوؤں کے زہریلے ناگ اُسے ڈس رہے تھے۔

اُس نے فروا کے چہرے پر نگاہ ڈالی کس قدر سکون اور اطمینان تھا اُس کے چہرے پر جہاں والدین نے اُس کا رشتہ طے کیا وہ چپ چاپ مان گئی اور اب آج پیا دیس سدھار جائے گی جو بھی ہے جیسا بھی ہے کم از کم اُسے با عزت طریقے سے بیاہ کر تو لے جا رہا ہے میری بھی والدین نے اپنی حیثیت کے مطابق کہیں نا کہیں شادی کر ہی دینی تھی۔ میں نے اپنے مقدر سے لڑنے کی کوشش کی اور اب برباد کر لیا اپنی عزت و ناموس کو اب مجھ جیسی کو کون قبول کرے گا۔ ایک عصمت کا جوہر ہی تو تھا میرے پاس جس پر میں نازاں تھی۔ اور آج وہ بھی لٹا دیا۔ اب تو میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔

اُس نے مہندی میں رچے اپنے دونوں ہاتھوں کو تکتے ہوئے کہا۔ جن پر اب کسی کے نام کی مہندی بھی نہیں رچنے والی تھی۔

انیلہ کا دل چاہا کہ وہ ابھی یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جائے مگر وہ ایسا کر کے دوسروں کو مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی آج تو اُس نے گھر بھی واپس نہیں جانا تھا۔ دوپہر کے بعد فروا کو بیوٹی پارلر لے کر جانا تھا۔ پھر وہاں سے ہی اُن دونوں نے میرج ہال جانا تھا۔ انیلہ کی امی، بہنوں اور بھائیوں نے بھی میرج ہال ہی میں آنا تھا۔ اور اُس نے فروا کی رخصتی کے بعد ہی اُن کے ساتھ گھر واپس جانا تھا۔ اور اِسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی اس بری حالت اور ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ کس کس کا سامنا کرے گی۔ اتنی چھوٹی سی عمر ہی میں اُس نے زندگی کے اتنے سارے رنگ دیکھ لیے تھے کہ اب اُسے زندگی ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اگر خودکشی حرام نا ہوتی تو جانے کب سے وہ اُس طوق کو گردن سے اُتار پھینک چکی ہوتی۔ اگرچہ سکندر نے اُسے بہت تسلی دلاسہ دیا تھا کہ وہ فروا کی شادی کی رسومات کے مکمل ہوتے ہی اُس سے شادی کر لے گا۔ وہ پہلے تو اپنے گھر والوں کو اُس کا رشتہ مانگنے کے لیے اُس کے گھر بھیجے گا اگر بالفرض اِس کے گھر والے نا بھی مانے تو وہ اُس سے چند دنوں کے اندر اندر کورٹ میرج کر کے اُسے اپنے ساتھ دبئی لے جائے گا۔ مگر اب انیلہ کو اُس شخص کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا تھا۔ اُسے کسی میگزین میں پڑھا ہوا ایک فقرہ بار بار یاد آ رہا تھا۔

''مرد کبھی بھی اُس عورت سے شادی نہیں کرتا جو اُسے شادی کے بغیر ہی حاصل ہو جائے۔'' وہ سمجھ چکی تھی کہ سکندر بھی فواد کی طرح محض اُس کے ساتھ وقت گزاری کر رہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا۔ سستے قسم کے رومانوی ناول اور رسالے پڑھ کر اور رومانٹک فلمیں دیکھ دیکھ کر وہ خود کو بھی کوئی فلمی یا افسانوی ہیروئن سمجھے بیٹھی تھی کہ اُس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کوئی بھی مرد اُس کا دیوانہ ہو جائے گا۔ اور اُس کی غربت کو نظر انداز کر کے اُس سے شادی کر لے گا۔

دراصل جن لڑکیوں کے باپ نشہ باز اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں، مائیں اَن پڑھ سیدھی سادی شوہر کے ستم کا شکار ہوتی ہیں اُن گھروں کی بیٹیاں ایسے ہی بھٹک جاتی ہیں۔ کیونکہ گھر سے باہر انہیں ورغلانے اور بھٹکانے والے بہت سے شکاری جال پھیلائے ہوتے ہیں جو لڑکیاں سمجھدار اور اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں وہ ایسے شکاری صفت مردوں کے چنگل میں پھنسنے سے بچ جاتی ہیں۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی تربیت اچھی طرح ہو۔ اور ایسا بہت کم ہو پاتا ہے والدین کو اپنے جھگڑوں اور معاشی مسائل کی وجہ سے بچوں کی تربیت کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی بچے خودرو پودوں کی طرح خود ہی کسی طرح پل بڑھ جاتے ہیں۔ لڑکے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اور لڑکیاں بے راہ رو ہو جاتی ہیں یہی حال انیلہ کا ہوا تھا اور اب اپنی نادانی اور کم عقلی پر کف افسوس ملتی ہوئی اندر ہی اندر اشک خون بہا رہی تھی۔ مگر اُس کے آنسو باہر بہنے کے بجائے اُس کے دل میں گر رہے تھے۔

انیلہ کافی دیر تک اپنے بستر پر پڑی اپنی بربادی کا

ماتم کرتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ گھر میں چہل پہل شروع ہوگئی لوگ بیدار ہونے لگے۔ پھر ناشتہ کی گہما گہمی شروع ہوگئی۔ چونکہ مہمان کافی تھے۔ اس لیے ناشتہ باہر ہی سے منگوایا گیا تھا۔ کسی کے لیے حلوہ پوری، کسی کے لیے نان چنے تو کسی کے لیے دہی کلچے یا نہاری البتہ چائے گھر ہی میں بن رہی تھی۔ انیلہ نے بڑی مشکل سے آدھا نان دہی کے ساتھ زہر مار کرنے والے انداز میں کھایا۔ اور پھر وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کچن میں جا کر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ سالن اور چنے وغیرہ تو رات اور صبح ناشتے کے بچے ہوئے تھے۔ ایک سالن سبزی کا بنالیا گیا۔ روٹیاں تندور سے آگئیں اور یوں سب گھر والوں اور مہمانوں نے دن کے چار بجے دوپہر کا کھانا کھایا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

سارا دن انیلہ بجھی بجھی سی اور کھوئی کھوئی سی رہی کوئی اس سے بات کرتا تو وہ غائب دماغی سے جواب دیتی یا سنی اَن سنی کر دیتی۔ فروا، اُس کی امی اور باقی کئی لوگوں نے انیلہ سے اُس کے یوں گم سم اور پریشان ہونے کی وجہ پوچھی تو وہ رات کو صحیح طرح سے نیند نہ آنے کا بہانہ کر کے ٹال گئی۔

سکندر سے اِس کا کئی بار آمنا سامنا ہوا وہ بار بار اُس سے بات کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ نفرت سے اُس کی طرف سے رُخ پھیر لیتی۔ فروا کے سسرال والے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ پورا خاندان ہی برسوں سے دبئی میں مقیم تھا۔ لڑکا اور اُس کے والد اور بھائی دبئی میں اپنا اسٹور چلاتے تھے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ یہ رشتہ فروا کے ماموں نے طے کروایا تھا۔ جو لڑکے کے والد کے گہرے دوست تھے اور شروع میں اکٹھے ہی بزنس کرتے تھے پھر بعد میں کاروبار پھیلنے پر انہوں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا تھا۔

انیلہ رشک سے فروا کا قیمتی عروسی جوڑا اور اتنے خوبصورت اور مہنگے زیورات کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے نصیب میں تو کان کی ایک بالی تک نا تھی۔ آج کے فنکشن کے لیے بھی اُس نے اپنی چچی کا شادی کا لہنگا، سیٹ اُدھار لیا تھا۔ سوٹ کے ہم رنگ سستی سی آرٹیفیشل جیولری، سیل سے لی گئی گولڈن فینسی سینڈل اور چچی ہی کا ہم رنگ پرس تھا۔

انیلہ نے لباس تبدیل کر کے پارلر سے ہلکا پھلکا میک اپ کروالیا اور بال سیٹ کروالیے۔ اگرچہ اُس کا دل نا تیار ہونے کو کر رہا تھا اور نہ ہی کسی فنکشن میں شامل ہونے کا موڈ تھا۔ مگر سب کچھ مجبوراً کر رہی تھی۔ ورنہ تو دل کی دنیا میں تو عجیب سی اتھل پتھل تھی۔ اُس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ کہیں سے زہر مل جائے اور وہ کھا کر اپنی ذلت کا احساس دل کی گہرائیوں میں لیے لیے ہی قبر کی آغوش میں اتر جائے۔

''اتنی نازک سی لڑکی پر اتنے بھاری بھر کم جوڑے اور زیورات کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے مگر دلہن بننے کی خاطر یہ سب برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔'' بیوٹی پارلر پر کام کرنے والی ایک لڑکی نے مکمل طور پر تیار فروا کو دیکھ کر قدرے اونچی آواز میں کہا تو انیلہ ایک دم ہی اپنے خیالات کی وادیوں سے واپس لوٹ آئی لڑکی کی بات سن کر فروا بے اختیار مسکرانے لگی تو پارلر کی ادھیڑ عمر مالکن نے ڈپٹ کر کہا۔

ہنسو مت چہرے پر لائنیں پڑ جائیں گی۔'' اسی لمحے فروا کے موبائل پر اُس کے کزن ذیشان نے مسڈ کال دی۔

''چلو فروا جلدی چلو ذیشان بھائی آگئے ہیں۔'' انیلہ نے فروا کے موبائل کی اسکرین پر ذیشان کے نام کو دیکھ کر کہا۔ پارلر کی دو لڑکیاں سہارا دے کر فروا کو باہر لا کر گاڑی کی اگلی سیٹ پر بٹھا گئیں۔

''توبہ ہے، یہ پارلر والے بھی جانے کیا جادو کرتے ہیں کہ چڑیلوں جیسی شکل کی لڑکیوں کو حوریں بنا دیتے ہیں۔'' ذیشان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔ تو انیلہ فوراً بولی۔

''پلیز ذیشان بھائی ایسے نا بولیں۔ فروا ہنس پڑے گی اور اُس کا اتنی گھنٹوں کی محنت سے کیا گیا میک اپ خراب ہو جائے گا۔''

''او کے میڈم!'' ذیشان نے کہا اور پھر سارا راستہ وہ خاموش ہی رہا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی فیروز پور روڈ پر واقع ایک میرج ہال کے باہر آ کر رُک گئی۔

ابھی برات نہیں آئی تھی۔ فروا کے والد، بھائی اور دیگر رشتے دار مرد ہاتھوں میں سنہری گوٹے کے ہار پکڑے ہال سے باہر برات کے منتظر تھے۔ فروا کو سہارا دے کر انیلہ اور سکندر نے گاڑی سے اُتارا اسی اثناء میں فروا کی بہنیں اور ایک دو کزنز بھی آگئیں اور وہ فروا کو لے کر ہال کے اندر ایک طرف بنے دلہن کے لیے مخصوص کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ انیلہ چپ چاپ آہستہ آہستہ اُن کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی کہ سکندر نے اُس کے قریب آکر جھک کر سرگوشی کی۔

''غضب ناک حد تک اچھی لگ رہی ہو جانِ من دل چاہ رہا ہے کہ ابھی نکاح کے دو بول پڑھوا لوں۔ ویسے بھی ہم نے اپنے خدا کو گواہ بنا کر آج صبح شادی تو کر ہی لی ہے۔ اب تو دنیاوی رسمیں ہی رہتی ہیں۔''

''شٹ اپ یو ذلیل انسان...... مزید بکواس کی نا تو ابھی چیخ چیخ کر سارے لوگوں کو تمہاری ذلالت کی داستان سنا دوں گی۔ میں تو بدنام ہو ہی جاؤں گی جس کی مجھے اب کوئی خاص پروا بھی نہیں رہی البتہ تم اور تمہارا سارا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ ہوسکتا ہے تمہاری بہن کی برات بھی بغیر دلہن کے واپس لوٹ جائے۔'' انیلہ نے آہستہ مگر نفرت سے چور چور لہجے میں کہا تو سکندر نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہاں سے کھسک جائے۔

انیلہ فروا کے پیچھے پیچھے عروسی کمرے میں جانے کی بجائے پچھلی سیٹوں پر بیٹھی اپنی ماں کی طرف بڑھ گئی۔

''اماں تم اکیلی آئی ہو؟'' انیلہ نے ماں کے پاس جا کر پوچھا۔

''نہیں ظفر آیا ہے۔'' اماں نے مردوں کی سائیڈ کی طرف بیٹھے ظفر کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں ماں بیٹیاں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ اسی وقت برات کی آمد کا شور مچ گیا۔ لڑکیاں پہلے ہی دو قطاریں بنا کر پھولوں کی پلیٹیں لیے کھڑی تھیں۔ اُن سے آگے فروا کی امی، چچیاں، خالہ وغیرہ پھولوں کے ہار لیے کھڑی تھیں۔ جیسے جیسے براتی اندر آتے گئے وہ اُن کے گلوں میں ہار ڈالتی گئیں۔ اور لڑکیاں اُن کے اوپر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے لگیں۔ فروا کا دولہا بڑے بڑے سنہری گوٹے اور نوٹوں پر مشتمل ہار پہنے ہوئے تھا۔ اونچا لمبا خاصا ہینڈسم گورا چٹا نوجوان تھا۔ سبھی فروا کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ دلہا اُس کی والدہ، والد اور بہنیں بھائی جا کر اسٹیج پر براجمان ہوگئے جبکہ مرد اور عورتیں اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ دلہا کے اسٹیج پر بیٹھتے ہی نکاح خواں نے نکاح کا خطبہ شروع کر دیا دولہا کو کلمے اور دیگر دعائیں پڑھائی گئیں اور پھر ایجاب وقبول کا سلسلہ شروع ہوا۔ دولہا سے نکاح نامے پر دستخط کروائے گئے پھر دلہن کے والد، چچا، ماموں اور بھائی نکاح خواں کے ہمراہ دلہن کے کمرے کی طرف گئے۔ وہاں سے دلہن کی رضا مندی لے کر اور اس کے دستخط لے کر واپس آئے تو مبارک سلامت کا شور بلند ہوا اور مہمانوں میں چھوہاروں، ٹافیوں، سونف سپاری اور سفید میٹھے دانوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے پیکٹ تقسیم کیے جانے لگے۔ ساتھ ساتھ ہی بیرے جوس کے گلاس مہمانوں کو پیش کرنے لگے۔ اس کے بعد دلہن کو بھی اسٹیج پر لاکر دولہا کے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ سنہری شیروانی میں ملبوس، سر پر خوبصورت سنہری کٹ والا کلا، پاؤں میں گولڈن سلیم شاہی جوتی اور بازو پر سنہری ہی گھڑی پہنے دولہا دلہن سے کچھ کم خوبصورت نہیں لگ رہا تھا۔

''ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔ ایک خاتون نے اونچی آواز میں کہا۔

تو سب نے یک زبان ہوکر آمین کہا۔ اس کے بعد پہلے دولہا والے باری باری اسٹیج پر جا کر دونوں کو سلامیاں اور تحائف دینے لگے۔ ساتھ ساتھ مووی کیمروں سے ویڈیو اور تصاویر بھی بن رہی تھیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے موبائل کے کیمرے بھی آن کر رکھے تھے۔ اگرچہ تمام عورتیں اور مرد اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خوب بنے سنورے تھے۔ مگر اس وقت سبھی کی نگاہوں کا مرکز دولہا اور دلہن ہی تھے۔ دولہا والوں کے بعد دلہن کے عزیز واقارب اور مہمانوں کی سلامیاں اور تصاویر بنوانے کی باری آئی۔ کافی دیر بعد انیلہ اور صغری

بھی اسٹیج پر گئیں۔ تب اسٹیج پر انیلہ کی امی بہنیں اور کزنز ہی تھیں۔ صغریٰ نے فروا کی طرف والی کرسی پر بیٹھ کر اُسے پانچ سو روپے کا نوٹ دیا اور اُس کے سر پر ہاتھ ہلکا سا پھیر کر اُسے دعا دی۔ جبکہ انیلہ نے فروا کے دولہا ایاز احمد کے پاس بیٹھ کر اُسے ایک خوبصورت سرخ رنگ کے گفٹ پیک میں لپٹا وال کلاک کا تحفہ دیا۔ یہ اُس نے پہلے ہی پیک کروا کر رکھ لیا تھا۔ کیونکہ اُسے پتہ تھا کہ اُس کی ماں کے پاس تو پانچ سو روپے کی ہی گنجائش نکلے گی۔ اُس نے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کر کے پچھلے ہفتے ایک سستا سا وال کلاک خرید لیا تھا۔ کیونکہ اتنے امیر لوگوں کی شادی پر پانچ سو روپے کی معمولی رقم دینا مناسب نہیں لگ رہا تھا اُسے، گفٹ کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پیکنگ کی وجہ سے اُس کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور وقتی طور پر انسان کی عزت بن جاتی ہے۔

''آنٹی اب آپ سکندر بھائی کی بھی جلدی شادی کر دیں۔'' فروا کی ایک شوخ و شنگ کزن نے جو فروا کے پیچھے کھڑی تصویر کے لیے پوز بنا رہی تھی۔ سکندر کو گروپ فوٹو کھینچتے دیکھ کر فروا کی امی سے کہا۔

''ہاں بیٹی فروا بیٹی کے فرض سے فارغ ہو کر اب سکندر ہی کی باری ہے۔ خیر سے میرے بھائی کی بیٹی سے اُس کا نکاح ہو چکا ہے۔ اگلے سال وہ بی اے کے امتحان سے فارغ ہو جائے تو میں اُسے اپنے گھر کی رونق بنا لوں گی۔'' فروا کی امی نے بھتیجی کی محبت میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''آنٹی وہ شادی میں نہیں آئیں۔'' اُس لڑکی نے استفسار کیا۔

''نہیں وہ دراصل دبئی میں ہوتی ہے نا۔ اُن سب نے آنا تھا مگر پھر میرے بھائی کو ایک کاروباری سلسلے میں امریکہ ایک ماہ کے لیے جانا پڑ گیا۔ تو وہ ساری فیملی کو ہمراہ لے گئے ہیں۔'' فروا کی امی نے جواب دیا۔ اور انیلہ جو فروا کے دولہا سے جھک کر کوئی بات کر رہی تھی اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اُس کے سر پر انتہائی طاقت ور بم کو پھوڑ دیا ہو۔ اس کے چہرے کی رنگت یکدم ہی زرد پڑ گئی۔ اور سارا جسم بری طرح لرزنے لگا۔ پھر اُس سے اسٹیج پر رکا نہیں گیا اور وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی پچھلی سیٹوں پر آ کر بیٹھ گئی۔

اُسے پتہ نہیں کیوں موہوم سے اُمید تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود شاید سکندر اپنی غلطی کے ازالے کے طور پر اُسے اپنا لے گا مگر موصوف تو پہلے ہی سے نکاح شدہ تھا۔ اس وقت اُس کا دل کر رہا تھا کہ کہیں سے اُسے تیزاب مل جائے اور وہ سکندر کے خوبصورت چہرے کو اس سے جلا کر خاکستر کر دے تاکہ آئندہ وہ کسی بھی سیدھی سادی غریب لڑکی کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا کر اُس کی عزت سے کھیلنے کی جرأت نا کر سکے۔

''کیا بات ہے انیلہ بیٹی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' صغریٰ جو انیلہ کو اسٹیج سے اُترتے دیکھ کر خود بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ اُسے یوں گم صم دیکھ کر بولی۔

''ہاں اماں وہ بس رات کو نیند پوری نہیں ہوئی نا اس لیے طبیعت بوجھل سی ہے۔'' انیلہ نے ٹالنے کے انداز میں صغریٰ سے کہا۔ اسی وقت کھانا لگنے کا اعلان ہوا تو وہ اماں کی نظروں کے حصار سے بچنے کی خاطر کھانے والی میزوں کی جانب بڑھ گئی۔ اور اپنے اور اماں کے لیے دو پلیٹوں میں کھانا نکال کر لے آئی۔ اُس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک رہا تھا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی پریشانی ظاہر کر کے ماں کو مضطرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اندر ہی اندر گرنے والے آنسوؤں کو پیتے ہوئے چار و ناچار دو چار لقمے زہر مار کیے۔ اور پھر جب اماں اور ظفر بھی کھانے سے فارغ ہو گئے۔ تو اُس نے اماں کے ہمراہ اسٹیج پر جا کر فروا اور اُس کی امی سے گھر جانے کی اجازت طلب کی اور اُن کے روکنے کے باوجود طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ہال سے باہر آ گئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ظفر اور صغریٰ بھی آ گئے۔ اور پھر ظفر پارکنگ سے اپنی موٹر سائیکل لے آیا اور ماں بہن کو بٹھا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ انیلہ بڑی مشکل سے ماں کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی گود میں اُس کا بیگ بھی تھا۔ جس میں اُس کے کپڑے جوتے اور ضروری چیزیں

تھیں۔ جو وہ فروا کے گھر سے پارلر کے لیے نکلتے وقت ہمراہ لے آئی تھی۔

انیلہ گھر پہنچی تو اُسے بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ گھر سے گئی تھی تب وہ ایک پاکیزہ اَن چھوئی کلی کی مانند تھی اور اب کیسے لوٹی تھی کہ اُسے اپنے آپ سے بھی گھن آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہانیہ اور شہاب کا رشتہ تو طے ہو چکا تھا۔ مگر منگنی کی باقاعدہ رسم کا انحصار شہاب کے ملک واپسی پر تھا۔ اسی طرح صباحت کے رشتے کی بات ضمیر احمد کے بیٹے سجاد علی سے طے ہو چکی تھی۔ اور فی الحال یہی فیصلہ ہوا تھا کہ شہاب اور صباحت دونوں کی منگنی کی تقریب ایک ساتھ ہی منعقد کی جائے۔ اس طرح اخراجات میں کافی بچت ہو جاتی۔

مبارک احمد کی تو یہ خواہش تھی کہ منگنی کی بجائے شہاب کی شادی کر دی جائے اور صباحت کا نکاح ...... مگر اس میں مسئلہ یہ تھا کہ عالی کی شادی میں اتنا روپیہ خرچ ہو چکا تھا کہ اب کم از کم ایک سال تک کوئی بڑے خرچ کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پھر صباحت ابھی پڑھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے وہ اطمینان سے اپنا بی اے مکمل کرے۔ چنانچہ عفیرہ بیگم نے مبارک احمد کو سمجھا بجھا کر اس بات پر رضا مند کر لیا تھا کہ فی الوقت شادی کے بارے میں نا سوچا جائے ...... جواب میں وہ خاموش سے ہو گئے۔

اصل میں ہارٹ اٹیک کے بعد سے وہ بڑے پژمردہ سے رہنے لگے تھے۔ انہیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اپنے دونوں بچوں کے گھر آباد کر دیں تاکہ اُن لوگوں کو عالی کی طرف نا دیکھنا پڑے۔ کیونکہ اُس کی خود غرض فطرت نے انہیں اُس کی طرف سے بددل کر دیا تھا۔ انہیں ویسے بھی اپنی اکلوتی بیٹی اور چھوٹے بیٹے سے زیادہ لگاؤ تھا۔ دونوں مخلص، محنتی، سادہ مزاج اور والدین کے فرمانبردار تھے اور کبھی کوئی فرمائش کی نا والدین کو بلاوجہ تنگ کیا۔ اس لحاظ سے عفیرہ بیگم اور مبارک احمد خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے کہ یہ دونوں عالی جیسے نہیں نکلے۔

عفیرہ بیگم نے ضمیر احمد کی بیوی رقیہ بیگم سے کہہ دیا تھا کہ وہ لوگ منگنی اور شادی میں زیادہ دھوم دھام نہیں کر سکیں گے۔ اور اپنی حیثیت کے مطابق جس طرح بن پڑا اخراجات کریں گے۔

رقیہ بیگم نے اُن کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ لوگ بھی سادگی سے ہر کام کرنے کے قائل ہیں اور یہ کہ انہیں جہیز کے نام پر ایک سوئی تک نہیں چاہیے کہ اُن کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ جو اُن کے دونوں بیٹوں کے لیے ہی تھا۔ ہونے والی سمدھن کی یہ بات عفیرہ بیگم کو خوش کر گئی تھی۔

''کہاں تو عالی کی شادی میں لڑکی والوں نے فرمائشیں کر کر کے اُن لوگوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ اور وہ اُن کی ساری جمع پونجی لٹ گئی تھی۔ اور وہ کنگال ہو کر رہ گئے تھے۔ اور کہاں یہ لڑکے والے ہو کر کوئی بھی فرمائش یا مطالبہ نہیں کر رہے۔ عفیرہ بیگم نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی سعدیہ بیگم کو صاف منع کر دیں گی کہ انہیں ہانیہ کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُن کے مالی حالات بھی تو کوئی بہت اچھے نہیں۔ پھر اتنی زیادہ بیٹیاں تھیں۔ بیٹا ابھی بہت چھوٹا تھا اکیلا باپ کمانے والا تھا۔ اُن کے لیے تو یہی بہت بڑی بات تھی کہ اپنی سگھڑ، سلیقہ مند اور پڑھی لکھی بیٹی کا رشتہ انہیں دے دیا تھا۔

☆......☆......☆

سامیہ دو ماہ تک مکمل طور پر اپنے گھر ہی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ صرف صبح کالج جاتی تھی۔ اور پھر سارا وقت گھر ہی میں گزارتی تھی۔ دوستوں سے ملنا جلنا، ماں کے گھر کے چکر لگانا اور کمپائنڈ اسٹڈی سب کچھ ساس کی بیماری کی وجہ سے اُس نے ترک کر دیا تھا۔ ایک ہفتہ تک وہ اسپتال رہی تھیں۔ وہاں بھی سامیہ صبح شام اُن کے لیے پرہیزی کھانے بنوا کر لے کر جاتی تھی۔ کبھی اُن کے لیے یخنی بنوا رہی ہے تو کبھی سوپ اور دلیہ...... پھر جب وہ گھر آ گئیں تو تب بھی اپنی نگرانی میں اُن کو ادویات کھلاتی اور ان کی خوراک اور آرام کا خاص خیال رکھتی۔ یہاں تک کہ وہ پھر پہلے ہی کی مانند صحت مند ہو کر اپنے معمولات کی طرف لوٹ

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

آئیں تو تب سامیہ نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ ورنہ تو وہ اپنی سدھ بدھ بھی بھولے ہوئے تھی۔
وہاب احمد سامیہ کا ممنون احسان مند تھا کہ وہ اُس کی والدہ کی اس قدر جانفشانی سے دیکھ بھال کر رہی ہے ورنہ تو بڑے بھائی اور حارث احمد کی بیویاں بھی تھیں جو دوسرے تیسرے دن کھڑے کھڑے ساس کی خیریت دریافت کرنے آجاتیں، یہی حال حارث اور بڑے بھائی کا تھا۔ جلدی جلدی آتے...... ماں کے پاس چند لمحوں کے لیے بیٹھتے اور پھر ضروری کام کا بہانہ بنا کر چلتے بنتے جانتے تھے کہ وہاب احمد شروع سے ماں کا لاڈلا ہے اور اُسے بھی ماں سے گہری محبت ہے۔ اس لیے وہ ہر طرح سے ماں کا خیال رکھتا ہوگا۔ البتہ علاج معالجے کے اخراجات ادا کرنے کی پیش کش ضرور کرتے مگر وہاب شکریہ کہہ کر کسی قسم کی رقم لینے سے انکار کر دیتا۔ بہنیں اور بہنوئی بھی اکثر آتے رہتے تھے۔
سبھی سامیہ کی ساس کی خدمت گزاری پر حیران تھے وہ خود بھی ہر وقت سامیہ کو دعائیں دیتیں اور ہر آئے گئے کے سامنے اپنی اس نیک اور خدمت گزار بہو کی تعریفیں کرتیں۔ جس کی پہلے ہر آئے گئے کے سامنے برائیاں کرتی نا تھکتیں تھیں۔ انسان کی اصل فطرت کا اندازہ مشکل وقت ہی میں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تو وہ ایک نیک خصلت لڑکی تھی۔ وہ تو بس اپنی مرضی کے خلاف شادی ہونے پر چڑ چڑی ہوگئی تھی۔ پھر وہاب احمد کے حاکمانہ رویے نے بھی اُسے اُس سے بددل کر دیا تھا۔ رہی ساس کی خدمت کرنے کی بات تو مستقبل کی ڈاکٹر ہونے کے ناطے وہ محض انسانی ہمدردی کے تحت اپنا فرض سمجھ کر کر رہی تھی کہ انسانیت کا یہی تقاضا ہے کہ دکھی اور بیمار افراد سے محبت اور دلجوئی سے پیش آیا جائے کیونکہ آدھی بیماری تو تیماردار کے اچھے برتاؤ سے ہی دور ہو جاتی ہے۔
ساس کی خدمت سے فارغ ہوئی تو وہ بھرپور طور پر اپنی پڑھائی کی جانب متوجہ ہوگئی۔ پھر انہی دنوں میں شہاب دبئی سے آگیا۔ اور ہانیہ کی منگنی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور اس سلسلے میں اُسے اکثر ماں کی طرف جانا پڑتا۔ چونکہ اُس کی سب سے گہری دوست تو حرا ہی تھی اس لیے وہ بازار کے چکر حرا کے ساتھ ہی لگاتی تھی۔ ڈرائیور اُسے حرا کے گھر چھوڑ دیتا وہاں سے وہ لوگ حرا کی گاڑی پر بازار چلی جاتیں، اور پھر حرا اُسے سعدیہ بیگم کے گھر ڈراپ کر دیتی۔
اُس دن بھی وہ اسی سلسلے میں حرا کے گھر آئی تھی۔ وہ گیٹ پر گاڑی سے اتری تو ڈرائیور نے جھجکتے ہوئے کہا۔
''باجی جی وہ...... وہ مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی۔''
''ہاں...... ہاں لطیف کہو کیا بات ہے؟'' سامیہ نے نرم لہجے میں کہا۔
''دراصل باجی جی...... میری بڑی بہن بیوہ ہوگئی ہے اُس کے چار چھوٹے بچے ہیں وہ چاہتی ہے کہ اُسے کسی کوٹھی میں کام بھی مل جائے اور رہنے کے لیے چھوٹا سا کوارٹر بھی ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایک محفوظ ٹھکانے میں سر چھپا سکے۔''
''تو تم نے وہاب سے کہنا تھا نا کہ وہ اُسے اپنے کسی دوست کے گھر میں کام دلوا دیں۔'' سامیہ نے کہا۔
''صاحب سے بات کی تھی مگر اُن کا کہنا ہے کہ فی الحال اُن کے کسی دوست کو ملازمہ کی ضرورت نہیں۔ آپ حرا بی بی سے بات کریں۔ یہ بڑے لوگ ایک آدھ نوکر تو فالتو بھی رکھ لیں گے۔'' بالآخر لطیف نے اپنے مطلب کی بات کہہ ہی دی۔
''ٹھیک ہے میں حرا سے بات کروں گی۔ بلکہ حرا کی امی سے بات کرنا ٹھیک ہوگا کیونکہ ملازمین کو رکھنے یا نا رکھنے کا فیصلہ تو وہی کریں گی۔ پھر وہ جواب دیں گی میں تمہیں بتا دوں گی۔ اب تم جاؤ میں نے یہاں سے امی کی طرف جانا ہے حرا مجھے ڈراپ کر دے گی۔''
''ٹھیک ہے باجی جی۔'' یہ کہہ کر لطیف چلا گیا۔
''ارے تم کب سے آئی ہوئی ہو؟'' حرا نے باہر آکر سامیہ سے پوچھا۔
''تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔'' سامیہ نے جواب دیا۔
''تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر آؤ نا۔''

"وہ...... حرا مجھے آنٹی سے ضروری بات کرنی تھی۔" سامیہ نے سوچا کہ اندر جانے سے پہلے حرا سے لطیف کی بہن کی بات کرے۔

"ہاں تو آؤ کرلو ماما سے بات وہ گھر ہی پر ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنی کسی فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی پر چلی جائیں گی۔"

"پھر تو وہ تیار ہورہی ہوں گی۔ اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ تم خود ہی اُن سے بات کرلینا۔ وہ دراصل ہمارے ڈرائیور کی بیوہ بہن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اُسے تمہارے ہاں ملازمت مل جائے۔ ساتھ ہی کوئی کوارٹر بھی ہو کیونکہ اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

"ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہماری پرانی ملازمہ حسنہ کام چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ امی کو آج کل کسی قابل اعتماد عورت کی تلاش ہے ایک کوارٹر بھی خالی پڑا ہے تم اپنے ڈرائیور سے کہو کہ کل ہی وہ اُسے یہاں لے آئے۔ بلکہ تم خود بھی ساتھ آجانا۔" حرا نے ایک دم ہی فیصلہ کرلیا۔

"ہاں...... یہ بہتر رہے گا۔" سامیہ نے اطمینان سے کہا۔ پھر دونوں لاؤنج میں داخل ہوگئیں۔ لاؤنج میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ ایاز کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ حرا کے پاپا بزنس ٹور پر کراچی گئے ہوئے جبکہ اُس کی ماما اپنے کمرے میں برتھ ڈے پر جانے کی تیاری کررہی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں لاؤنج میں ہی بیٹھتے ہیں ابھی کچھ دیر میں ایاز بھائی اور عدیل بھی آجائیں گے پھر مل کر چائے پئیں گے۔ فی الحال تم جوس اور ڈرائی فروٹ سے گزارا کرو۔" حرا نے جوس کا ٹن فریج سے نکال کر سامیہ کو دیتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو ڈیئر...... تم بھی آؤ نا بیٹھو میرے پاس۔" سامیہ نے جوس کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ اس اثناء میں ملازم نے ڈرائی فروٹ سے بھری ہوئی ٹرے سامیہ کے سامنے میز پر رکھ دی۔ جس کے مختلف خانوں میں ہر قسم کا ڈرائی فروٹ موجود تھا۔

"نہیں تم بیٹھ کر ٹی وی دیکھو دراصل مجھے شام کی چائے کے لیے عدیل کی فرمائش کے مطابق کچھ چیزیں تیار کروانی ہیں۔" حرا نے ریموٹ کنٹرول سامیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے یہ شخص ڈاکٹر ہوکر بھی اس قدر چٹورا ہے۔ خود مریضوں کو چٹ پٹی مصالحے دار اور تلی ہوئی چیزیں کھانے سے منع کرتا ہوگا۔ مگر محترم ہیں کہ ہر چیز دل کھول کر کھاتے ہیں اور پھر بھی اس قدر اسمارٹ ہیں۔" سامیہ نے نازک سی کانچ کی پلیٹ میں کاجو اور نمکین پستہ بادام لیتے ہوئے کہا۔

مگر اُس کی بات پوری سنے بغیر ہی کچن میں جاچکی تھی۔ جو گھر کے آخری کونے میں تھا۔ تاکہ لاؤنج میں بیٹھنے والے مصالحوں وغیرہ کی مہک سے ڈسٹرب نا ہوں۔

سامیہ جوس کے سپ لیتی ہوئی ساتھ ہی ڈرائی فروٹ کو انجوائے کررہی تھی۔ سامنے ٹی وی پر ایک مزاحیہ انگلش موی چل رہی تھی جو کہ خاصی دلچسپ تھی۔ ہیٹر کی وجہ سے کمرے کا ماحول بڑا خوشگوار سا تھا۔ اور باہر آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی دھند اور سردی کی شدت محسوس نہیں ہورہی تھی۔

اُسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھلا اور عدیل نیوی بلیو کوٹ اور سیاہ جینز میں ملبوس اندر داخل ہوا۔ اُس نے گلے میں نیوی بلیو وولن مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں لیدر کے گلوز تھے۔ پھر بھی سردی کی وجہ سے اُس کا سرخ وسپید رنگ مزید سرخ ہورہا تھا۔

"ہیلو اکٹر سامیہ ہاؤ آر یو۔" عدیل نے اتنے دنوں بعد اُسے دیکھ کر تپاک سے کہا۔

"فائن...... اینڈ وہاٹ اباؤٹ یو۔" سامیہ نے بھی انگلش ہی میں اُس کا حال دریافت کیا۔

"می فائن تو۔ یہ حرا اور ایاز کہاں ہیں۔" عدیل نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"ایاز بھائی تو کہیں باہر گئے ہیں اور حرا کچن میں آپ کی فرمائشی اشیاء کی تیاری کروارہی ہے۔" سامیہ نے نمکو اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے کاجو میرے فیورٹ' کیا میں لے سکتا ہوں؟" عدیل نے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر گلوز

اُتارتے ہوئے کہا۔ کوٹ وہ پہلے ہی اُتار کر اسٹینڈ پر لٹکا چکا تھا۔ کوٹ کے نیچے اُس نے سیاہ رنگ کی ہائی نیک جرسی پہن رکھی تھی۔ سیاہ جینز اور سیاہ ہائی نیک میں وہ دل میں اتر جانے کی حد تک اچھا لگ رہا تھا۔ کوئی مرد اس قدر بھی خوبصورت ہوسکتا ہے۔ سامیہ بے خیالی میں اُس کے پُرکشش چہرے پر نظریں جمائے سوچ جارہی تھی۔

''محترمہ اتنے غور سے نا دیکھیں۔ مجھے بڑی جلدی نظر لگ جاتی ہے۔ میری ماں بھی یہاں نہیں جو میری نظر اُتار دے۔ آپ تو خود تین عدد بچوں کی والدہ محترمہ ہیں نظر اُتارنے کا طریقہ تو بخوبی جانتی ہوں گی۔ مجھے بھی پلیز بتا دیجیے۔'' عدیل نے اپنا ہاتھ سامیہ کے سامنے لہراتے ہوئے کہا تو سامیہ ایک دم چونک پڑی۔

''آں...... ہاں...... کچھ کہا آپ نے؟'' سامیہ نے چوری پکڑی جانے پر بوکھلا کر استفسار کیا۔

''جی...... نہیں کچھ نہیں کہا میں نے آپ سے۔'' عدیل نے جھنجلا کر کہا۔ اور پھر اپنی پلیٹ میں بہت سے کاجو ڈال دیے۔

''آپ آگئے...... ایاز بھائی ابھی تک نہیں آئے۔ اُن کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ تھوڑی دیر تک پہنچ جائیں گے۔ دراصل باہر دھند پڑنی شروع ہوگئی ہے نا اس لیے ٹریفک بہت سلو چل رہی ہے۔'' حرا نے کچن سے آکر عدیل خاں سے کہا۔

''ہاں دھند تو آج سرِ شام ہی پڑنے لگی ہے۔ میں بھی بڑی مشکل سے ٹریفک کے اژدھام سے نکل کر آیا ہوں۔ صبح سے ہاسپٹل میں پھنسا ہوا تھا۔ آج تو لنچ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا۔ اس لیے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے تمہارے الم غلم کب تک تیار ہوجائیں گے۔''

''ہائیں میں دوپہر سے آپ کے لیے مزے مزے کی چیزیں بنا رہی ہوں اور آپ انہیں الم غلم کہہ رہے ہیں ایسا ناشکرا بندہ بھی کوئی نا ہوگا دنیا میں۔'' حرا نے پائن ایپل جوس کا ٹن کھول کر عدیل کو دیتے ہوئے باقاعدہ برا مان کر کہا۔

''ارے بھئی تم تو خوامخواہ ہی مائنڈ کرگئیں۔ میں تو ڈاکٹری اصطلاح استعمال کررہا تھا کیونکہ ہم لوگ فاسٹ فوڈ اور اسنیکس کو الم غلم ہی کہہ کر مریضوں کو اُن کو کھانے سے ڈراتے ہیں۔'' عدیل خاں نے مسکرا کر کہا۔

''اور خود ڈاکٹر صاحب ڈٹ کر کھاتے ہیں۔'' سامیہ نے کچھ دیر پہلے کی چوٹ کا بدلہ لیا۔

''بھئی حرا یہ تمہاری سہیلی شاید مجھے پوری طرح نظر لگانے کا ارادہ کرکے آئی ہیں پہلے مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں تاکہ میرے حسین مکھڑے کو نظر لگا سکیں۔ اور اب میرے کھانے کو نظر لگانا چاہتی ہیں۔''

''سنو نامکمل ڈاکٹر صاحبہ مجھے بخش ہی دو تو اچھا ہے۔ میں نظر کے معاملے میں بہت حساس واقع ہوا ہوں۔ مجھے بہت جلد نظر لگ جاتی ہے۔ اپنی ماں کا لاڈلا بیٹا ہوں نا۔'' عدیل خاں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سامیہ سے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ تو وہ دونوں بے اختیار ہنس پڑیں۔ اسی وقت حرا کی ماما ڈارک براؤن ویلوٹ کا سوٹ اور سیاہ کشمیری شال کندھوں پر ڈالے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ جوان بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ بے حد دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ اور اُن کا حسن ہنوز برقرار تھا۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ اور جدید تراش خراش کے لباس سے وہ بے حد باوقار لگ رہی تھیں۔

''آنٹی آپ آج کہاں بجلیاں گرانے جارہی ہیں اس شدید سردی میں جو آپ کو دیکھے گا بے ہوش ہوجائے گا۔'' عدیل خاں نے کھڑے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

''کیسے ہو عدیل بیٹے کافی دنوں بعد آنا ہوا؟'' شافیہ بیگم نے عدیل کے شوخ جملے کو نظرانداز کر کے مسکرا کر کہا اور پھر اُن کی نظر سامیہ پر پڑی تو وہ بولیں۔

''سامیہ بیٹی بھی آئی ہے شاپنگ مکمل ہوگئی بہن کی منگنی کی یا پھر ابھی کچھ باقی ہے۔''

''جی آنٹی مکمل ہوگئی شاپنگ...... سنڈے کو ہے منگنی کا فنکشن، میں آج تو آپ لوگوں کو انویٹیشن دینے آئی تھی۔'' سامیہ نے شافیہ بیگم کو سلام کر کے اُن کی

بات کا جواب دیا۔

''گڈ...... اللہ تعالیٰ خیریت سے ہر کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ اوکے بچو، تم لوگ انجوائے کرو۔ مجھے جلدی ہے دراصل میری ایک فرینڈ کی برتھ ڈے ہے اور اُس نے ناراض ہونے کی دھمکی دے کر مجھے مجبور کیا کہ میں ضرور اس فنکشن کو اٹینڈ کروں۔''

''مگر آنٹی باہر تو اچھی خاصی دھند پڑ رہی ہے۔'' عدیل خاں نے پائیں باغ میں نکلنے والی کھڑکی سے تھوڑا سا پردہ ہٹا کر کہا۔ واقعی باہر سورج غروب ہونے سے پہلے ہی کافی تاریکی چھا چکی تھی۔ اور یہ گہری ہوتی ہوئی دھند کی وجہ سے تھی۔ کچھ فاصلے پر بھی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ درخت بھی سردی میں ٹھٹھرے ہوئے چپ چاپ کھڑے تھے ہر چیز پر دسمبر کی مخصوص قسم کی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

''ہاں دھند تو ہے مگر اب جانا تو ضروری ہے ویسے بھی ہمارا ڈرائیور دھند میں گاڑی چلانے کا ایکسپرٹ ہے۔'' یہ کہہ کر شافیہ بیگم لاؤنج سے نکل گئیں۔

''اچھا تو آپ کی بہن کی انگیج منٹ ہے اور آپ نے مجھے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔'' عدیل خاں نے گلہ کیا۔

''دراصل اتنے دنوں بعد تو آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ پھر میرے پاس آپ کا کنٹیکٹ نمبر بھی نہیں تھا۔'' سامیہ نے معذرت کی۔

''کانٹیکٹ نمبر کا کیا ہے...... وہ آپ حرا سے لے سکتی تھیں۔ آپ مجھ سے اپنی ہر بات چھپاتی ہیں۔ پہلے اپنی شادی اور بچے چھپائے اب بہن کی منگنی کی خبر، شاید آپ ڈرتی ہیں کہ میں بھی آپ کی طرح نظر نہ لگادوں گا آپ کو۔'' عدیل نے قدرے مزاحیہ لہجے میں جواب میں سامیہ نے خاموشی سے اپنے پرس سے ایک خوبصورت سانہری انویٹیشن کارڈ نکالا۔ اُس پر عدیل خاں کا نام لکھا اور اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''تھینک یو، ویسے میں خود مانگ کر دعوت نامہ نہیں لیا کرتا۔ مگر اب آپ اصرار کر رہی ہیں تو انکار کرنا بھی مناسب نہیں کہ کہیں آپ ناراض ہی نا ہو جائیں۔ پہلے ہی تین ماہ بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے آج۔''

عدیل نے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

''ویسے عدیل آپ ڈاکٹر یونہی بن گئے آپ کو تو فلمی اداکار ہونا چاہیے تھا وہ بھی مزاحیہ۔'' حرا نے چائے اور دیگر لوازمات ٹرالی سے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''واقعی تم صحیح کہتی ہو مگر یہ میرے اماں ابا کو شوق چڑھا تھا مجھے ڈاکٹر بنانے کا ایمان سے سخت پچھتا رہا ہوں۔ آج بالی وڈ یا ہالی وڈ کی فلموں میں کام کر رہا ہوتا تو لاکھوں لڑکیاں میرے پیچھے دیوانی ہوئی پھرتیں۔'' عدیل نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ تو بے اختیار سامیہ ہنس پڑی۔

''تم نے ابھی سے کیوں چائے تیار کر لی۔ ایاز کو تو آنے دو۔'' عدیل نے گرم گرم چکن روسٹ کی خوشبو کو گہری سانس کے ذریعے اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔

''ایاز بھائی آ چکے ہیں۔'' حرا نے اطمینان سے کہا۔

''کدھر ہے وہ کیا اُس نے جادو کی ٹوپی پہن رکھی ہے جو وہ مجھے نظر نہیں آ رہا۔'' عدیل نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی وہ باہر گیراج میں گاڑی پارک کر رہے ہیں۔ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے فون پر بتایا تھا کہ وہ گھر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے ہی میں نے چائے تیار کروائی تھی۔'' حرا نے چائے کے بڑے بڑے بھاپ اُڑاتے مگ سامیہ اور عدیل کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہیلو فرینڈز ہاؤ آر یو آل۔'' اسی لمحے ایاز نے لاؤنج میں داخل ہو کر کہا۔ اور پھر سب نے پُرجوش انداز میں اُسے خوش آمدید کہا۔ ایاز چینج کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور وہ لوگ چائے پیتے ہوئے دلچسپ باتوں کے ساتھ ساتھ حرا کی محنت سے بنائی گئی چیزوں سے بھی انصاف کرتے رہے۔

''سامیہ کیسی ہو۔ منگنی کی ڈیٹ فکس ہو گئی کیا؟'' ایاز نے نیلے رنگ کے گرم سوٹ کے ساتھ براؤن چادر کاندھے پر ڈالے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے

سامیہ کو مخاطب کیا۔

''جی بھائی سنڈے کو ہے۔'' سامیہ نے جواب دیا۔

''گڈ...... تیاری تو ساری مکمل ہو چکی ہے نا؟'' ایاز نے عدیل کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کافی حد تک۔'' سامیہ نے چائے کا مگ بنا کر ایاز کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ایاز بھائی یہ فش کے کباب لیں۔ میں نے خصوصی طور پر آپ کے لیے بنوائے ہیں۔'' حرا نے فش کباب کی ڈش ایاز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ پیاری سی گڑیا آج بہت دونوں بعد ہم لوگ اکٹھے ہوئے ہیں۔ ورنہ تو شام بہت بور گزرتی تھی بہت مزہ آرہا ہے۔'' ایاز نے کانٹے سے ایک کباب اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے کہا۔

''گاجر کا حلوہ بھی بہت مزے کا ہے۔ حرا جاتے ہوئے مجھے کچھ ڈونگے میں ڈال دینا میں صبح ناشتے میں بھی کھاؤں گا۔'' عدیل نے ابلے ہوئے انڈوں اور پستے بادام سے گارنش کیے ہوئے گاجر کے حلوے کو کھاتے ہوئے کہا۔

''سردیاں اسی لیے اچھی لگتی ہیں کہ اس موسم میں مزے مزے کی گرما گرم چیزیں کھانے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔'' حرا نے آلو کے کٹلس پر کیچپ ڈالتے ہوئے کہا۔

''پھر سردی میں بھوک بھی خوب لگتی ہے جبکہ گرمی میں تو کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔ بندہ پانی پی پی کر ہی پیٹ بھرتا رہتا ہے۔'' سامیہ نے فش کباب اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے، مگر ان سب چیزوں کو بنانے میں محنت بھی بہت لگتی ہے۔ بنانے والے کا حشر ہو جاتا ہے۔ گھنٹوں کچن میں گھس کر۔'' ایاز نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

''ہاں لیکن چونکہ سردی میں کچن کا گرم گرم ماحول اچھا اور آرام دہ ہوتا ہے۔ اس لیے گھنٹوں کام کر کے بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ سرد موسم میں انسان ویسے بھی زیادہ ایکٹو اور فریش محسوس کرتا ہے اپنے آپ کو، اسی لیے تو ٹھنڈے ملکوں میں رہنے والے لوگوں نے اتنی ترقی کی ہے میں جب اپنے علاقے میں جاتا ہوں۔ تو حیران ہوتا ہوں کہ کیسے برفباری میں بچے اور عورتیں اپنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں نا میدانی علاقوں کے لوگوں کی طرح وہ سردی میں سوں سوں کرتے ہیں نا ہی گھروں میں دبکے رہتے ہیں۔ نا نزلہ زکام اور دوسری ٹھنڈے موسم کی بیماریاں انہیں تنگ کرتی ہیں۔''

''بڑا اچھا لگ رہا ہے یوں کھاتے پیتے ہوئے باتیں کرنا۔ ایسا کریں عدیل آپ آج رات یہیں رہ جائیں۔ اتنی دھند میں کیسے جائیں گے۔ اور سامیہ تمہیں بھی میں صبح چھوڑ آؤں گی۔ ایک عرصے بعد تو ہم لوگوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ میری یونیورسٹی اور سامیہ کا کالج تو ویسے بھی ایک ہفتے کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہے۔ پڑھائی کا بوجھ بھی نہیں، راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔'' حرا نے تجویز پیش کی تو سب نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

پھر وہ لوگ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران شافیہ بیگم بھی آچکی تھیں۔ وہ بھی کچھ دیر اُن لوگوں کی محفل میں بیٹھیں۔ پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ یہ لوگ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرائی فروٹ اور چائے کافی بھی پیتے رہے۔ شام کی چائے کے ساتھ اتنا کچھ کھالیا تھا کہ کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

رات کے بارہ بجے شدید دھند اور کہر میں باہر لان میں نکل کر کچھ دیر چہل قدمی کرتے رہے پھر جب سردی ناقابل برداشت ہوگئی تو لاؤنج میں آگئے۔ سامیہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور فریش محسوس کر رہی تھی۔ عدیل کے شوخ جملوں اور والہانہ بولتی نگاہوں نے اُسے بے حد طمانیت اور خوشی بخشی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وقت تھم جائے اور وہ اسی طرح اپنے پسندیدہ شخص کے ساتھ باتیں کرتی رہے اور یونہی زندگی بیت جائے۔ کس قدر خوش مزاج اور زندگی سے بھرپور شخص ہے جانے کس خوش نصیب کے مقدر کا ستارہ ہے یہ۔''

رات دیر تک خوش گپیوں کے بعد جب وہ لوگ نیند سے بے حال ہو گئے تو پھر ہی سونے کے لیے اٹھے۔ سامیہ حرا کے کمرے میں آ گئی۔ اور ایاز اور عدیل ایاز کے بیڈروم میں جا کر سو گئے۔

سامیہ نے حرا کا ہلکا پھلکا شب خوابی کا لباس پہن لیا اور پھر بیڈ پر لیٹ کر کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد گہری نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔

رات دیر تک جاگنے کے بعد سامیہ کی آنکھ بھی خاصی دیر سے کھلی تھی۔ چونکہ کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز ویلوٹ کے گہرے رنگ کے پردے پڑے تھے۔ اس لیے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سامیہ نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی اپنی ریسٹ واچ میں وقت دیکھا اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ حرا ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ سامیہ آہستگی سے بیڈ سے اٹھی۔ حرا کا پنک کلر کا گاؤن پہنا اور حرا ہی کے سلیپر پہن کر ہولے ہولے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

سارے گھر میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سبھی لوگ ابھی سوئے ہوئے تھے۔ ویسے بھی آج چھٹی تھی اس لیے چھٹی والے دن تو کوئی بھی بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں جاگتا۔ البتہ سامیہ کی شروع ہی سے صبح سویرے بیدار ہونے کی عادت تھی۔ کیونکہ وہ فجر کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ امی نے بچپن ہی سے اُن سب بہنوں کو نماز کا عادی بنا دیا تھا۔ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے کے بعد اگر کالج نا جانا ہو تو پھر وہ دوبارہ سو جاتی تھیں۔ آج اُس کی نماز بھی قضا ہو گئی تھی۔ جس کا اُسے افسوس ہو رہا تھا۔

وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لان میں سرما کی ٹھٹھری ہوئی ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دھند ابھی مکمل طور پر نہیں چھٹی تھی۔ گھاس پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ لگے جامن، آم اور ایور گرین درختوں کے پتوں پر بھی گری اوس دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ہر چیز سردی کی گرفت میں تھی۔ پرندے ہنوز اپنے اپنے گھونسلوں میں سردی سے سمٹے، سکڑے پڑے تھے۔ وہ دھوپ تیز ہونے کے منتظر تھے تاکہ باہر نکل کر اپنی روزی تلاش کر سکیں۔ سامیہ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

خنکی کی وجہ سے اُس کے دانت بج رہے تھے اور سانس سفید دھوئیں کی طرح نتھنوں سے خارج ہو رہی تھی اسے یہ خوابناک ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وسیع وعریض کوٹھی کا لان ہی کئی کنال پر مشتمل تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ چھوٹے گھروں کے گھٹے ہوئے ماحول کی نسبت بڑے گھروں کی وسعت میں کس قدر سکون اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ اُس کے والدین کا گھر ایک قدرے بہتر لیکن گنجان آباد علاقے میں تھا۔ دس مرلہ پر مشتمل گھر میں چھوٹا سا لان ہی بن سکا تھا۔ جبکہ شوہر کا گھر اگرچہ ایک اچھی جدید آبادی میں تھا۔ رقبہ بھی ایک کنال تھا۔ مگر اس گھر کے مقابلے میں تو وہ بھی ڈربہ سا محسوس ہوتا تھا۔ پھر اُسے چونکہ اپنا شوہر ہی پسند نہیں تھا۔ اس لیے وہ گھر بھی اُس کی نظروں میں بھی نہیں بچا تھا۔ جبکہ اُس نے تو ہمیشہ ایسے ہی وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے شاندار سے گھر کے سپنے دیکھے تھے۔ مگر ضروری تو نہیں کہ انسان کے ہر سپنے کی تعبیر من چاہی ہی ہو۔ اُسے حرا کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ ظاہر ہے شادی بھی اپنے جیسے کسی امیر و کبیر شخص ہی سے ہو گی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹر عدیل ہی اُس کا جیون ساتھی بن جائے۔ اتنا تو اُس کا اس گھر میں آنا جانا تھا۔ پھر دور پار کے رشتے دار بھی تھے۔ عدیل کو اور کیا چاہیے ہو گا بھلا۔

سامیہ واک کرتی ہوئی ایسی ہی حسرت ناک سوچوں میں مستغرق تھی کہ کسی نے اُس کے قریب آ کر کہا۔

''ہیلو ڈاک، آپ بھی میری طرح سحر خیز اتفاق سے ہماری کتنی عادتیں ملتی جلتی ہیں بس قسمت ہی میں ہمارا ملن نا تھا۔ کاش کچھ عرصہ پہلے ہماری ملاقات ہوئی ہوتی تو پھر میں دیکھتا کہ کون پھنے خاں آپ سے شادی کی جرأت کرتا ہے۔''

''السلام علیکم! ڈاکٹر صاحب، صبح بخیر۔'' سامیہ نے ڈاکٹر عدیل کی باقی ماندہ بات کو نظر انداز کرتے

ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔
"شرمندہ کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" عدیل نے اپنی سردی اور کچھ زکام سے بہنے والی ناک کو ٹشو سے صاف کرتے کہا۔
"ہائیں میں نے تو آپ کو صرف سلام کہا ہے۔ اس میں شرمندہ کرنے والی کون سی بات ہے۔" سامیہ نے حیرت سے کہا۔
"دیکھیں نا میں نے آپ کو ہیلو کہا اور پ نے جواب میں مجھے سلام کہا۔ اس سے تو آپ کا مقصد مجھے یہ احساس دلانا تھا کہ بحیثیت مسلمان کے ہمیں ایک دوسرے کو سلام کرنا چاہیے نا کہ گوروں کی تقلید میں ہیلو کہا جائے۔"
"ویسے آپ بولتے بہت ہیں۔ کہاں سے اتنا باتوں کا اسٹاک اکٹھا کر رکھا ہے آپ نے؟" سامیہ نے مسکرا کر پوچھا۔
"شکر ہے میرے مولا ترا کہ اس محترمہ کو بالآخر مجھ میں کوئی تو خوبی نظر آئی۔" عدیل نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو بے اختیار سامیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"بس ایسے ہی ہنستی مسکراتی رہا کریں آپ، یوں روتی بسورتی اور سوگوار شکل لیے آپ ذرا بھی اچھی نہیں لگتی ہیں۔"
"جب نصیب ہی میں ہنسنا مسکرانا نا ہو تو بندہ کیسے ہنسے۔" غیر ارادری طور پر سامیہ کے منہ سے نکلا۔
"ک...کیا...مطلب آپ کا؟" عدیل نے حیرت سے استفسار کیا۔
"ک...کچھ...نہیں یونہی بول پڑی تھی۔ بلاوجہ ہی..." سامیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
"یونہی تو کوئی نہیں بولتا۔ کوئی بات ہے ضرور۔ میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے آپ مجھے کھوئی کھوئی سی اور بجھی بجھی سی ہی لگی ہیں۔ آپ کی عمر کی لڑکیوں میں جو شوخی اور چلبلا پن ہوتا ہے وہ آپ میں مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔"
اُس نے رخ موڑ کر ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھوں میں در آنے والی نمی صاف کی۔ اور چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ سجا کر لرزیدہ لہجے میں گویا ہوئی۔
"اب کیا فائدہ ان باتوں کا...... جو نصیب میں ہوتا ہے وہی انسان کو ملتا ہے سوچنے اور چاہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔"
"خیر یہ تو کم ہمت لوگ نصیب اور مقدر کو کوستے ہیں ورنہ زندگی میں جرأت مند لوگ جو چاہے وہ پالیتے ہیں۔" عدیل نے مضبوط لہجے میں کہا۔
"ہوں گے ایسے لوگ دنیا میں مگر میں نا جرأت مند ہوں نا باہمت، اس لیے جو مل گیا اسی پر شاکر ہوں۔" سامیہ کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی گھلی ہوئی تھی۔
"مگر آپ شاکر نہیں ہیں اپنے نصیب پر، آپ کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مجبوراً یہ ناپسندیدہ شادی کا بندھن نبھا رہی ہیں۔ ورنہ نا آپ کو اپنے شوہر سے کوئی دلچسپی ہے نا ہی اپنے بچوں سے کسی قسم کا لگاؤ ہے اگر ایسا ہوتا تو آپ کبھی تو شوہر کا ذکر کرتیں، بچوں کے بارے میں بات کرتیں۔ مگر آپ نے تو اپنی زندگی کی کتاب کا یہ چیپٹر بظاہر کلوز کر رکھا ہے اور آپ یہی کوشش کرتی ہیں کہ کسی کو بھی آپ کی ذات کے اس معاملے کی ہوا بھی نا لگ سکے۔ تبھی تو جب صدف آپ کی شادی اور بچوں کا ذکر کر رہی تھی تو آپ کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات تھے۔" عدیل نے اپنی بات ختم کی تو سامیہ حیرت سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔
وہ حیران تھی کہ بظاہر اُس شوخ و شریر شخص کا مشاہدہ اور تجزیہ کس قدر حقیقت کے قریب ہے۔
"چلیے چھوڑیں اِن باتوں کو...... اندر چلتے ہیں حرا اور ایاز بھائی جاگ چکے ہوں گے۔" یہ کہہ کر سامیہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف بڑھ گئی اور عدیل وہیں کھویا کھویا سا کچھ دیر تک چہل قدمی کرتا رہا۔

☆......☆......☆

چونکہ منگنی کی تقریب اکٹھی کرنے کا فیصلہ ہوا تھا اور اُس میں تین گھرانے شامل تھے۔ اگر سب لوگ اپنے گھر والوں کے علاوہ کچھ قریبی رشتے داروں اور اپنے چند احباب کو بھی مدعو کرتے تو کم از کم سو افراد تو ہو ہی جاتے اور اتنے افراد کے لیے کسی بھی ایک گھر میں

انتظام کرنا خاصا مشکل تھا۔ کیونکہ تینوں گھر ہی چھوٹے چھوٹے تھے اسی لیے خاصی سوچ بچار اور باہمی صلاح و مشورے کے پی سی میں ہی فنکشن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جہاں تک اخراجات کی بات تھی تو تینوں گھروں نے چونکہ مل کر خرچ کرنا تھا۔ اس لیے کسی ایک خاندان پر سارے اخراجات کا بوجھ نہیں پڑنے والا تھا۔

شہاب تو باہر سے کافی رقم کما کر لایا تھا۔ صباحت کے منگیتر سجاد کے بڑے بھائی نے بینک سے لون لے لیا تھا۔ جبکہ سعدیہ بیگم نے اپنے اس مقصد کے لیے کافی عرصہ پہلے ہی کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ اُس کی رقم انہیں مل گئی۔ اور یوں اخراجات کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا۔

اتوار کو رات کے آٹھ بجے پی سی کے بینکویٹ ہال میں منگنی کی تقریب منعقد ہوئی۔ صباحت اور ہانیہ اپنے پسندیدہ کلرز کے ملبوسات میں ایک اچھے پارلر سے میک اپ کروانے کے بعد بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ شہاب اور سجاد بھی تھری پیس سوٹوں میں ملبوس بہت ہینڈسم لگ رہے تھے۔ سبھی مہمان پیاری پیاری معصوم صورت دولہنوں اور اُن کے منگیتروں کو بہت سراہ رہے تھے۔ سامیہ بھی بہت خوش تھے۔ خاندان کی پہلی تقریب تھی اُس کی ناپسندیدہ شادی کے بعد جس میں اُس نے بھرپور طریقے اور دل کی تمام تر حسرتوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اور وہ دل ہی دل میں اپنی بہن کی دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔

اُس نے صدف، دو میڈیکل کالج کی فرینڈز اور حرا کی پوری فیملی کو انوائٹ کیا تھا اور وہ سب لوگ آئے تھے البتہ ڈاکٹر عدیل نہیں آیا تھا۔ حالانکہ تقریب کے آخر تک اُس کی نگاہ عدیل کی منتظر رہی تھیں جبکہ اُس نے حرا کو فون کر کے بتایا تھا کہ ہاسپٹل میں ایمرجنسی ڈیوٹی کی وجہ سے وہ آنے سے قاصر ہے۔ البتہ اُس نے نیک خواہشات کا کارڈ اور سرخ گلابوں کا بُو کے ضرور بھیجا تھا۔ پھر بھی سامیہ کو موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ کسی لمحے بھی اپنی مخصوص شوخ و شریر مسکراہٹ لبوں پر سجائے چلا آئے۔

شہاب، اور سجاد کے دو تین دوست بھی اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ آئے تھے۔ جبکہ سعدیہ بیگم نے اپنی ایک دو قریبی دوستوں کے علاوہ اپنی دو بہنوں اور ایک بھائی جو لاہور میں مقیم تھا کو بلایا تھا سامیہ کے سسرال والے بھی آئے تھے۔

مبارک احمد اور عفیرہ بیگم کے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اپنی تمام تر ناراضگی کے باوجود عالی اپنی بیوی اور سسرال والوں کے ہمراہ تقریب میں شامل ہوا تھا اور بہن بھائی کو بہت قیمتی تحائف بھی دیے تھے۔ پنکی بھی خوشی خوشی سب سے مل رہی تھی۔ اس طرح یہ خوبصورت تقریب انواع و اقسام کے کھانوں کے ساتھ بہت اچھی رہی سب ہی مہمانوں نے تقریب کو سراہا۔ جو کہ تینوں گھرانوں کے لیے باعث اطمینان تھا۔

شہاب چونکہ ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس لیے منگنی کے فنکشن کے بعد وہ ایک ہفتے کے لئے برف باری کو انجوائے کرنے کے لیے مری اپنے دوستوں کے ہمراہ چلا گیا۔

وہاں سے واپس آیا تو اُسے عالی نے فون کیا کہ وہ اپنی چھٹی کا آخری ہفتہ اُس کے ساتھ کراچی میں گزارے۔ چنانچہ وہ والدین اور بہن سے رخصت ہو کر کراچی چلا گیا۔ اُس کے کراچی روانگی سے پہلے سعدیہ بیگم نے شہاب کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ انہوں نے عفیرہ بیگم، مبارک احمد اور صباحت کے ساتھ ساتھ صباحت کے سسرال والوں کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ اس طرح تینوں گھرانوں کا یہ گیٹ ٹو گیدر بہت اچھا رہا۔

سامیہ بھی بچوں، وہاب احمد اور اپنی ساس کے ساتھ آ گئی تھی۔ اگرچہ اس دعوت پر خاصے اخراجات اُٹھ گئے تھے۔ مگر سعدیہ بیگم نے اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر یہ اخراجات کسی نہ کسی مد میں پورے کر ہی لیے۔

اصل میں وہ چاہتی تھیں کہ اس طرح میل جول رکھنے سے سمعیہ کے رشتے کی بھی کوئی سبیل پیدا ہو جائے کیونکہ دو تین سال تک اُس نے بھی اپنی تعلیم مکمل کر لینی تھی۔ منگنی کی تقریب میں سجاد کا ایک دوست جو ایم بی اے تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا وہ سعدیہ بیگم کو بہت پسند آیا تھا اور

انہوں نے دبے لفظوں میں عفیرہ بیگم سے کہا تھا کہ وہ صباحت کی ساس سے کسی مناسب موقع پر بات کریں کہ وہ سجاد سے اس کے اُس دوست کے بارے میں دریافت کریں۔ اس پر عفیرہ بیگم ہی نے سعدیہ بیگم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صباحت کے سسرال والوں کو بھی دعوت میں مدعو کرلیں۔

سجاد اور اُس کے بھائی بھابی اور والدین سعدیہ بیگم کے رکھ رکھاؤ اور اخلاق سے بہت متاثر ہوئے تھے اور پھر دعوت کے کچھ دنوں بعد جب عفیرہ بیگم کے کہنے پر رقیہ بیگم نے سجاد سے سعدیہ بیگم کی اس خواہش کا ذکر کیا کہ وہ اس کے دوست نعمان کو اپنی تیسری بیٹی کے لیے پسند کرچکی ہیں تو سجاد نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں نعمان سے بات کرے گا۔

اور پھر جب اُس نے نعمان کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرکے اپنی والدہ کو بتایا کہ نعمان کو سعدیہ بیگم کے ہاں رشتہ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تو رقیہ بیگم نے عفیرہ بیگم کے ذریعے سعدیہ بیگم سے رابطہ کرکے انہیں یہ خوشخبری سنائی تو وہ اُن کے خلوص سے بے حد متاثر ہوئیں اور پھر جلدی عفیرہ بیگم اور رقیہ بیگم کی کوششوں سے سمعیہ کا رشتہ نعمان سے طے ہوگیا۔

''انیلہ بیٹی کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ تمہاری آج آفس جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا تمہارا۔'' صغریٰ نے دس بجے تک بھی انیلہ کو بستر پر پڑے دیکھ کر پریشان ہوکر پوچھا۔

''وہ امی سر میں شدید درد ہو رہی ہے۔'' انیلہ نے اپنی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

''اوہو...... میری بچی تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟ میں ابھی بام کی مالش کرتی ہوں۔ اور پھر ہلکا سا ناشتہ کرکے درد والی گولی کھالینا ابھی ٹھیک ہوجاؤ گی۔'' یہ کہہ کر صغریٰ نے الماری سے بام کی شیشی نکالی اور انیلہ کے بستر پر بیٹھ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ کر نرم نرم ہاتھوں سے اُس کی پیشانی پر بام کا مساج کرنے لگی۔

''امی آپ کے پیارے پیارے ہاتھوں میں کتنی شفا ہے۔ دیکھیے میرا سر درد فوراً غائب ہوگیا۔'' انیلہ نے ماں کے برتن مانجھ مانجھ کر سیاہ پڑے ہوئے کھردرے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے عقیدت سے کہا۔

''تمہاری یہ عادت بہت بری ہے۔ ہر تکلیف چھپاتی ہو اور پھر جب تکلیف زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ تو بیمار پڑ جاتی ہو ایسا نا کیا کرو میری بچی۔'' صغریٰ نے انیلہ کے سر کو چومتے ہوئے کہا۔ تو انیلہ کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب سا رواں ہوگیا، اور وہ ماں سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

''کیا بات ہے میری جان کیوں رو رہی ہو۔'' صغریٰ نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی بس روتی چلی گئی۔ ہچکیوں کی شدت سے اُس کا پورا بدن بری طرح لرز رہا تھا۔ صغریٰ نے اُسے چپ کروانے کی کوشش نہیں کی۔ بس اُس کے سر کو اپنے ممتا بھرے ہاتھوں سے سہلاتی رہی۔ جب کافی دیر تک رونے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تو اُس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں کے مقدس چہرے کو دیکھا اور ہولے سے بولی۔

''امی تم کتنی اچھی ہو۔ کتنی پیاری، کتنی مقدس اور پاکیزہ..... کاش میں بھی ایسی ہی ہوتی۔''

''میری چندا میری لاڈلی تو مجھ سے بھی ہزار گنا اچھی ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھ تمہارا خوبصورت چہرہ چاند کی طرح چمک رہا ہے۔'' صغریٰ نے اُس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''مگر ماں تیرا یہ چاند گہنا چکا ہے۔ اس کی پاکیزگی داغدار ہوچکی ہے۔ تو کیا جانے کہ تیری بیٹی اتنی سی عمر ہی میں دولت محبت اور پُرسکون اور محفوظ زندگی پانے کی چاہ میں اپنا سب کچھ لٹا کر تہی داماں ہوچکی ہے۔'' انیلہ نا سمجھنے والی آواز میں بڑبڑائی۔

صغریٰ اپنا ہی راگ الاپتی رہی۔ ''میری بچی کس قدر کمزور ہوگئی ہے۔ پھول سا چہرہ کملا گیا ہے۔ پہلے پڑھائی کرکر کے ہلکان ہوتی رہی۔ پھر نوکری، وہ بھی ایسی کہ سارا دن گھر سے بھوکی پیاسی غائب رہتی ہے۔ اللہ غارت کرے تمہارے لالچی اور خود غرض باپ کو

جس نے معصوم سی بچی کو پیسہ کمانے کی مشین بنا رکھا ہے۔ بیٹی کی شادی کرنے کی بجائے اپنا بیاہ رچا بیٹھا ہے۔

''اماں میں چاہتی ہوں کہ نوکری چھوڑ دوں۔ اور بس گھر میں رہوں سارے گھر کے کام کروں۔ تیری خدمت کروں۔ ساری زندگی تم نے ہماری خدمت کی ہے۔ اب ہمیں تیری خدمت کرنی چاہیے۔'' انیلہ نے ماں کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر کہا۔

''یہ تو تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ یہ تم نوکری ووکری چھوڑ گھر میں رہو، کچھ گھر داری سیکھو تا کہ میں کوئی شریف سا لڑکا دیکھ کر تمہارے ہاتھ پیلے کر سکوں۔'' صغریٰ نے اپنی ہتھیلی سے انیلہ کی آنکھوں سے اشک صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں شریف لڑکا، ماں تیری بیٹی سے تو کوئی بدقماش اور آوارہ لڑکا بھی شادی نہیں کرے گا۔ تو کس قدر انجان ہے۔'' انیلہ نے آہستگی سے خود کلامی کی۔

''یہ کیا تم بڑبڑانے کی عادی ہوتی جا رہی ہو، نہیں دادی کے پاس بیٹھ بیٹھ کر تو نہیں سیکھ لیا۔ وہ تو بے چاری عمر رسیدہ ہو چکی ہے۔ پھر اُسے سنائی بھی کم دینے لگا ہے۔ اس لیے اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ مگر تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔'' صغریٰ نے اُلجھ کر پوچھا۔

''ک...... کچھ ...... نہیں اماں ...... وہ ...... بس ویسے ہی۔'' انیلہ سے کوئی جواب نا بن پڑا تو بوکھلا کر بولی۔

''نا...... نا بیٹی ایسے نہیں بڑبڑاتے۔ دیکھنے سننے والے سمجھیں گے کہ بچی کا دن رات محنت کر کر کے دماغ چل گیا ہے۔ اور کسی جوان لڑکی کے بارے میں ایسی ویسی باتیں مشہور ہو جائیں تو کوئی اُس کا رشتہ قبول نہیں کرتا۔'' صغریٰ نے پریشان لہجے میں کہا۔

''میری معصوم سی ماں تیری بیٹی کا رشتہ ویسے بھی کوئی نہیں لے گا۔ کہ وہ جس بھیڑیے کے چنگل میں پھنس چکی ہے وہ شادی تو دور کی بات ہے اسے نا جینے دے گا نا مرنے دے گا۔'' انیلہ نے دل ہی دل میں زہر خند سے کہا۔

''اچھا بیٹی تم آرام کرو۔ میں ذرا دیکھوں کہ سلمیہ آپا کیا کر رہی ہیں۔ وینا کی شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں کل سارا دن وہ راحیلہ اور تمہاری تائی اماں کے ساتھ خریداری کرتی رہی تھیں۔ دیکھوں تو سہی کیا کیا خرید کر لائی ہیں۔'' صغریٰ نے انیلہ کے بستر سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اُسی وقت انیلہ کے پرس سے موبائل کی بیل کی آواز آئی۔

انیلہ نے دکھتے ہوئے سر کو سہلاتے ہوئے اُٹھ کر پرس سے موبائل نکالا تو اس میں موجود واحد نمبر اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

''ہیلو......'' اُس نے کمزور آواز میں کہا۔

''آج تین بجے میں تمہارے آفس آؤں گا۔ تم اس آفس سے استعفیٰ دے دو گی۔ میں تمہیں ایک کال سینٹر میں جاب دلوا رہا ہوں۔ وہاں شام کو پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک تم کام کرو گی۔ صبح دس بجے سے دو بجے تک تم سعدیہ بیگم کے پارلر میں جایا کرنا۔ میں دو بجے تمہیں وہاں سے پک کر لیا کروں گا۔ اور پانچ بجے تمہیں تمہارے آفس پہنچایا کروں گا۔ آفس سے واپسی کے لیے تمہیں رکشا لگوا دوں گا۔'' حارث نے انیلہ کی بات سنے بغیر اپنا طویل پروگرام بتایا۔

''مگر حارث صاحب میں تو آج آفس ہی نہیں گئی۔'' انیلہ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ اچھا ایک بات بتائیں آپ مجھے پسند کرتے ہیں کیا؟''

''کیوں؟'' وہ غرایا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔'' حارث نے حیرت سے انیلا کو دیکھا۔

''تو اب مانگ لیجیے رشتہ......''

''فی الحال میں فوری طور پر شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میرے کچھ مسائل ہیں وہ حل ہو جائیں تو پھر میں آزاد ہوں۔ اور پہلی فرصت میں تم سے شادی کر لوں گا۔''

(جاری ہے)

ناول

زمر نعیم

ابھی امکان باقی ہے

اُن کرداروں کی کہانی، جو ہر معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر
جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے **قسط نمبر 4**

''نہیں...... انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دراصل ہمارے ہاں رسم ورواج کی ایسی خاص پابندی نہیں ہے۔'' احمد حسن نے بات ختم کردی۔

انعم کا موڈ نجانے کس بات پر خراب تھا۔ وہ سبھی سے الگ تھلگ بیٹھی ہوئی تھی جبکہ اُس کی ساس، نندیں (دونوں) زبیدہ خان کے ساتھ خصوصی نشستوں پر براجمان تھیں۔ سبرینہ اُسے ڈھونڈتی ہوئی کونے کی میز پر چلی آئی تھی۔

''تم یہاں کیوں چلی آئی ہو۔ اسٹیج پر جا کر بیٹھو۔ تصویریں بن رہی ہیں۔ بعد میں شکوہ کرو گی کہ تمہاری کوئی تصویر نہیں بنی۔'' سبرینہ نے اُس کا موڈ بھانپتے ہوئے بات کی۔

''مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے کہ...... ویسے بھی وہاں ہمارے لیے جگہ نظر آرہی ہے؟ دلہن کے میکے والے تو بالکل چپک ہی گئے ہیں۔ انسان اپنے رویے سے پہچانا جاتا ہے۔ اصم بھائی کے لیے لڑکیوں کی کمی تھی جو بابا جان نے......''

''انعم...... اصم کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی مگر اُس کا مقدر وہاں لکھا تھا۔ تم اس حقیقت کو تہہ دل سے مان لو گی تو تمہیں اروی اور اس کے گھر والوں کی حیثیت سے اختلاف نہیں رہے گا۔'' ثمن بھابی بھی وہاں چلی آئی تھیں۔ ویسے بھی انعم کو سبھی خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ وہ جب سے امید سے ہوئی تھی تب سے سبھی کی کوشش ہوتی تھی کہ اُسے خوش رکھا جائے کیونکہ اُس کا پہلے ایک مس کیرج ہو چکا تھا۔

''بات اختلاف کی نہیں ہے۔ مجھے بس ذہنی کوفت ہو رہی ہے۔ ہم کس کس کو ایکسپلین کریں گے کہ ہم نے اصم بھائی کی شادی کن حالات میں کی ہے اور وہ بھی لوئر مڈل کلاس میں...... اور پھر اروی...... بھا...... بی ایف اے یا بی اے کرنے کے بعد وہ مینٹل اپروچ تو نہیں رکھتی ہوں گی جو ہماری ہے اور اصم بھائی کی...... اصم بھائی نے اپنی آدھی زندگی تو باہر گزاری ہے۔ کیا وہ زیادہ دیر تک اس طرح کی شادی نبھا

پائیں گے؟'' انعم نے اپنا غبار آخر نکال ہی دیا۔

اُسے بالکل پرواہ نہیں تھی کہ کوئی اُس کی بات سن لے گا۔

''انعم...... تم یہ ٹینشن کیوں لے رہی ہو...... اصم نے اپنی مرضی سے یہ ذمہ داری لی ہے...... اور ذرا سوچو اروٰی کے والدین کی کلاس یا مینٹل اپروچ سے ہمیں کیا لینا دینا۔ وہ کبھی کبھار ہی ہم سے ملیں گے۔ ہمارا تعلق صرف اروٰی سے ہے اور اروٰی بے شک بے حد سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔''

''ہم اُس کے والدین سے نہیں ملیں گے اروٰی تو ملے گی اور پھر اصم بھائی بھی...... کل کو اصم بھائی کے بچے ہوں گے کسی نے سوچا ہے اُن کی شخصیت کیسی ہوگی۔''

''افوہ...... انعم...... تم تو بہت دور کی سوچ رہی ہو۔ میری بہن اٹھو اور جا کر فائق کے پاس بیٹھو۔ تم بس اُس پر نظر رکھا کرو باقی سب بھلا دو۔ ان حالات میں اپنے شوہروں کو تنہا چھوڑنا خطرے کی بات ہے۔ چلو آؤ۔''

ثمن بھابی صلح جو اور معاملہ فہم بھی تھیں اس لیے اُسے زبردستی اُٹھا کر لے گئیں۔ سبرینہ بھابی بھی انعم کے اختلاف پر سوچ میں پڑ گئیں۔ اروٰی کے گھر والے خوشی خوشی رخصت ہوئے تھے۔ بی بی جان نے اپنے سلوک و رویے سے اُن کی بھی فکریں زائل کر دی تھیں اور وہ خود بھی احمد حسن اور زہرا کی سادگی کی قائل سی ہوگئی تھیں۔ اُن کے لیے بھی یہ اطمینان بخش بات تھی کہ اپنی کم حیثیتی کے باوجود اُن میں تہذیب و شائستگی بدرجہ اتم موجود تھی۔

☆......☆......☆

اروٰی کو بے شمار تحائف ملے تھے۔ سبھی گھر والوں نے تو اُسے گولڈ کے سیٹ ہی گفٹ کیے تھے۔ البتہ انعم نے اُسے اپنے ہی ہاتھ سے انگوٹھی اُتار کر پہنا دی تھی۔ حالانکہ حیثیت کے لحاظ سے وہ بھی اُسے کوئی بھاری تحفہ بھی دے سکتی تھی۔ مگر اروٰی سے دلی لگاؤ اور ذہنی وابستگی پیدا نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس تعلق کو سرد مہری سے نبھا رہی تھی۔

انعم نے اروٰی کو جس انگلی میں انگوٹھی پہنائی تھی اُس انگلی میں پہلے ہی اصم کی دی ہوئی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ انعم نے وہ انگوٹھی اُتار کر بیگ میں ڈالتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ بعد میں دے دے گی۔ اروٰی کچھ کہہ تو نہیں سکتی تھی، البتہ گھر آ کر اس نے نیلم کے ذریعے اپنی انگوٹھی منگوائی تو انعم خود اُس کے کمرے میں چلی آئی۔

''اروٰی بھابی آپ نے سمجھا ہوگا میں آپ کی انگوٹھی رکھ ہی نہ لوں...... آپ شاید جانتی نہیں کہ مجھے کسی کی استعمال شدہ چیز لینا پسند ہی نہیں ہے۔ اچھا ہوا آپ نے مانگ لی...... ورنہ میں تو ایسے ہی کہیں پھینک دیتی۔'' انعم کا لہجہ سپاٹ مگر تاثرات دل آزار تھے۔

''نہ...... نہیں...... وہ...... دراصل...... مجھے گفٹ دیا تھا...... اص......'' اروٰی کو کچھ غلط ہونے کا احساس شدت سے ہوا تھا۔ اصم ڈریسنگ روم میں تھا اور انعم اُس کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑ گئی تھی۔ یہ بات اُسے اندر ہی اندر کاٹ رہی تھی۔

''گفٹ......؟ اوہو ضرور پھر تو میکے سے ملا ہوگا یہ تحفہ...... پھر تو آپ کو بالکل بھی فکر مند نہیں ہونا چاہیے

تھا۔ آرٹیفیشل چیزیں ہم لوگ نہیں پہنتے۔ کم از کم صبح کا انتظار تو کر لیتیں...... آپ کی انگوٹھی میں آپ کو دے کر ہی جاتی۔'' انعم کا لہجہ مزید خراب ہو گیا تھا۔ اصم بھی اپنی شیروانی اُتار کر انعم کی آواز پر چلا آیا تھا۔

''کیا ہوا انعم...... تم...... بیٹھو نا۔'' اصم نے ایک نظر گم صم کھڑی اروی کو دیکھا انعم کے تاثرات تو ویسے ہی کچھ برہم تھے۔

''تھینک یو بھائی...... میں بس آپ کی بیگم کی یہ انگوٹھی واپس کرنے آئی تھی۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ اس کے بغیر انہیں نیند نہیں آئے گی۔'' انعم نے انگوٹھی اروی کو دینے کے بجائے بیڈ پر پھینکی۔ اصم نے فوراً معاملہ بھانپ لیا۔

''ظاہر ہے بھئی شوہر کا دیا پہلا تحفہ اگر پاس نہ ہو تو نیند کیسے آسکتی ہے۔'' انعم کا چہرا لمحہ بھر کو متغیر ہوا اور پھر وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔

''اوہ یہ آپ کا گفٹ ہے۔ رونمائی دی ہوگی آپ نے، بیوٹی فل رنگ...... تبھی اروی بھابی نے صبح کا انتظار بھی نہیں کیا اور مجھ سے اپنی رنگ مانگ لی۔ اوکے آپ لوگ اب ریسٹ کریں گڈ نائٹ بھائی۔'' انعم نے جاتے ہوئے بھائی کو ہی مخاطب کیا۔ اروی عجیب سی کیفیت میں کھڑی تھی۔

''کہاں گم ہو سویٹ ہارٹ۔'' اصم نے اُسے کندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔

''وہ...... اص...... صم...... رئیلی میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ اور انعم کو مس انڈرسٹینڈنگ ہوئی ہے میں......'' اروی سے ٹھیک طرح بات نہیں ہو رہی تھی۔

''آئی نو...... ڈونٹ وری اباؤٹ دیم۔'' اصم نے بیڈ سے انگوٹھی اٹھائی اور اُس کا ہاتھ تھام کر اُس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے مسکرا کر دیکھا۔

''پریشان نہیں ہو انعم کی غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔''

''تم مجھے بتاؤ تم نے اتنی جلدی ڈریس چینج کیوں کیا ہے۔ ابھی میں نے تمہیں جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔'' اصم کا محبت میں ڈوبا لہجہ اروی کو پل بھر میں گزشتہ فکروں سے آزاد کر گیا۔ شوہر کی محبت کے سامنے تو سو طوفان بھی ہیچ نظر آتے ہیں۔ اروی بھی اُسی کیفیت میں تھی۔

''میں دوبارہ پہن لیتی ہوں۔'' وہ اٹھنے لگی تو اصم نے اُسے اپنے پہلو میں کھینچا۔

''نہیں اب نہیں...... تم اس طرح بھی پیاری لگتی ہو۔'' اروی نے اُس کی شرارت سے گھبرا کر اُسی کے سینے میں چہرا چھپایا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے کیوں نہیں جا رہی ہو تم ہمارے ساتھ۔'' انعم جیسے ہی بی بی جان کے کمرے میں آئی انہوں نے اُس سے سنجیدگی سے استفسار کیا۔ سبھی لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر اروی کے میکے جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ شریح خان نے صرف گھر کے افراد لے جانے کا ہی پروگرام بنایا تھا۔

باقی سب تو بلا حیل وحجت جانے پر راضی تھے۔ بس انعم ہی نہیں جانا چاہتی تھی۔

''کیا کروں گی وہاں جا کر...... میرا دل نہیں چاہ رہا بی بی جان۔'' وہ سستی سے کہتی صوفے پر ٹک گئی۔ بی بی جان نے بغور اُسے دیکھا۔

''میں دیکھ رہی ہوں انعم...... تم اروی کے ساتھ ویسا برتاؤ نہیں کر رہی ہو جیسا تم ثمن اور سبرینہ کے ساتھ کرتی ہو۔ یاد رکھو وہ تمہارے بھائی کی بیوی ہے تم پر لازم ہے کہ تم اُسے بھی ویسی ہی عزت دو جس کی وہ حقدار ہے۔''
''بی بی جان میں نے انہیں کب عزت نہیں دی؟ بس مجھ سے نیلم کی طرح اُن کے آگے پیچھے نہیں پھرا جاتا۔''
''میں تمہیں آگے پیچھے پھرنے کے لیے نہیں کہہ رہی۔ مگر تم اُسے اگنور کر رہی ہو یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم اُس کے میکے نہ جا کر اُسے کیا احساس دلانا چاہتی ہو۔''
''بی بی جان میں......'' انعم بی بی جان کے صحیح اندازوں پر نہ صرف پریشان ہوئی بلکہ گڑبڑا بھی گئی۔
''آپ جانتی ہیں آج کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ ویسے بھی فائق وہاں جائیں گے تو آ کر مجھے ہی سو سو باتیں سنائیں گے۔ اس لیے میں بھی نہیں جا رہی تا کہ وہ بھی نہ جائیں۔'' آخر انعم نے دل کی بات کہہ ہی دی۔
''فائق کیوں باتیں سنائے گا؟ جب ہمیں اپنی بہو کے میکے والوں کی حیثیت و کلاس کا کوئی ملال نہیں ہے تو باقی سب کے لیے تو یہ بات غیر اہم ہونی چاہیے۔ بہر حال کوئی کچھ بھی کہے تم چل رہی ہو ہمارے ساتھ...... یہ تمہارے بھائی کی خوشی کا موقع ہے۔''
''بی بی جا...... ن۔'' انعم کی کشمکش بی بی جان سمجھ رہی تھیں۔
''انعم تم بچی نہیں ہو...... آج تم دوسروں کو یہ احساس دو گی تو کل دوسرے اس سے بھی کر تمہیں احساس دلائیں گے۔ انسان کو حیثیت سے نہیں اُس کے افکار و اطوار سے پہچاننا سیکھو جاؤ...... تیار ہو۔'' بی بی جان نے بات ختم کر دی۔ انعم بادل نخواستہ اُٹھ کر باہر آ گئی۔

☆......☆......☆

''ڈیئر بھابی...... آپ تیار ہیں؟ یا میں کچھ ہیلپ کروں۔'' نیلم بے دھڑک اُس کے کمرے میں چلی آئی۔
اروی تیار ہو چکی تھی۔ بس زیور پہن رہی تھی۔
''تھینک یو...... نیلم...... دیکھو اس سوٹ کے ساتھ بابا جان کا دیا سیٹ اچھا لگے گا نا۔'' اروی نے زمرد جڑا دیدہ زیب طلائی سیٹ نیلم کو دکھایا۔ اس وقت وہ گہرے سبز رنگ کے سوٹ میں ملبوس اپنی دلکشی میں منفرد نظر آ رہی تھی۔
''واؤ...... ایکسیلینٹ بھابی...... یہ تو آپ کے سوٹ کے ساتھ بالکل صحیح میچ کر رہا ہے۔ شادی کے بعد لڑکیوں کے کتنے عیش ہوتے ہیں۔ نئے کپڑے زبردست زیورات، کتنی اہمیت ملتی ہے ہر جگہ۔'' نیلم کی نگاہوں میں اروی کے لیے توصیف و ستائش تھی اور لہجے میں حسرتیں تھیں۔
جو ہر نوعمر لڑکی کی آنکھوں میں تب تک مچلتی رہتی ہیں جب تک اُس کی اپنی شادی نہیں ہو جاتی۔
''ہوں...... لیکن ان سب کے ساتھ بہت سی ذمہ داریاں بھی ملتی ہیں جنہیں نبھانا بہت ضروری ہوتا ہے۔'' اروی نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے ذرا سنجیدگی سے کچھ باور کرایا۔
''پھر بھی...... بھابی مزے کی لائف تو ہوتی ہے نا...... جہاں جی چاہے آؤ جاؤ گھومو پھرو۔'' نیلم بے تکلفی سے بولتی اُس کی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی کاسمیٹکس کی ترتیب چھیڑنے لگی۔ اروی کیا کہتی نیلم کی عمر ہی ایسی تھی خواب دیکھنے والی جبکہ وہ حقیقت کی تلخیاں جھیل کر خواب نگر میں آئی تھی۔

☆......☆......☆

''فائق...... کہاں ہیں آپ؟ سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔'' انعم اپنے کمرے میں تقریباً تیار کھڑی تھی۔ فائق

ولیمے کے بعد اپنے گھر چلا گیا تھا، جبکہ انعم کچھ دن کے لیے ٹھہر گئی تھی۔ فائق نے رات کہہ تو دیا تھا کہ وہ بھی ضرور چلے گا مگر اب انعم کے فون کرنے پر معذرت کر رہا تھا۔

''نہیں بھئی میں نہیں آ رہا...... آج میری، ایک ضروری میٹنگ ہے۔ تمہارے بھائی کے سسرال جانے کے لیے میں اپنے بزنس میں Loss تو نہیں کر سکتا۔'' فائق اکثر اپنے رویے سے اپنی فطری مفاد پرستی ظاہر کر دیتا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو انعم اُس سے اُلجھ پڑتی مگر یہاں معاملہ اروئی کے میکے جانے کا تھا۔ سو تائید اً بے دلی سے بولی۔

''بالکل ٹھیک بات ہے، چھٹی کا دن ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ بابا جان نے بھی کسی سے مشورہ نہیں لیا اور پروگرام بنالیا۔''

''تم تو جا رہی ہونا...... میری مجبوری بتا دینا بی بی جان کو۔''

''آ...... ہ...... میں بھی مجبوری میں جا رہی ہوں۔ سچ پوچھیں تو میرا بالکل دل نہیں چاہ...... رہا...... پتہ نہیں وہاں کیسی تیاری ہوگی۔''

''تو تم مت جاؤ...... کہو تو میں بی بی جان سے کہہ دیتا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں...... میں کوشش کر چکی ہوں۔ اچھا پھر میں واپس آ کر آپ کو کال کروں گی۔ ابھی مجھے تیار ہونا ہے۔'' وہ فون بند کر کے آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ابھی اُسے میک اپ کرنا تھا۔

☆......☆......☆

''احمد حسن...... اصولی طور پر تمہیں منیر احمد، زینت اور اُس کی بچیوں کو بھی آج دعوت دینی چاہیے تھی۔ آخر کو سگا چچا ہے وہ بھی...... کیا سوچے گا اور پھر اروئی کے سسرال والے کیا خیال کریں گے کہ تم خاندان برادری سے کٹے ہوئے ہو۔'' سکینہ پھوپو گھر میں ہوتے انتظامات دیکھ دیکھ پہلے تو دل مسوس کر بیٹھی رہیں آخر بول ہی پڑیں۔

وردہ اور زہرا تو گھر کی صفائی دھلائی میں لگی ہوئی تھیں، جبکہ نمرہ خالہ اور نرمین نے کھانے پکانے کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی تھی اور دونوں ہی ماہر تھیں۔ نمرہ خالہ تو سعودی عرب میں مقیم ہونے کے باعث اکثر اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہب فیملیز کی بڑی بڑی دعوتیں کرتی رہتی تھیں۔ سو اُن کی کوشش تھی کہ اروئی کے سسرال والوں کے معیار کے مطابق ہر ڈش بنائیں۔

وہ فروٹ ٹرائفل بنا کر کچن سے برآمدے کی طرف آئیں تو سکینہ پھوپو کی باتیں سن کر کھڑی ہوگئیں۔

''آپا آپ کا کہنا تو بالکل بجا ہے مگر دیکھیں۔ اروئی کے سسرال سے ہی دس بارہ لوگ تو آ رہے ہیں۔ یہاں دیکھیں اتنی گنجائش ہے کہ مزید آٹھ دس لوگ بھی سما سکیں۔ بیٹی کی عزت کی بات ہے۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔'' نمرہ خالہ اپنی کہہ کر فریج کی طرف بڑھ گئیں۔

''آپا...... آپ فکر نہ کریں، منیر اور زینت کو تو آنے کے لیے کہا ہے۔'' احمد حسن نے اُن کی تسلی کرنی چاہی۔

''زینت کہاں آئے گی بچیوں کے بغیر...... اب امیر رشتے داروں کے لیے، اپنے غریب بہن بھائیوں میں تفریق کرنا اچھی بات ہے۔'' سکینہ پھوپو کا موڈ کچھ بگڑا چلا تھا۔

''آپا ہم تفریق نہیں کر رہے۔ اپنے حالات سے مجبور ہیں۔ اتنے وسائل ہوتے تو کسی مناسب جگہ پر

دعوت دی جاتی۔ بیٹی کو سسرال میں کوئی کچھ کہے گا تو پھر آپ کو ہی تکلیف ہوگی۔ آخر آپ ہی بڑی ہیں ہماری...... بتائیں میں کیا کروں۔'' احمد حسن نے تحمل و آہستگی سے اپنی مجبوری بتائی سکینہ پھوپھی جیسے بھائی کی بات وقتی طور پر سمجھ گئی تھیں۔ ویسے بھی انہیں تو پوری اہمیت مل رہی تھی۔ اُن کے لیے یہی بہت تھا۔

زہیر محلے کے قریبی ہمسائیوں سے صوفے، میزیں اور کرسیاں وغیرہ لے کر آرہا تھا۔ ایک کمرے کا سامان چھت پر رکھنے کے بعد وہاں بھی لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش بنادی تھی اور وہیں سب کو کھانا سرو کرنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

زہرا اور نمرہ آخر انتظام سے مطمئن ہو کر ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں۔

''آپا...... شکر ہے سب کچھ بن گیا۔ بس ذرا احتیاط کرنا آپا سکینہ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہریں۔ خواہ مخواہ سب کو شرمندہ کریں گی۔''

''اُن کو کون روک سکتا ہے، بس میری دعا ہے کہ انہیں خود ہی عقل آجائے۔'' دونوں سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔ وردہ بھی اُن میں آکر شامل ہوئی۔

''ہاں امی مجھے بھی پھوپو کے بولنے سے ہی ڈر لگتا ہے۔ خیر میں بتانے آئی تھی۔ میں نرمین آپی کے ساتھ اُن کی طرف جارہی ہوں۔ وہیں سے تیار ہو کر آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ...... مگر جلدی آجانا...... وہ لوگ بھی آنے والے ہیں۔'' زہرا نے اپنے لیے کپڑے بستر سے اٹھائے اور کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

سبرینہ، شارم، ضیغم، ثمن ایک گاڑی میں روانہ ہوئے تھے جبکہ شریج خان اور زبدہ خان ڈرائیور کے ساتھ بہت سے تحائف کے ساتھ محوِ سفر تھے۔ نیلم، بچے اور اصم، اروئی الگ گاڑی میں سوار تھے۔ انعم پہلے تو اُن کے ساتھ بیٹھنا چاہتی تھی مگر پھر زبدہ یعنی بی بی جان نے کچھ سوچ کر اُسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔

''انعم...... تم ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ بچے اچھل کود کریں گے۔ تم پریشان ہوگی۔''

اروئی جو انعم کی موجودگی سے ذرا پریشان سی تھی۔ اُس کے جانے سے وہ بھی قدرے سکون سے اصم کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ پائی۔ سارے راستے بچے اور نیلم مستیاں کرتے شور مچاتے رہے۔ اصم ڈرائیونگ کے دوران وقفے وقفے سے ذومعنی نظروں سے چھیڑتا رہا۔ کبھی گانے لگا کر اُسے متوجہ کرتا۔ وہ شرم سے سرخ ہو جاتی۔

سب سے آگے اصم ہی کی گاڑی تھی کیونکہ اُسے راستہ معلوم تھا اور شریج خان کو...... وہ بھی مقررہ وقت پر وہاں پہنچے تھے۔ اُن کا استقبال احمد حسن نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کیا تھا۔ بی بی جان، پہلے ہی سب کو سمجھا کر لائی تھیں کہ وہ اپنے کسی عمل سے اپنی برتری نہ جتائے۔ اس کے باوجود انعم نے آتے ہی اپنی گھبراہٹ ظاہر کر دی تھی۔

''بھابی...... آپ کے گھر میں کوئی ہوادار کمرا ہے۔ جہاں میں تھوڑی دیر آرام کرسکوں۔ میں بہت تھک گئی ہوں اور یہاں مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔'' اُس کی مخاطب اروئی تھی اور وہ حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''دوسرا کمرہ......'' اروی کے لب تو ہلے تھے مگر آواز گلے میں ہی گھٹ گئی تھی۔ نمرہ خالہ نے فوراً ہی معاملہ سمجھ کر سنبھالا۔ وہ اروی سے ملنے کو بڑھی تھیں فوراً ہی انعم کو مخاطب کر کے بولیں۔

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں...... آئیں آپ بیٹا دوسرے کمرے میں چل کر آرام کرلیں۔'' سبھی نے اپنے اپنے انداز میں انعم کو روکنا چاہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ تو ہو گیا تھا کہ گھر میں اتنی وسعت و گنجائش نہیں ہے۔ نمرہ خالہ اُسے ساتھ والے کمرے میں لے آئیں۔

جہاں ایک پلنگ، چند کرسیاں، الماری، میز اور دیوار گیر آئینہ نسب تھا۔ ساری اشیائے طریقے اور قرینے سے ترتیب سے تھیں۔ انعم وہاں آ کر بھی تنقیدی نظروں سے ہر شے کو دیکھ رہی تھی۔ اُن کی سادہ سی ترتیب کو اُس نے بڑی نخوت سے سوچا تھا۔

''اونہہ...... اتنے سے گھر میں رہنے والی کو بابا اور بھائی اپنے محل میں لے آئے ہیں۔ اُس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ اتنا سب کچھ پالے گی۔''

''بیٹا یہ جوس پی لو...... آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔'' اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب نمرہ خالہ اُس کے لیے جوس کا گلاس لے آئی تھیں۔ اروی دوسرے کمرے میں قدرے پریشان سی سب میں گھری بیٹھی تھی۔ نرمین اور وردہ سب کو مشروب سرو کرنے کے بعد اروی کو اپنے ساتھ باہر آنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

''اروی آؤ نا...... تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بھی آ کر بیٹھو...... شام تک تو تمہیں پھر چلے جانا ہے۔'' نرمین بہت آہستگی سے کہہ رہی تھی۔ پھر بھی زبدہ خان نے سن لیا تھا۔ اروی کے چہرے پر کشمکش تھی کہ جائے یا نہ جائے۔

''جاؤ بیٹا...... بہنوں کے ساتھ کچھ وقت گزارو...... جاؤ نا......''

بی بی جان کے اصرار پر وہ جھجک کر اٹھی اور باہر آ گئی۔ ذہن مسلسل انعم میں اُلجھا ہوا تھا۔

''اروی تم تو شادی کے بعد بالکل بدل گئی ہو...... ہم تم سے ملنے کو کتنا بے چین تھے اور تم اپنے سسرال والوں کے ساتھ کس مزے سے بیٹھی تھیں۔'' صحن کی طرف کھینچتے ہوئے نرمین دانت بھینچے شکوہ کناں تھی۔ اروی کو پھر بھی کسی کے سن لینے کا احتمال تھا۔

''آہستہ بولو...... کوئی سن لے گا۔''

''کوئی سنتا ہے تو سن لے...... تمہاری شادی ہوئی ہے تم پر سے ہمارا حق تو نہیں ختم ہو گیا۔'' نرمین نے لاپروائی سے جتایا تو وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کس نے کہا ہے میں بس آ ہی رہی تھی۔''

''ہاں...... دل تو تمہیں چاہ رہا ہوگا 'اُن' کے پہلو سے اٹھنے کو بائی داوے جیجا جی کیسے لگے۔'' نرمین نے آنکھ دبا کر چھیڑا تو وہ جھینپ گئی۔

''شرم کرو......''

اروی نے پہلے اُسے گھورا پھر وردہ سے مخاطب ہوئی جو اُس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کیے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے ایسے کیوں گھور رہی ہو...... کیا میں بدل گئی ہوں۔''

''ہاں..... ناں۔'' وردہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''آپی..... آپ کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں۔ آپ کا جوڑا، آپ کا زیور، اصلی ہیں ناں۔'' وہ آخری بات سرگوشی میں بولی تو اروی نے بے اختیار اُسے دھپ لگائی۔ چہرے پر رنگ چھلکا تھا۔

''پاگل ہو بالکل..... جاؤ میرے لیے پانی لے کر آؤ۔ بہت پیاس لگی ہے۔''

''صاف کہیں یہاں سے غائب ہو جاؤں۔ آپ دونوں کو اصم بھائی کے بارے میں باتیں جو کرنا ہیں۔''

''تو تمہیں کوئی اعتراض ہے دادی اماں..... جاؤ بھی۔'' زرمین نے بھی اُسے مصنوعی سنجیدگی سے ٹالا۔ تو وہ منہ بنا کر کچن میں چلی گئی۔

''ہاں..... اب شروع ہو جاؤ..... جلدی سے بتاؤ، سب کیسے ہیں۔'' اُس کے جاتے ہی زرمین نے بے چینی سے پوچھا۔

''بہت..... بہت اچھے ہیں سبھی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ہمیں اللہ تعالیٰ اس طرح نوازے گا۔ اصم نے تو میری ساری بدگمانیاں دور کر دی ہیں۔ ورنہ.....'' اُس کی بات میں سچائی تھی اور آنکھوں میں تشکر آمیز نمی۔

زرمین متاثر ہو کر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ تبھی سمعیہ اور معوذ کمرے سے نکل کر اُن کے پاس آ گئے۔

''دلہن چچی..... پھوپو کہاں ہیں؟ انکل کا فون آیا ہے۔'' زرمین بچوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ سمیعہ کے ہاتھ میں انعم کا سیل فون اور پرس تھا۔ اروی فوراً کھڑی ہو گئی۔ نیلم بھی باہر آ گئی تھی۔ اروی انہیں لے کر کمرے میں چلی آئی۔

☆.....☆.....☆

سکینہ پھوپو شادی والے دن کا قصہ پھر چھیڑ کے بیٹھی تھیں۔ زہرا نے کئی بار مداخلت کر کے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ سکینہ پھوپو ہی کیا جو اپنی بات مکمل کیے بنا رہ جائیں۔

''بس جی! ہمیں تو لگا تھا ہماری بچی کے نصیب میں ساری عمر ہمارے گھر پر ہی بیٹھے رہنا لکھا ہے۔ سچی پوچھیں تو میری تو جان پر بن آئی تھی۔ لوگوں کی نظریں دیکھ کر تو میرا..... میرا مرنے کو دل چاہتا تھا۔ کچھ نہ پوچھیں جو ہماری اروی کی حالت تھی۔ بڑی مشکل سے سنبھالا ورنہ تو یہ خودکشی کر جاتی۔ وہ تو اللہ نے بھائی صاحب کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا اور.....''

وہ بول رہی تھیں جبکہ احمد حسن اور زہرا شرمندہ شرمندہ سے تھے اور باقی سب کو بھی کوفت ہو رہی تھی۔ سبرینہ کی بیزاری تو صاف ظاہر تھی۔

''بہن اللہ نے ہر کام کے لیے ایک وسیلہ ایک طریقہ بنا رکھا ہے۔ جو کام اللہ نے چاہا ہے وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ ہم سب تو اُسی کی رضا میں راضی ہیں۔ دعا کریں کہ یہ رشتے یہ تعلق پائیدار و مستحکم رہیں۔'' زبدہ خان نے بڑی رسانیت سے بات کو ختم کیا۔

زہرا اور احمد حسن نے 'آمین' کہہ کر تائید کی۔ سکینہ کچھ کہنا چاہتی تھیں تبھی احمد حسن نے انہیں مخاطب کیا۔

''آپا ذرا بچیوں سے کہیے کھانا لگا دیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی سکینہ پھوپو مسکرا کر اٹھیں۔ زہرا بھی معذرت کر کے اُن کے ساتھ ساتھ ہی باہر آ گئیں۔

☆.....☆.....☆

انعم جو کمرے میں تنہا بیٹھی پچھتا رہی تھی کہ وہ یہاں آئی کیوں۔ اروی کو دیکھتے ہی بولی۔
''اروی بھابی آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ آپ اتنے چھوٹے گھر میں رہتی ہیں۔ مجھے پہلے پتہ ہوتا تو میں بالکل نہ آتی۔'' وہ اُس سے ایسے ناراض ہو رہی تھی۔ جیسے وہ اُسے دھوکے سے یہاں لائی ہو۔ اروی کے چہرے کا رنگ فوراً بدل گیا۔ شرمندگی و خجالت نے اُس کا رہا سہا اعتماد بھی چھین لیا تھا۔
''وہ دراصل......'' اروی سے بولا نہیں گیا۔ اُس پر سمعیہ کی معصوم سی فرمائش اُسے مزید گنگ کر گئی۔
''دلہن چچی آپ کے گھر میں لان نہیں ہے، ہم وہاں کھیلتے؟'' انعم کے چہرے اور آنکھوں میں تمسخر سا امڈ آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی تبھی اُس کے سیل فون پر رنگ ٹون بجنے لگی۔ انعم نے سمعیہ کے ہاتھ سے فوراً اپنا سیل فون جھپٹا۔
''ہیلو! فائق...... ہاں ون منٹ۔'' فون کان سے لگا کر اُس نے پہلے اروی کو دیکھا پھر کچھ بے مروتی و بیزاری سے مخاطب ہوئی۔
''اب کیا مجھے کہنا پڑے گا کہ مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔ اتنی Sense تو ہونی چاہیے انسان کو۔ فائق کی کال ہے اور۔'' اروی کو اپنی ذلت کا سچ مچ احساس ہوا تھا۔ انعم مسلسل اُسے نظر انداز کرنے کے علاوہ اُسے اُس کی کم مائیگی کا احساس بھی دلا رہی تھی۔ اروی پلٹی تو اُسے اپنے قدم اٹھانے مشکل ہو رہے تھے۔
بھی کے رویے بہتر تھے سوائے انم کے...... انعم اُس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ کچھ بجھی بجھی سی سب کے درمیان ہو کر بھی نہیں تھی۔ اور یہ بات نمرہ اور نرمین نے نوٹ بھی کی تھی۔ مگر اروی سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پُر تکلف کھانے کے بعد چائے پی کر شرخ خان نے جانے کی اجازت مانگی تو احمد حسن اور زہرا نے بھی گھر والوں کو جوڑے مٹھائی اور بچوں کو پیسے دیے تو زبدہ خان نے انہیں منع کیا۔
''زہرا...... یہ تو دنیاوی رسمیں ہیں۔ انہیں ہم لوگوں کو ہی بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ بھی کا خلوص و اپنائیت اصل معنی رکھتے ہیں ان سب کی ضرورت نہیں۔''
''بھابی جان! یہ تو آپ کا ظرف ہے جو آپ اس طرح سوچتی ہیں بہر حال ہم یہ رسماً نہیں دل کی خوشی سے دے رہے ہیں۔ آپ انکار مت کیجیے۔ اتنا تو ہمیں حق دیں کہ ہم اپنی چاہت ظاہر کر سکیں۔'' زہرا نے بھی بڑے سبھاؤ سے انہیں تحائف لینے پر مجبور کیا تھا۔ بے شک اُن کے دیے کپڑوں کے جوڑے اروی کے سسرال کے شایانِ شان نہیں تھے۔ پھر بھی کچھ دنیاداری تو نبھ ہی گئی تھی۔
زہرا اور نمرہ کو خدشہ تھا کہ کہیں اروی کو اُن کی وجہ سے سسرال میں یہ طعنہ یا بات سننے کو نہ ملے کہ وہ بیٹی کے سسرالیوں کو تحفتاً بھی کچھ نہ دے سکے۔ انعم اور سبرینہ نے ایک دوسرے کو بڑی معنی خیزی سے دیکھا تھا۔
اروی اپنے گھر والوں سے آبدیدہ ہو کر مل رہی تھی۔ نمرہ خالہ اور زہرا آہستہ آہستہ اُسے حوصلہ دیتے ہوئے نصیحتیں بھی کر رہی تھیں۔ نرمین اور وردہ کا دل مچل رہا تھا۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اُسے روک لیتیں۔
''پھر کب آئیں گی آپی......'' آخر وردہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
''اب آپ اپنی آپی سے خود ملنے آجایئے گا۔'' اصم نے خوشدلی سے دعوت دی تھی۔ زبدہ خان نے بھی اُسی کی تائید کر کے کہا۔
''ہاں...... ہاں...... اب تو آپ لوگوں کو آنا چاہیے۔ بلکہ ایسا کریں اگلے ہفتے آپ لوگ ہمارے گھر

آ جائیں۔ اسی بہانے اروی سے بھی مل لیجیے گا۔''
''جی ضرور آئیں گے مگر آنے سے پہلے ہم بتا دیں گے۔'' زہرا نے تقریباً ٹالتے ہوئے کہا تھا۔
بھی آخر رخصت ہو گئے تھے۔ واپسی پر بچے دادا دادی کے ساتھ جانے کی ضد میں تھے۔ انعم، نیلم کے ساتھ اصم کی گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ انعم کی موجودگی نے اروی کو بالکل خاموش کر دیا تھا۔
''اصم بھائی! اپنی شادی کے حوالے سے تو آپ کی ساری پلاننگ فیل ہو گئی نا...... آپ تو کہتے تھے نا کہ آپ نے شہر سے باہر شادی نہیں کرنی چاہیے۔ بیوی کو میکے جا کر رہنے کا بہانہ مل جاتا ہے اور میاں بے چارا لانے لے جانے میں ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ اب آپ کی تو ڈیوٹی شروع ہو گئی۔ آپ کیا کریں گے۔''
انعم نے مذاق مذاق میں اصم کی کہی بات میں اُسے گھیرنے کے ساتھ جیسے اروی کو بھی سنایا تھا۔ اصم نے اُس کے مذاق کو مذاق ہی سمجھا تھا۔
''اللہ کے آگے ہماری پلاننگ کہاں چلتی ہے۔ اب اللہ نے جو ڈیوٹی لگائی ہے، دینی تو پڑے گی۔'' اصم نے ہنس کر جواب دیتے ہوئے اروی کو بھی دیکھا تھا۔
''مگر اروی بھابی کا میکے جا کر رہنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔'' نیلم نے بھی مداخلت کرتے ہوئے اروی کی ترجمانی کی۔
''اچھا! تمہیں کیسے پتہ؟''
انعم کے تیور بتا رہے تھے اُسے نیلم کی مداخلت اچھی نہیں لگی۔
''میری اُن سے بات ہوئی ہے۔ اس ٹاپک پر...... بھابی کو لڑکیوں کا بات بات پر میکے جانے کے بہانے ڈھونڈنا پسند نہیں ہے۔'' نیلم نے پھر سے اِس کی ترجمانی کی۔
''یہ تو بہت غیر فطری سوچ ہے۔ شادی کے بعد ہی تو اپنے میکے سے محبت کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ہر لڑکی یہی چاہتی ہے کہ وہ اپنے میکے بار بار جائے۔ اروی بھابی یقیناً دل سے نہیں کہہ رہی ہوں گی۔ ہے ناں۔'' انعم نے اپنی رائے کا برملا اظہار کیا۔
''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں انعم مگر یہ بات میں نے دل سے کہی تھی۔ شادی کے بعد میکے کی محبت اپنی جگہ اپنے گھر سے وابستہ ذمہ داری کو سمجھنا زیادہ اہم ہوتا ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانا ہر دوسرے دن ممکن نہیں ہو سکتا...... تو۔'' اروی نے خاصی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
''ارے میں نے تو ایسے ہی بات کی تھی۔ آپ کو شاید برا لگ گیا۔'' انعم بھی سنجیدہ ہو کر بولی تو اصم نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔
''افوہ...... ابھی یہ ٹاپک رہنے دیں۔ جب آنے جانے کی بات ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال انعم تمہارا کچھ کھانے پینے کا موڈ ہے تو بتاؤ...... راستے میں ایک ریسٹورنٹ ہے۔'' اصم کو معلوم تھا انعم آج کل وقت بے وقت کھانے پینے کی عادی تھی۔
''ہا...... ں...... جوس وغیرہ پی لیں گے۔'' انعم نے بھی سوچا کہ فضول باتیں کرنے سے بہتر ہے کہیں بیٹھ کر وہ کچھ کھا پی لے۔
پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہی اصم نے گاڑی موٹر وے کے ایک ریسٹورنٹ کی طرف پارک کی تو کچھ

فاصلے پر آتی ضیغم اور شارم کی گاڑی میں بیٹھی دونوں خواتین نے خاصی حیرت کا اظہار کیا۔
''ارے...... یہ اب یہاں کیوں رُک گئے؟ کھاپی کے تو نکلے تھے وہاں سے؟'' سبرینہ کو خاصی دلچسپی تھی۔
''سبھی نے تو کھایا تھا مگر ارویٰ نے تو بس چکھا ہی تھا۔ شاید اصم اُسی کی وجہ سے رُکا ہے۔ آخر نئی نویلی دلہن ہے اتنا تو خیال کرے گا ہی۔'' ثمن بھابی کا لہجہ سرسری تھا۔
''آپ لوگوں کو یہاں رُکنا ہے تو بتائیں۔'' ڈرائیو کرتے شارم نے پیچھے بیٹھی ثمن بھابی کو مخاطب کیا۔
''نہیں...... نہیں...... تم ڈرائیو کرو...... بابا جان کی گاڑی آگے بڑھ چکی ہے۔ ہم بھی یہاں رُکے تو انہیں پریشانی ہوگی۔ اصم بھی زیادہ دیر نہیں رُکے گا آجائے گا۔'' ثمن بھابی نے فوراً ہی رائے دے کر سبرینہ کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔
''اصم کو بھی رُکنا نہیں چاہیے تھا۔ انعم اور ارویٰ نے جیولری پہن رکھی ہے۔ حالات کتنے خراب ہیں کب کیا ہوجائے کچھ پتہ ہے۔'' کچھ توقف کے بعد سبرینہ نے پھر سے نقطہ اٹھایا تو ثمن نے اُسے قدرے حیرت سے دیکھا۔ سب کے سامنے ہی تو اروی کی خالہ نے اروی کو جیولری اُتار کر بیگ میں رکھنے کے لیے کہا تھا اور اروی نے فوراً تعمیل کی تھی۔ بلکہ اُس نے وہ بیگ بی بی جان کو دے دیا تھا۔
''اروی نے تو جیولری اُتار کر بی بی جان کو دے دی تھی۔ البتہ انعم نے چوڑیاں وغیرہ پہن رکھی ہیں۔ فکر نہ کرو اللہ نگہبان ہے۔'' ثمن نے جتائے بغیر اُس کی بات کا جواب دیا۔ پھر ضیغم نے ہی موضوع بدل کر اُن کی توجہ اصم کی طرف سے ہٹادی۔
انعم کو صرف اصم ہی کا اروی کو توجہ دینا نہیں کھل رہا تھا۔ وہ تو نیلم کو بھی کئی بار ٹوک چکی تھی۔
اصم نے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر تینوں کے لیے فریش جوس کے ساتھ سینڈوچز بھی آرڈر کیے تھے۔
اروی فطری جھجک کی وجہ سے کھا نہیں رہی تھی۔ جبکہ اصم نے ایک دوبار کہا تھا اور نیلم مسلسل اصرار کررہی تھی۔
''بھابی آپ نے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ایک سینڈوچ تو لے لیں۔ یا کچھ اور پسند ہے تو بتادیں۔'' نیلم نے پھر سے اصرار کیا تو اروی معذرت کرنے لگی۔
''سوری...... بس...... مجھے اتنی ہی بھوک تھی۔ میں نے جوس لیا تو ہے۔'' اصم کی نگاہ اُس پر تھی تبھی وہ کھا نہیں پارہی تھی۔
''آپ کے سلم اسمارٹ ہونے کا شاید یہی راز ہے کم کھانا...... ہے ناں۔''
''نیلی...... تم بھی بس ایک ہی بات کے پیچھے پڑ جاتی ہو۔ جلدی سے ختم کرو۔ گھر بھی چلنا ہے یا نہیں۔''
تینوں کو سمجھ نہیں آئی کہ انعم کا موڈ کس بات پر خراب ہوگیا ہے۔ وہ اپنی پلیٹ خالی کرکے اُٹھ گئی تھی۔
اصم کچھ کہے بغیر بل ادا کرکے گاڑی کی طرف آگیا۔ اس وقت وہ صرف اروی کا قرب محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ جذبوں کی لہر پر محبت، نیا گیت گنگنانا چاہتا تھا۔ مگر بہنوں کی وجہ سے خود پر پابندی لگائے وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا سبھی کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''شکر ہے ہر کام سلیقے سے ہوگیا۔ مجھے تو ڈر تھا، اروی کے سسرالیوں کو کچھ پسند نہ آیا تو کتنی شرمندگی ہوگی۔ بہرحال سبھی خوش گئے ہیں۔'' زہرا اور نمرہ سارا سامان سمیٹ کر بیٹھی تھیں۔ وردہ صفائی کے بعد کمروں کی سیٹنگ

دوبارہ پہلے جیسی کر رہی تھی۔ سکینہ پھوپھی صحن میں چارپائی پر نیم دراز چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ فوراً اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولیں۔

''سب کا تو پتہ نہیں اُس لڑکی کا...... کیا نام ہے...... وہ میرا خیال ہے اروی کی بڑی نند لگتی ہے۔'' وہ ذہن پر زور دے رہی تھیں۔ نمرہ نے اُن کی مشکل آسان کی۔

''انعم...... کی بات کر رہی ہیں۔''

''ہا...... ں...... ہاں اسی کی...... بڑا نخرہ ہے اُس کا...... مجھے تو گھمنڈی سی لگ رہی ہے۔''

اُن کے تجربے پر نمرہ دل سے قائل ہونے کے باوجود تردید کرنے لگیں۔

''نہیں نہیں...... اروی کے بھی سسرال والے، بے لوث اور رکھ رکھاؤ والے ہیں۔ اور انعم جس حال میں ہے ان دنوں میں اکتاہٹ بیزاری تو ہو ہی جاتی ہے۔''

''اے بس رہنے دو...... تمہارا تجربہ مجھ سے زیادہ تو نہیں ہو سکتا...... میری بات لکھ کے رکھ لو۔ وہ لڑکی اپنی اروی کو چین نہیں لینے دے گی۔ اپنی حیثیت کا بڑا غرور ہے اُس لڑکی کو۔''

سکینہ پھوپو کے کڑوے لہجے میں جو حقیقت چھپی ہوئی تھی۔ وہ زہرا کا دل ہولا گئی۔

''بس رہنے دیں آپا...... ایسی باتیں کر کے اپنا اور ہمارا دل پریشان نہ کریں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ انعم شادی شدہ ہے وہ کون سا اُس کے گھر میں رہے گی۔'' زہرا نے اپنے ساتھ انہیں بھی تسلی دی۔

''آپا...... آپ کو اروی پر بھروسہ ہے نا۔ وہ ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لے گی۔ مجھے تو بھی بہت سادہ اور رکھ رکھاؤ والے لگے ہیں۔ فضول سوچوں میں نہ پڑیں اور بس بچیوں کے لیے دعا کرتی رہا کریں اللہ انہیں اپنے گھروں کے سکھ اور آسانیاں نصیب کرے۔'' نمرہ کے تسلی آمیز رویے پر زہرا نے دل سے 'آمین' کہا۔

سکینہ پھوپو کے ماتھے کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ انہوں نے پلیٹ میں مگ پٹخ کر رکھا اور اُٹھ گئیں۔

''زہیر کہاں رہ گیا، مجھے ذرا ڈاکٹر کے پاس لے چلتا۔ صبح سے سر درد سے پھٹا جا رہا ہے کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''سارے محلے میں مٹھائی بانٹنے میں وقت تو لگتا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔ آپ چادر لے لیں۔'' زہرا نے چاہ کر بھی مزید کچھ نہیں کہا۔ البتہ نمرہ سوچ رہی تھی سارے لوازمات سے اچھی طرح انصاف کرنے کے بعد پلیٹ بھر مٹھائی چائے کے ساتھ لے کر بیٹھی تھیں اور پھر بھی کہہ رہی تھیں ''کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' نمرہ اور زہرا بھی اُٹھ گئیں۔

☆......☆......☆

بی بی جان نے انہیں آرام کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ باقی سب بھی اپنے اپنے کمروں میں فی الحال چینج کر کے آرام ہی کر رہے تھے۔ بی بی جان بھی لباس بدل کر چہرے پر تفکر لیے گہری سوچ میں بیٹھی تھیں۔ شریح خان نے اپنے کمرے میں آرام دہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہیں پکارا۔

''زبدہ...... کیا سوچ رہی ہیں۔''

''یہی کہ...... اصم کی دلہن کے میکے کا طرزِ زندگی ہم سے خاصا مختلف ہے۔ یہاں اُسے خاصی دشواری ہوگی۔'' زبدہ خان نے ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی سوچ ظاہر کی تو شریح خان کے چہرے پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔

''آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ ماشاء اللہ اروٰی پڑھی لکھی سمجھدار بچی ہے۔ جلد ہی یہاں ایڈجسٹ ہو جائے گی۔''

''اللہ کرے...... بہر حال میں ثمن سے کہوں گی اُسے آہستہ آہستہ گھر کے طور طریقے بتائے۔ گھر کے افراد کے بارے میں بھی آگاہی دے۔''

''بہتر ہوگا یہ کام تم خود کرو یا پھر اصم پر چھوڑ دو۔ وہ ضرور اُس کی رہنمائی کر رہا ہوگا۔''

''چلیں ٹھیک ہے...... جیسا آپ کہیں...... میں عشاء کی نماز پڑھنے جا رہی ہوں...... بعد میں کھانا کھائیں گے یا صرف دودھ پئیں گے۔'' زبدہ خان نے بھی ذہن سے سوچیں جھٹک کر پوچھا۔ تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولے۔

''نہیں...... کھانا تو اب نہیں کھایا جائے گا، البتہ دودھ سے پہلے چائے بھجوا دیں۔ پھر میں بھی نماز ادا کروں گا۔ جماعت تو نکل گئی ہے۔'' شریح خان نے بھی اپنا ارادہ بتا کر سائیڈ ٹیبل سے اپنا چشمہ اور تاریخی کتاب اٹھالی۔ رات کو مطالعہ کرنا اُن کی عادت تھی۔

☆......☆......☆

اروٰی فریش ہونے کے بعد سادے سے ہلکے جامنی سوٹ میں باہر آئی تو اصم پہلے سے ہی فریش ہو کر سفید شلوار کرتے میں ملبوس بیڈ پر نیم دراز ٹی وی پر اسپورٹس چینل لگائے بیٹھا تھا۔

''تمہیں کرکٹ پسند ہے۔'' اصم نے اُسے مخاطب کر کے متوجہ کیا۔

''دیکھنے کی حد تک۔'' نارمل انداز میں بات کرتی وہ سائیڈ چیئر پر بیٹھ گئی۔ اصم نے ٹی وی اسکرین سے نگاہ ہٹا کر اُسے دیکھا۔ وہ شام سے ہی سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''ہوں...... ظاہر ہے لڑکیاں دیکھنے کی حد تک ہی شوق رکھتی ہیں۔ اینی وے اور کیا کیا 'ہوبیز' ہیں تمہاری۔'' اصم نے اُسے اُس کے موڈ سے باہر لانے کی کوشش کی۔

''کتابیں پڑھنا، کپڑوں کی ڈیزائنگ اور تھوڑی بہت کوکنگ بھی کر لیتی ہوں۔ اصل میں ابھی فائنل امتحان دیے ہی تھے تو ابو نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ورنہ میں چاہتی تھی کچھ کوکنگ کورسز کر لوں مگر......''

''تو اب کر لینا...... اس میں کیا پرابلم ہے۔ ثمن بھابی تو کوکنگ ایکسپرٹ ہیں تم اُن سے کافی کچھ سیکھ سکتی ہو۔''

You Know کچن دونوں بھابیاں ہی سنبھالتی ہیں۔ اب تم بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاؤ گی۔ مشکل تو نہیں لگے گا؟'' اصم نے اُسے اپنے پاس آ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ جیسے بندھی ہوئی سی اُس کے پاس جا بیٹھی۔

''مشکل کیسی...... مجھے تو خود بھی سیکھنے کا شوق ہے اور میں چاہتی ہوں آپ کی پسند کے کھانے بنانا جلد از جلد سیکھ جاؤں، مجھے نیلم نے بتایا تھا آپ کو اٹالین اور چائنیز کھانے بہت پسند ہیں۔''

''ہا...... ں پسند تو ہیں مگر کبھی کبھی...... مجھ سے زیادہ تم بی بی جان اور بابا جان کا خیال رکھنا۔ اُن کے اپنے کچھ اصول ہیں اور ہم سبھی اُن کے پابند ہیں۔ پلیز انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دینا۔''

''میری پوری کوشش ہوگی...... بس آپ مجھے سبھی کے بارے میں بتاتے رہیے گا۔ کہ کس کو کیا پسند ہے کیا نہیں...... میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔'' وہ سر جھکائے بڑی سادگی سے کہہ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کی

ملامت و معصومیت نے اصم کو شرارت پر اُکسایا۔
اور اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤں؟ کہ مجھے کیا پسند ہے کیا نہیں۔'' وہ ذرا اس کے قریب ہوا۔
وہ اس کے قرب کی حدت سے ذرا سا کسمسائی ضرور تھی مگر اُسے فاصلہ نہیں بڑھا سکی تھی۔ شرم سے گلگوں چہرے کو مزید جھکا کر پوچھنے لگی۔
''آ...... آپ کو...... کیا کیا؟ پسند ہے۔'' لہجے میں جاننے کا شوق بھی تھا۔
''مجھے...... مجھے تو ذرا الٹرا ماڈل لڑکیاں پسند ہیں۔ جو جینز ٹاپ، میکسی پہنتی ہوں۔ ہیر اسٹائلز بدلواتی ہوں۔ شارپ میک اپ کر کے پارٹیز میں ڈانس کرتی ہوں، بہت بولڈ ہوں...... اور۔''
اصم نے بولتے بولتے اُس کے لمبے بالوں کو کیچر سے آزاد کیا۔
''کیا؟'' وہ ایکدم چونک کر بولی۔
''آپ کو ایسی لڑ...... کیا...... ں پسند ہیں؟ مگر میں تو ایسی نہیں بن سکتی۔''
''تمہیں کون کہہ رہا ہے ایسی بن جاؤ۔ میں تو اپنی پسند بتا رہا ہوں۔'' اصم نے مصنوعی سنجیدگی سے اُس کی حیران آنکھوں میں دیکھا۔
''پھر تو آ...... پ کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ میں آپ کی پسند کے بالکل اُلٹ ہوں۔ میں تو ویسی بن بھی نہیں سکتی۔ آپ کو چاہیے تھا۔ آپ بابا جان سے انکار کر دیتے۔'' اُسے واقعی افسوس ہوا تھا۔ آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔
''اچھا! میں انکار کر دیتا تو تمہارا کیا ہوتا؟''
''میرے مقدر میں جو لکھا تھا وہی ہونا تھا رہ جاتی ابو کے گھر میں ساری زندگی...... یا پھر......'' وہ روہانسی ہوگئی۔
''تو میں تمہارے مقدر میں ہی تو لکھا تھا۔ اسٹوپڈ مذاق بھی نہیں سمجھتی ہو...... مجھے تمہاری جیسی ہی شریک حیات چاہیے تھی۔ تمہیں کیا لگتا ہے میری پسند کی ہوئی الٹرا ماڈرن کو بابا جان یا بی بی جان ایکسیپٹ کر لیتے...... ہرگز نہیں۔ انہیں بھی تم جیسی ہی بہو چاہیے تھی۔'' اصم نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔
''یہ مذاق تھا؟ دل جلانے والا...... میں تو۔'' وہ روہانسی ہوئی۔
''پلیز تمہاری ان ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ ہاں البتہ ان میں حیرانی بہت اچھی لگتی ہے۔''
اسی لیے تو......'' اصم کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ دروازے پر دستک دے کر انعم اندر بڑھی چلی آئی۔ دونوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اصم اروی کے ساتھ نیم دراز تھا اور وہ کھلے بالوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ایکدم کھڑی ہوگئی۔ انعم نے دونوں کو مزید شرمندہ کیا۔
''اصم بھائی دروازہ تو لاک کر لیتے۔ مجھے بھی یاد نہیں رہا کہ آپ شادی شدہ ہو چکے ہیں۔ اب عادت ہو ہی جائے گی۔ میں بس آپ سے ملنے آئی تھی۔ فائق لینے آگئے ہیں۔ میں پھر ایک دو دن میں آؤں گی۔'' انعم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اس دوران اروی دوپٹہ اوڑھ چکی تھی۔
''اوکے...... تم چلو...... میں آتا ہوں فائق سے ملنے۔''
اصم بھی کچھ خجل سا تھا۔ انعم اروی کو ایک بار پھر نظر انداز کر کے چلی گئی۔ اصم جانے کے لیے کھڑا ہوا تو اروی

نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔
''میں بھی چلوں؟'' اصم نے سلیپر پہنتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔
''نہیں...... ابھی تم یہیں رہو، Mean اتنا ضروری نہیں ہے۔'' اصم کہہ کر کمرے سے نکل آیا۔ جبکہ اروی پھر سے انعم کے رویے کو سوچنے لگی۔ پتہ نہیں اُس کی عادت ہی ایسی تھی یا پھر وہ صرف اُسی کو اپنے رویے سے زچ کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات اروی سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆......☆......☆

فائق لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ بی بی جان، ثمن بھابی بھی موجود تھیں۔ سبرینہ اور انعم کچن سے نکل کر آئی تھیں اور اصم کوریڈور سے لاؤنج میں 'السلام علیکم!' کہتا فائق کی طرف بڑھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے 'وعلیکم السلام!' کہہ کر فائق نے اُسے معنی خیزی سے چھیڑا۔
''میں نے انعم کو منع بھی کیا تھا کہ تمہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ تم بھابی کے ساتھ آرام کر رہے ہوگے۔'' اصم نے اُسے سنجیدگی سے دیکھا۔
''کچھ دیر پہلے ہی ہم لوگ آئے تھے۔ ابھی تو چینج ہی کیا تھا۔ آپ دونوں اتنی جلدی جا رہے ہیں؟ انعم کا تو رُکنے کا پروگرام تھا۔''
اصم نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تو انعم بھی سامنے آگئی۔
''پروگرام بدل گیا ہے میں پھر آؤں گی ایک دو دن میں۔''
''نہیں اگر مزید تم رہنا چاہ رہی ہو تو رہ جاؤ۔'' فائق نے فوراً انعم کو اجازت دے دی، بی بی جان کو لگا تھا فائق کو انعم کا انداز اچھا نہیں لگا۔
فائق کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ فوراً مصلحت آمیزی سے بولیں۔
''بیٹا یہ تو خود گھر جانے کو بے چین ہے۔ ہم نے ہی روک لیا تھا۔ بار بار آنا جانا مناسب نہیں تھا۔''
''جی...... میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں ابھی رہ لے جتنا دل چاہتا ہے۔ بار بار آنا جانا مناسب نہیں۔'' وہ واقعی سنجیدہ تھا۔ انعم کا ہر دوسرے دن ضد کر کے یہاں آنا اُسے گراں گزرتا تھا۔
''میں بار بار کب آتی ہوں...... کتنے دنوں بعد تو رہی ہوں یہاں وہ بھی اصم بھائی کی شادی کی وجہ سے...... ٹھیک ہے اب چلیں۔''
فائق نے اُسے قدرے خفگی سے دیکھا تو وہ بے دلی سے جانے پر تیار ہوئی۔ ورنہ وہ فائق کو فون پر آنے کے لیے منع کر چکی تھی۔
''فائق کم از کم کھانا تو کھا کر جاؤ۔ میں ٹیبل لگواتی ہوں۔'' ثمن بھابی نے اُسے روکنا چاہا۔
''سوری بھابی...... ابھی بھوک نہیں ہے۔ ویسے بھی امی، ابو کھانے پر انتظار کریں گے۔ پینتالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہی گھر پہنچیں گے ہم...... انشاء اللہ پھر سہی۔'' فائق نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔
وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر کی طرف بڑھا۔ انعم بڑبڑاتی ہوئی بھابیوں کی طرف بڑھی۔
''اونہہ...... دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے امی ابو کے انتظار کا خیال نہیں ہوتا۔'' بی بی جان نے

اُسے تھپتھپاتے ہوئے دھیمے لہجے میں سمجھایا۔
''شوہر کا موڈ دیکھ کر بات کیا کر...... حجت مت کیا کرو۔'' جواباً اُس نے سر جھٹک کر گویا اُن کی نصیحت کو بھی جھٹکا...... اصم فائق کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا۔

☆......☆......☆

''بی بی جان...... کھانا تیار ہے۔ آپ کہیں تو کھانا لگوادوں؟'' ثمن انعم کے جانے کے بعد پوچھ رہی تھی۔ بی بی جان بھی اپنی نشست سے اُٹھ گئی تھیں۔
''تم سب کھالو...... تمہارے بابا جان اور میں نہیں کھائیں گے۔ ہمارے کمرے میں بس دودھ بھجوا دینا۔ چائے تو بھجوادی تھی ناں؟'' ثمن نے بھی اُن کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا تو سبرینہ نے بھی مداخلت کی۔
''بھابی بچے تو سونے چلے گئے ہیں اصم سے بھی پوچھ لیں وہ بھی ابھی کھائیں گے یا نہیں میرا مطلب ہے وہ راستے میں رُکے تو تھے کھانے پینے، پتہ نہیں اب بھوک ہو یا۔'' مقصد تھا بی بی جان کو سنانا...... حالانکہ نیلم نے آ کر بتادیا تھا کہ وہ راستے میں جوس پینے رُکے تھے۔
''پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھانے کے لیے بلالو...... جتنی بھوک ہوگی آ کر کھالیں گے۔ اور ہاں شادو سے کہنا اروی کے گھر سے آئی مٹھائی فروٹ وغیرہ صبح ہوتے ہی گھر کے علاوہ قریبی گھروں کے ملازمین میں بانٹ دے۔ اللہ کی نعمتیں ہیں، خراب ہو کر نہیں جانی چاہیے۔
بی بی جان کا اپنا مطمع نظر تھا جو کہ ایک لحاظ سے درست بھی تھا۔ وہ رشتے داروں اور عزیز واقارب میں چیزیں وغیرہ بانٹنے سے گریزاں رہتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا متوسط طبقے کے لوگوں کو (جو سامان ضروریہ لینے سے قاصر رہتے ہیں) اپنی خوشیوں میں شامل رکھنا اور اپنی میسر نعمتوں میں سے اُن کے لیے حصہ نکالنا ہی اللہ کی شکر گزاری ہے۔
''جی...... میں کہہ دوں گی۔'' ثمن نے سعادت مندی سے جواب دیا۔
بی بی جان مطمئن ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ جبکہ سبرینہ اور ثمن کچن میں کھانا میز پر لگانے لگیں۔ برتن دھوتی شمو کو انہوں نے اصم اور اروی کو بلانے بھیج دیا۔

☆......☆......☆

اروی اور اصم کھانے کے بعد کمرے میں آئے تو اصم نے اروی کی خاموش کو محسوس کر کے قدرے تشویس سے پوچھا۔
''کیا بات ہے اروی...... تم شام سے ہی کچھ اُداس ہو۔ کیا اپنے پیرنٹس اور بہن بھائی کے لیے اُداس ہو۔'' اروی جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ایکدم چونک کر دیکھنے لگی۔ وہ اُس کی خاموشی کو توٹ کر رہا تھا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا۔
''نہیں...... میں اُداس تو نہیں...... ہو......ں اور اُن سب سے تو مل کر آ رہی ہوں۔ آپ کو کیوں محسوس ہوا کہ میں اُداس ہوں۔'' وہ اپنے تاثرات بدلتے ہوئے دھیمے انداز میں بولتی مسکرائی تھی۔
''تم زیادہ باتیں تو پہلے بھی نہیں کرتی ہو...... مگر شام سے چند باتوں کے علاوہ تم نے کوئی بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ سبرینہ بھابی کی چھیڑ چھاڑ پر تم نے سوائے مسکرانے کے کچھ نہیں کیا۔'' اصم نے اُسے وضاحت دی تو

وہ مزید سنبھل کر بیٹھ گئی۔
''میں اُن سے کیا کہتی ...... مجھے تو اُن کی باتیں سن کر ہی شرم آ رہی تھی۔ اور پھر میرا کوئی جواب انہیں برا لگ جاتا تو......'' وہ معصومیت سے بولتی اصم کو مزید پیاری لگی۔
''نہیں لگتا برا...... وہ مذاق کر رہی تھیں۔ تمہارے جواب کو بھی مذاق سمجھتیں۔'' اصم نے اُس کا ہاتھ تھام کر حوصلہ دیا تو وہ کھل کر اپنے احساسات بتانے لگی۔
مجھے ڈر لگتا ہے میری کوئی بات کسی کو بھی بری لگے۔ میں ایسا نہیں چاہتی ویسے بھی ابھی گھر کے تمام افراد کے مزاج کو سمجھنے کے مرحلے طے کرنا ہیں۔ شروع میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی تو اُسے ذہن و دل سے نکالنے میں ساری زندگی لگ جائے گی۔'' اصم اُس کی سمجھداری پر متاثر سا نظر آیا۔
''ہوں ...... شاید تم ٹھیک سوچ رہی ہو...... او کے تم جیسے مناسب سمجھتی ہو۔ اُسی طرح بات کرو...... مجھے ٹرسٹ ہے کہ تم جلد ہی سب کو سمجھ جاؤ گی۔ اور پھر تمہارا ڈر بھی ختم ہو جائے گا۔'' اصم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہاتھ ہلکے سے دبایا تو وہ ممنونیت سے بولی۔
''آپ کے بھروسے کا شکریہ۔''
اصم اُس کی آنکھوں میں چمکتی نمی پر اُسے مصنوعی خفگی سے دیکھ کر بولا۔
''میں نے کیا کہا تھا تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں اچھے لگتے...... یاد رکھنا...... او کے......'' اروی نے سر ہلایا۔ یہ محبت یہ چاہت اُس کے مقدر میں رقم تھی۔ قسمت سے سارے گلے دور ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

اروی فجر کی نماز کے بعد نیچے کچن میں چلی آئی تھی۔ شادو پہلے سے کچن میں موجود تھی۔ اُس نے رات ہی اصم سے بی بی جان اور بابا جان کے معمولات کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں اور اُس نے بتایا تھا کہ وہ فجر کے بعد چائے اپنے کمرے میں پینے کے عادی ہیں۔
''ارے چھوٹی دلہن آپ کیوں اٹھ گئیں میرا مطلب ہے چائے چاہیے تھی تو گھنٹی بجا دیتیں۔''
''نہیں میں صبح چائے پینے کی عادی نہیں ہوں...... البتہ آج سے میں سب کے لیے چائے بنا دیا کروں گی۔ آپ بس مجھے بتا دیں، چائے کا سامان کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے چینی، پتی، دودھ وغیرہ۔'' اروی نے بڑھ کر سامنے سے پین اٹھایا اور سینک سے پانی لے کر برنر جلایا۔
شادو نے اُسے بے بسی سے دیکھا۔
''چھوٹی دلہن، بی بی جی ناراض نہ ہوں...... چار دن تو ہوئے ہیں آپ کے ویاہ کو۔''
''نہیں ناراض ہوں گی۔ آپ بتا دیں کس کیبنیٹ میں ہے سامان۔'' وہ ایکدم مڑی تو شادو ہڑبڑا کر کچن کیبنیٹ سے ڈبے نکالنے لگی اُسی اثناء میں ثمن بھابی چلی آئیں۔
''ارے تم...... صبح اتنی جلدی...... بھوک لگی ہے ہمارے دیور کو۔'' ثمن بھابی نے شریر نظروں سے دیکھا تو وہ قدرے جھینپ کر بولی۔
''وہ تو سو رہے ہیں...... میں جاگ رہی تھی تو سوچا بھی کے لیے چائے بنا دوں...... آپ سب بھی صبح کو چائے پیتے ہیں ناں۔'' وہ اندازے سے رکھے گئے چائے کے پانی میں پتی ڈالنے لگی۔

''بھابی جان پلیز مجھے بتادیں کون کون چائے میں چینی نہیں لیتا۔'' وہ جس اپنائیت سے چائے بنا رہی تھی ثمن اُسے ٹوک ہی نہیں سکی۔
''شوگر تو سبھی لیتے ہیں سوائے بابا جان کے،اس لیے ساتھ شوگر پاٹ رکھ دیتے ہیں......اور دیکھو۔''
ثمن بھابی نے دو ٹریز کپ پرچ اور شوگر پاٹ رکھتے ہوئے اُسے متوجہ کیا۔
''آج تو تم کچن میں آ گئی ہو......کل سے ہرگز نہیں آؤ گی۔'' اروی نے یکدم چونک کر نا سمجھی سے دیکھا تو وہ اُس کی حیرت پر ہنس دیں۔
''بھئی ہمارے ہاں پہلے دلہن سے کھیر پکوائی جاتی ہے چائے نہیں۔''
''تو آج ہی پکوالیں مجھ سے کھیر...... مجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جاتا۔'' وہ چائے چینک میں ڈالتے ہوئے بے چینی بھی ظاہر کرگئی۔
''یہ فیصلہ بی بی جان کریں گی۔ ویسے تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ پہلے اصم کے ساتھ گھوم پھر تو لو...... پھر تو ساری زندگی یہی کام کرنے ہیں۔ کوئی پروگرام بنایا ہے؟'' اُس کے استفسار پر پہلے اُس نے نفی میں سر ہلایا پھر بولی۔
''کیسا پروگرام؟ مجھے تو گھومنے پھرنے کا شوق بھی نہیں ہے۔''
''اچھا......ہنی مون تو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ ہاں لیکن تمہارے ہاں تو ایسا کوئی رواج ہی نہیں ہوگا ناں۔'' سبرینہ نے اندر آتے ہی مداخلت کی تھی۔ اروی نے قدرے حیرت سے اُس کی بات سنی تھی۔ جبکہ ثمن نے سبرینہ کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے جلدی سے کہا۔
''اروی اب چائے تم نے بنالی ہے تو میرا خیال ہے بی بی جان اور بابا جان کے لیے تم ہی لے جاؤ۔''
ثمن بھابی نے ٹرے میں کپ چینک وغیرہ رکھ کر اُس کی طرف بڑھائی اروی ٹرے تھام کر خندہ پیشانی سے کچن سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جاتے ہی ثمن بھابی نے سبرینہ کو سرزنش کی۔
''رینا...... اروی سے اس طرح بات مت کیا کرو۔ بابا جان کی بات یاد ہے ناں......انہوں نے کیا کہا تھا۔''
''افوہ......میں تو مذاق کررہی تھی۔ وہ بھی تو بڑی معصوم بن کر ری ایکٹ کرتی ہے۔ جیسے دنیا کی اُسے خبر نہیں۔''
''معصوم تو وہ بہرحال ہے آج کل کی لڑکیوں والی تیزی طراری نہیں ہے۔ پھر بھی تم ذرا خیال رکھنا۔ کسی دن تمہارا انداق اُسے ہرٹ کرسکتا ہے۔'' جواباً سبرینہ خاموشی سے اپنے لیے کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ جس بات پر وہ عمل نہ کرنا چاہتی ہو وہ خاموش ہوکر اپنی لاپروائی جتا جاتی تھی۔ ثمن بھی خاموش ہوکر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

اروی دونوں کے کمرے میں چائے لے کر پہنچی تو بی بی جان جہاں حیران تھیں اندر ہی اندر خوش بھی تھیں۔ شادی کے چوتھے دن وہ گھر کے معمولات سے آگاہ ہوگئی تھی۔ یہی بات باعث اطمینان بھی تھی۔
''بیٹا......تم کیوں صبح صبح اٹھ گئیں۔ شادو لے آتی۔ یہ اُسی کی ڈیوٹی ہے۔'' بی بی جان نے دوبارہ اپنی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نشست پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی تسبیح سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ اس کے سلام کے جواب کے بعد انہوں نے بڑی نرمی سے ٹوکا تو وہ بھی ہولے سے مسکرا دی۔

''بی بی جان آپ کی خدمت شادو کا نہیں ہمارا فرض ہے۔ میں صبح جلدی اٹھنے کی عادی ہوں۔ آئندہ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لایا کروں گی۔ پلیز آپ مجھے منع مت کیجیے گا۔'' اروی نے چائے کا پہلا کپ بابا جان کے قریب لے جا کر رکھا۔ جو کاؤچ پر بیٹھے اپنے معمولات پڑھنے میں مشغول تھے۔

انہوں نے اُسے محبت سے دیکھ کر کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہماری بیٹی کو صبح سویرے اٹھنے کی عادت ہے۔ کوشش کرو وہ نالائق بھی تمہاری عادت اپنا لے۔ بھئی زبدہ اگر ہماری بیٹی کی یہی خوشی ہے تو اسے اس کی خوشی سے محروم مت کرنا۔ اسی بہانے ہم صبح صبح اپنی بیٹی کی ہاتھ کی چائے پی لیا کریں گے۔'' شریح خان نے پہلے اروی کو مخاطب کیا پھر زبدہ خان کو سمجھایا۔

''ٹھیک ہے جیسے اُس کی خوشی، میں تو چاہتی تھی پہلے رسم کرلیں کھیر پکوائی کی۔''

''بھئی یہ رسم تو آپ ضرور کرلیں۔ چائے کا ذائقہ بتا رہا ہے یہ بچی کھانا بھی اچھا ہی بنائے گی۔'' شریح خان نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر خوشدلی سے اُس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اروی کا چہرا کھل اٹھا تھا۔ گھر کے بڑوں کے دل میں جگہ بنانے کا پہلا قدم کامیاب ہوا تھا۔ وہ اسی لیے بے حد خوش تھی۔

☆......☆......☆

ناشتے کے بعد مرد حضرات اور بچے آفس اور اسکول کے لیے جا چکے تھے۔ بی بی جان اپنے معمول کے مطابق ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں ستانے چلی جاتی تھیں۔ جبکہ ثمن اور سبرینہ دوپہر اور رات کا مینیو بنا کر شادو اور شمو کو سبزی وغیرہ بنانے کی ہدایت دے کر خود کام والی دو ماسیوں سے گھر اور اپنے اپنے کمروں کی صفائیاں کروانے کے بعد کچھ دیر اپنے کمروں میں گزارتی تھیں۔ اس دوران وہ اپنے گھر والوں سے فون پر بات بھی کر لیتی تھیں یا ٹی وی پر اپنا کوئی پسندیدہ پروگرام دیکھتی تھیں۔ بارہ بجے کچن میں لنچ کی تیاری کے لیے آتی تھیں۔

اروی کو بھی اس معمول کا پتہ لگ گیا تھا۔ سو وہ بھی کمرے کی ترتیب کو پہلے کی طرح کرنے کے بعد اپنے گھر فون کر رہی تھی۔ اصم نے اُسے نیا سیل فون گفٹ کیا تھا۔ سو اب اُسے بات کرنے میں آسانی تھی۔

زہیر آج کل سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لیے وہ گھر پر ہی ہوتا تھا۔ اروی نے بھائی کے سیل فون پر کال کی تو وہ اُسے مذاق میں چھیڑنے لگا۔

''پتہ لگ گیا ہے کہ تم اب امیر بندی ہوگئی ہو۔ اس لیے نمبر بدل بدل کر کال کرتی ہو۔'' چھت سے اُتر کر آتے ہوئے زہیر نے صحن میں سبزی بناتی زہرا کو بھی متوجہ کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے بھائی...... پہلے اصم کے فون پر سے کال کرتی تھی۔ اب یہ میرا ذاتی موبائل اور نمبر ہے۔ اب میں اسی سے کیا کروں گی۔ آپ بتائیں سب ٹھیک ہیں؟ آپ کی تیاری کیسی جا رہی ہے۔'' دوسری طرف اروی بیڈ کے سرے پر ٹکتے ہوئے بڑے اعتماد سے بات کر رہی تھی۔

(اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ دسمبر میں ملاحظہ فرمائیں)

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

اللہ کریم ہے

اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ بہت پسند ہیں جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔

ثمرہ۔ کراچی

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

تم سچائی کو لازم پکڑو اور ہمیشہ سچ بولو کیونکہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے۔

نبیلہ۔ U.K

محرم الحرام

سرور کائنات ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ماہ محرم الحرام بہت ہی بابرکت مہینہ اور شب عاشورہ نیز یوم عاشورہ کی عبادت کے بے حد فضائل ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا محرم کا چاند دیکھ کر چار مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنا بہت افضل ہے۔

سلمیٰ۔ بحرین

دانائی

ایک عرب شخص کا کہنا تھا کہ مجھے زندگی میں کسی نے لاجواب نہیں کیا سوائے ایک باندی کے جس نے ایک تھال اُٹھا رکھا تھا۔ تھال کپڑے سے ڈھکا تھا میں نے پوچھا۔

’’تھال میں کیا ہے؟‘‘ وہ بولی۔

’’اگر بتانا ہوتا تو پھر ڈھانپنے کی کیا ضرورت تھی۔‘‘ پس اس نے مجھے شرمندہ کر ڈالا یہ ایک دن کا حکیمانہ قول نہیں بلکہ ساری زندگی کے لیے دانائی کی بات ہے کوئی بھی چیز جو چھپی ہو اس کے انکشاف کی کوشش مت کرو۔

راحیلہ۔ لاہور

عجیب دنیا

جہاں عورتیں دوسری عورتوں کی شکایت کرتے نہیں تھکتیں اور مرد دوسری عورتوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔

محمد کاشف۔ گجرات

وجہ تسمیہ

بیوی نے شوہر سے کہا: ’’آپ تو بالکل بھی رومانٹک نہیں ہیں راحیلہ کا شوہر اسے میرا چاند کہہ کر بلاتا ہے۔‘‘ شوہر نے جل کر جواب دیا۔

’’وہ ماہر فلکیات ہے اور میں ماہر حیوانیات۔‘‘

جنید احمد۔ پنڈی

عورت کا کیا کام جنت میں

عورت تو دنیا میں بھی اولاد کے دوزخ میں جلتی ہے وہاں بھی اولاد کی قسمت سے بندھ جائے گی۔ جو کسی کے 7 بیٹے ہوئے اور چھ جنت میں گئے اور ایک دوزخ میں تو ماں کو جنت میں تلاش مت کرنا۔ وہ اپنے اس بچے کے ساتھ جہنم میں ملے گی۔

رمشا خان۔ کراچی

ہائے یہ معصومیت

بچے نے ماں سے کہا۔
''امی جیسے بادشاہ نے کہانی میں 3 شادیاں کی تھیں میں بھی کروں گا ایک کھانا پکائے گی ایک گانا گائے گی ایک مجھے نہلائے گی۔''
ماں:''اور بیٹے تمہیں ایک بیوی سلائے گی نا؟''
بیٹا:''نہیں امی میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی سوؤں گا آپ مجھے سلائیں گی۔'' ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بولی۔''جیتے رہو میرے بچے۔''
ماں:''اچھا یہ تو بتاؤ تم میرے ساتھ سوؤ گے تو ان تینوں کے ساتھ کون سوئے گا؟''
بیٹا:''امی وہ تینوں پاپا کے ساتھ سوئیں گی۔'' یہ سن کر باپ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بولا۔''جیتے رہو میرے بچے۔''

رضوانہ گل۔پشاور

زندگی کیا ہے؟

زندگی آئینہ کی مانند ہے۔
اگر آپ اس میں دیکھ کر ہنسیں گے تو یہ بھی آپ کو ہنستی کھلکھلاتی ہی ملے گی۔

ATM

ایک دن ایک ادھیڑ عمر شخص جم میں داخل ہوا اور ٹرینر سے کہا۔
''میں لڑکیوں کو مرعوب کرنا چاہتا ہوں کون سی مشین استعمال کروں۔''
ٹرینر نے مسکرا کر جواب دیا۔
''وہ مشین جم کے باہر ہے اور وہ ہے ATM مشین۔''

کامران شفقت۔کوئٹہ

ڈس لے

آدھی رات کو شوہر کی آنکھ کھلی، کیا دیکھا ایک ناگن بیوی کے پیروں کے پاس پھن پھیلائے بیٹھی ہے۔
وہ فرط جذبات میں آ کر بولا۔''ڈس لے ڈس لے۔''
ناگن غصے سے پھنکاری اور بولی۔
''ابے میں تو چرن چھونے آئی ہوں یہ تو گرو ہے میری۔''

غزالہ رشید۔کراچی

دعا

یا اللہ مجھے اتنا وسیع رزق عطا فرما کہ میں تیری مخلوق کا محتاج نہ رہوں۔آمین یارب العالمین۔

شعر

ہمدردیاں ، خلوص ، دلاسے ، تسلیاں
دل ٹوٹنے کے بعد تماشے بہت ہوئے

افشاں چوہدری۔U.K

کامیابیاں

آج اپنا بلڈ ٹیسٹ کروایا تو A آیا
بس کیا بتاؤں کبھی غرور نہیں کیا
کامیابی تو ہماری رگ رگ میں دوڑ رہی ہے

زین شمسی۔کراچی

لیکن

انسان ساری زندگی 3 چیزوں کے لیے محنت کرتا ہے۔
اپنے نام کو اونچا رکھنے کے لیے۔
اپنے لباس کو منفرد رکھنے کے لیے۔
اور اپنے مکان کو سب سے خوبصورت رکھنے کے لیے۔
مگر دم نکلتے ہی سب سے پہلے یہ تینوں چیزیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔
نام کی جگہ......مرحوم
لباس کی جگہ......کفن
اور گھر بدل کر......قبر میں، پتہ نہیں انسان پھر کیوں غرور کرتا ہے۔

بصرہ۔ناروے

حیرت انگیز

قرآن پاک میں زندگی کا ذکر 145 بار اور موت کا ذکر بھی 145 بار آیا ہے۔

فرشتوں کا ذکر 88 بار اور شیطان کا ذکر بھی 88 بار، دنیا اور آخرت دونوں کا ذکر 115 بار، ابلیس کا ذکر اور اس سے پناہ کا ذکر 11 بار، مصیبت کا ذکر 75 بار اور شکر کا ذکر بھی 75 بار آیا ہے۔

پروین شروانی۔ کراچی

سبق

ماں، باپ، استاد اور کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن سبق وہی یاد رہتا ہے جو وقت اور لوگ سکھاتے ہیں۔

غزالہ۔ بحرین

کھیل ختم

شطرنج میں وزیر اور
زندگی میں ضمیر اگر مر جائیں تو سمجھو کھیل ختم

درگزر

درگزر کرنے سے ماضی تو نہیں بدلتا مگر مستقبل ضرور خوشگوار ہو جاتا ہے۔

منزہ سہام۔ کراچی

مولانا رومی فرماتے ہیں

انسانیت محبت کا مرکز اور محبت انسانیت کی معراج ہے اگر میرا علم مجھے انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا تو ایک جاہل مجھ سے ہزار درجے بہتر ہے۔

طارق علی۔ حیدر آباد

بیمار شوہر

شوہر: ''مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔''

بیوی: ''حیرت سے وہ کیوں؟''

شوہر: ''روز صبح مرغے کی طرح اٹھ جاتا ہوں پھر گھوڑے کی طرح بھاگ کر آفس جاتا ہوں وہاں سارا دن گدھے کی طرح کام کرتا ہوں۔ گھر آکر تمہارے سامنے طوطے کی طرح 'ہاں جی ہاں جی' کرتا ہوں۔ بکرے کی طرح کھانے میں سبزی ملتی ہے۔ بلی کی طرح بچے سنبھالتا ہوں اور پھر رات کو بھینس کے ساتھ سو جاتا ہوں۔ میرے اندر کون سی انسانوں والی بات ہے۔

سعدیہ سیٹھی۔ U.K

معافی

بہت سے لوگوں نے میری زندگی کو بہت سی آزمائشوں سے دوچار کیا لیکن اُن کے گزر جانے کے بعد میں نے انہیں معاف کر دیا۔ آزمائشیں تو امتحان تھیں آئیں اور گزر گئیں۔ مگر سزا اور جزا امر ہے۔ وہ نہیں ٹلتیں اور یہ سوچ کر کہ کسی کو میری وجہ سے نہ ختم ہونے والے عذاب سے گزرنا پڑے گا میری روح کانپ جاتی ہے کیونکہ معافی مجھے بھی بہت سے لوگوں سے چاہیے۔ معاف کر دیں تاکہ معاف کیے جا سکیں۔

کنول کرن۔ فیصل آباد

دس محرم

دس محرم کے دن ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ ہر توبہ شرف قبولیت پاتی ہے۔

کیونکہ اس دن حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی تھی۔
حضرت موسیٰ کی دعا قبول ہوئی تھی۔
حضرت عیسیٰؑ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔
حضرت یونس مچھلی کے پیٹ سے نکالے گئے تھے۔
حضرت محمد ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تھا۔
حضرت نوحؑ کی کشتی طوفان سے نکلی تھی۔
حضرت ابراہیمؑ آتش نمرود سے باہر نکالے گئے۔
حضرت ایوبؑ کو بیماری سے نجات ملی تھی۔
اور قیامت بھی اسی دن آئے گی۔

بینا طارق۔ اٹک

مرزا غالب

غدر کے دنوں میں ایک روز کچھ گورے باوجود پہرے کے مرزا غالب کے گھر میں گھس آئے اور انہیں پکڑ کر اپنے آفیسر کرنل براؤن کے سامنے پیش کر دیا۔ مرزا کی وضع دیکھ کر کرنل نے پوچھا۔
''تم مسلمان ہو؟'' مرزا نے کہا۔
''آدھا......'' کرنل نے حیران ہو کر پوچھا۔
''کیا مطلب؟'' مرزا بولے۔
''شراب پیتا ہوں مگر سؤر نہیں کھاتا۔'' یہ سن کر کرنل ہنس پڑا اور رہا کر دیا۔

سجاد۔ پتوکی

قطعہ

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

کشور خان۔ قلات

بڑے لوگ

مولانا جلال الدین رومی ایک دن شمس تبریزی کے ساتھ بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ دروازہ بند تھا ان کی بیگم نے جھری سے جھانک رہی تھیں کہ اچانک دیوار میں شگاف ہوا اور چند لوگ اندر داخل ہوئے اور انہوں نے پھولوں کے گلدستے رومی کے قدموں میں رکھ دیے۔ فجر کی اذانوں تک مجلس جاری رہی پھر اسی طرح دیوار میں شگاف ہوا اور وہ لوگ چلے گئے وہ پھول رومی نے اپنی بیگم کو یہ کہہ کر دیے کہ یہ وہ تمہارے لیے لائے تھے۔ جلال الدین رومی کے انتقال کے بعد 19 سال بعد اُن کی بیگم کا انتقال ہوا اور جب تک وہ حیات رہیں وہ پھول بھی اسی طرح تازہ اور خوشبودار رہے جیسے پہلے دن تھے۔ آنکھوں کی ہر قسم کی تکلیف میں وہ اُن پھولوں کی ایک پنکھڑی سے شفا مل جاتی تھی اور ہر قسم کا زخم ٹھیک ہو جاتا تھا۔

عذرا احمد۔ U.K

اقوال قائداعظم

اگر مسلمانوں کو اپنے عزائم اور مقاصد میں ناکامی ہوگی تو مسلمانوں کی ہی دغا بازی کے باعث ہوگی (سندھ مسلم لیگ کانفرنس 1938ء)
علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے جائیے اور علم حاصل کیجیے (1943ء)
ہم جتنی تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنی ہی زیادہ خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت سے ابھریں گے۔ جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے (1943ء)

فرزانہ شیخ۔ سیالکوٹ

کامیاب لوگ

اگر انسان خوشگوار زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے تو اُسے لوگوں اور چیزوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنی نظریں اپنے مقصد پر رکھنی چاہئیں۔ (البرٹ آئن سٹائن)

رمیز عابد۔ کراچی

خون دوڑ رہا ہے

ایک میمن نے عربی کو خون دے کر اُس کی جان بچائی۔ عربی نے مرسیڈیز تحفے میں دے دی۔
عربی کو پھر خون کی ضرورت پڑی۔ میمن نے پھر خون دیا۔ اب کی بار عربی نے تل والے لڈو تحفے میں دیے۔ میمن چیخ پڑا۔
''مرسیڈیز کیوں نہیں دی؟''
عربی: ''منا اب ہمارے اندر بھی میمنوں کا خون دوڑ رہا ہے۔''

فلک ظہیر۔ ملتان

نئے لہجے' نئی آوازیں

کچھ بھی نہیں

درد سے تڑپتے اشکوں کا صلہ کچھ بھی نہیں
دل میں جلتی یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ غلط کہ بچھڑ کے نہ جی پائیں گے
وہ چلا گیا اور مجھے ہوا کچھ بھی نہیں
التفات کی بارشوں کو سدا ہی ترسے
من بنجر کے سامنے صحرا کچھ بھی نہیں
دعاؤں کے حرف نڈھال تھے نڈھال ہی رہے
آسمان و زمین تیرے' میرا کچھ بھی نہیں
ٹھنڈے موسموں میں سلگتے رہے ہیں خواب
سب مقدر کا لکھا' تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں
یہ کس نے دی پھر سے درِ دل پر دستک
جل چکے خواب سارے اب تو بچا کچھ بھی نہیں
کس امید پہ دیکھتے پلٹ کر اُس کی جانب
جب اُس کے دل میں میرے واسطے رہا کچھ بھی نہیں
شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

زندگی کے بھید

کوئی نہ جانے کوئی نہ سمجھے
کیسے گزاریں ہم زندگی
زیست کی راہیں عجب تر ہیں
ملیں ہر راہ پر ہم کو سبق
کون ہے دوست' کون ہے دشمن
کون بھلا یہ سمجھے ہے
زیست کا رستہ بہت کٹھن ہے
ہر کوئی کب یہ سمجھے ہے
ختم سفر کب کون کرے گا
کس کا پتا آج کٹے گا
کوئی نہ جانے کوئی نہ سمجھے
شاعرہ: ماریا یاسر۔ کراچی

اچھا لگتا ہے

تم سے گفتگو کرنا مجھ کو اچھا لگتا ہے
سنگ تیرے ہر لمحہ مجھ کو اچھا لگتا ہے
ہو بھلا رقیبوں کا جو تمہارا کہتے ہیں
نسبتوں کا پانا یہ مجھ کو اچھا لگتا ہے
وصلِ یار کی گھڑیاں چند لمحوں کی ہوتی ہیں
سوچنا تمہیں دن بھر مجھ کو اچھا لگتا ہے
آسماں سے کیا کہنا تم سے کیوں ملایا ہے
اُس کو شکریہ کہنا...... مجھ کو اچھا لگتا ہے
تم رہو جہاں پر بھی فاصلے بھی کیا جانیں
تم نظر میں رہتے ہو، مجھ کو اچھا لگتا ہے
ساعتِ وصل میں بھی ایک حجاب مانع ہے
جلنا اپنے جذبوں پہ مجھ کو اچھا لگتا ہے
شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

محبت

محبت زندگی میری ، محبت تشنگی میری
محبت میری چاہت ہے ، محبت پیاس ہے میری
محبت روگ جیون کا ، محبت سوگ جیون کا
محبت اشک آنکھوں کا ، محبت سوز جیون کا
محبت کی یہ چاہ ایسی' محبت کی تپش ایسی
جہانوں کو جو پگھلا دے' محبت کی طلب ایسی
محبت حسن آنکھوں کا' محبت حسن باتوں کا
محبت چاند کھویا سا' محبت حسن راتوں کا

محبت ہم سفر میری، محبت ہم قدم میری
محبت میری منزل ہے، محبت راہ ہے میری
شاعرہ: عائشہ شفقت۔ ساہیوال

سرفہرست ہے جو

روح گھائل نفس تنہا اب مرنا کیسا
خود بن تن و تنہا اب جینا کیسا
نفسا نفسی کا سماں سنگریزی کا عالم
بدل گئے عقائد تو پھر مکرنا کیسا
گفتگو میں تضاد رنگوں کی پرتیں
چہرے کھوگئے جب تو بدلنا کیسا
میرا وجود خاکستر کرکے تکبر سے کہتے ہیں
نہ آگ لگی نہ دھواں اٹھا جلنا کیسا
نفرتوں کے باب میں سر فہرست ہے جو
وہ میرا اپنا ہے اس سے مکرنا کیسا
منزلوں کی راہ میں وہ سوگیا میں کھوگئی
وہ بے بس، غم زدہ اب لڑنا کیسا
شاعرہ: نگین افضل وڑائچ۔ شادیوال۔ گجرات

انتظار کی حد

ذکر تیرا ہی یار ہوجائے
تُو بھی خوشیوں سے ہم کنار ہوجائے
جیون میں کبھی نہ آئے تیرے خزاں
بس یونہی جشنِ بہار ہوجائے
کتنا روئی ہوں اے جاں تیرے بنا
آنکھ تیری بھی اشکبار ہوجائے
جب سے تُو نے لوٹا ہے
کاش تُو بھی بے قرار ہوجائے
چاند تو چھپ گیا ہے بدلی میں
جگنوؤں کا انتظار ہوجائے
انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے
اب تو بس تیرا دیدار ہوجائے
شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی۔ لاہور

دورِ ظلمت

رات میں نے اک خواب دیکھا ہے
کیسے بتاؤں کہ اک عذاب دیکھا ہے
زخموں سے چُور بدن غریبوں کے
ظلم کو ایسے بے نقاب دیکھا ہے
آبرو ہوئی نیلام سرِ بازار
بنتِ حوا کی ردا کو تار تار دیکھا ہے
دندناتے پھرتے ہیں بے خوفی سے قاتل
یوں ظلمت کا راج دیکھا ہے
جھوٹ کو ہے فوقیت سچ پہ کرن
وقت کی کتاب میں یہ باب دیکھا ہے
شاعرہ: کرن شبیر۔ کراچی

حساب چکانا ہے

اے زندگی اک بات تو بتا
تجھے مجھ سے چاہیے ہے کیا
نہ میں تجھ سے، نہ تُو مجھ سے ہے آشنا
تو پھر کیوں ہے ایسا کہ......
جیسے کوئی حساب ہو پرانا
جو مجھ کو ہے چکانا
یاد کرنے سے بھی، یاد نہیں پڑتا
تجھے مجھ سے گلہ ہے کیا
جو یوں خاک اڑاتی ہے تُو میری
جیسے کوئی حساب ہو پرانا
جو مجھ کو ہے چکانا
شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ شادیوال۔ گجرات

م ش خ

قارئین گرامی حقیقی کامیابی بہت تگ و دو کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ ARY ڈیجیٹل کے پروگرام دیکھنے والوں کے ہم مشکور ہیں کہ وہ ہماری ہمیشہ اچھے پروگراموں کے حوالے سے حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ARY ڈیجیٹل، زندگی، دی میوزک، کیو ٹی وی، نک اور HBO کے پروگراموں نے جو منفرد مقام لے رکھا ہے اُس کے لیے ہم مشکور ہیں کہ وہ ہماری تحریریں پروگراموں کے حوالے سے پڑھ کر ہمارے پروگراموں کو دیکھنے کے بعد ہماری ہمت افزائی کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ARY ایک معیاری چینل ثابت ہوا ہے اگر ناظرین ہمارے حوصلے بلند کرتے رہے تو ہم اسی طرح کامیابیاں حاصل کرتے رہیں گے۔

آیئے قارئین اب چلتے ہیں پروگراموں کی طرف مغل ایک روشن خیال لڑکی ہے اُس کا باپ نہیں ہے وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے اس کی ماں ایک پڑھی لکھی عورت ہے اور اپنے شوہر کے کاروبار کو خوبصورتی سے سنبھال رکھا ہے اور اس کے علاوہ وہ ایک سوشل عورت بھی ہے۔ جو عورتوں کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہے جبکہ مغل ایک الگ مزاج کی لڑکی ہے وہ ایک فوٹو جرنلسٹ ہے وہ اپنے پیشے میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہے وہ ایک انگریزی میگزین سے وابستہ ہے اُس میگزین کی مالک کا لڑکا باہر سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہے علی کو بھی فوٹو گافی کا بہت شوق ہے مگر اُسے پاکستان کے بارے میں معلومت نہیں ہیں مگر مغل اُسے اپنی تصاویر کے حوالے سے پاکستان

ARY ڈیجیٹل کی سیریل
'تم میری ہو' میں سارہ خان

ARY ڈیجیٹل کی سیریل
'قربت' میں سینتا مارشل اور زاہد احمد

کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہے اُدھر مغل کی ماں ان دونوں کی دلچسپی دیکھ رہی ہے مگر کچھ کہتی نہیں ہے مغل اور علی کے بڑھتے ہوئے تعلقات کہاں ختم ہوتے ہیں اس کا جواب تو ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'خدا میرا بھی ہے' دیکھنے کے بعد ہی ملے گا اسے تحریر کیا ہے اسما نبیل نے جبکہ ہدایت شاہد شفاعت کی ہیں یہ سیریل ARY ڈیجیٹل سے ہر ہفتے کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے۔ جبکہ اس کے فنکاروں میں عائشہ خان، ہرا ترین' سعید جبران' عمران اشرف' مریم سلیم' صبا حمید' ارسازل' محمود اسلم' عدنان شاہ ٹیپو' تبسم عارف' امبر خان' فلک' کائنات'

ARY ڈیجیٹل کے سوپ 'بندھن' میں عالیہ علی

فرقان قریشی' مہا' علی خان' ردا قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'نعمت' لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے سارہ اور بابر شادی دہ ہیں مگر ان میں علیحدگی ہوگئی ہے جبکہ سارا بہت حساس سادہ اور اچھی لڑکی ہے جبکہ اچھی

اچھی لڑکی ہونے کے باوجود اس کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہوگئی ہے کہانی میں آگے بہت زیادہ موڑ

ARY ڈیجیٹل کی سیریل 'تم ملے' میں سحر افضل

تبدیلیاں آئیں گی اور ان عوامل کو دیکھیں کہ سارا کی بابر سے کیوں علیحدگی ہوئی سارا کی بدنصیبی یہ ہے کہ اُس کے بیٹے بلال کے دل میں سوراخ ہے اور یہاں سے اُس کی زندگی میں بہت موڑ آتے ہیں اس کے فنکاروں میں سنیتا مارشل' زاہد احمد' ثمینہ احمد' کرن حق' سمیع پاشا' شہود علوی' عصمت زیدی اور دیگر شامل ہیں۔ سیریل 'میرے ہمنوا' میں مرکزی کردار زیب کا ہے جو بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی ہے۔ زیب اپنے خالہ زاد حارث کو پسند کرتی ہے۔ حارث نے ایم بی اے کیا ہے مگر بے روزگار ہے زیب اور حارث ایک دوسرے کو دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے اور زیب کا رشتہ

وحید سے ہوتا ہے زیب کی والدہ نفیسہ نے ساری زندگی غربت میں گزاری ہے وہ چاہتی ہیں کہ زیب

کا رشتہ امیر گھرانے میں ہو جبکہ حارث تعلیم یافتہ تو ہے مگر بے روزگاری کی وجہ سے وہ غربت کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے جبکہ وحید کا گھرانہ بہت خوشحال ہے اور یہاں سے کہانی ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے بہت سے مسائل سامنے آتے ہیں۔ اس سیریل کو تحریر کیا ہے راحت جبیں نے جبکہ فنکاروں میں علی صبا یوسف' اسفر رحمان' نعمان اعجاز' عائشہ طور' محمود اختر' سیمی پاشا اور ہما نواب قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'میرے ہمنوا' ہر ہفتے کی رات ARY ڈیجیٹل سے رات 9 بجے دیکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'بے شرم' خواتین میں بہت پسند کی جارہی ہے۔ عورت محبت کے بغیر تو زندہ رہ سکتی ہے مگر عزت کے بغیر اُس کا جینا بہت مشکل ہے۔ صبا قمر نے بہت اچھی اداکاری کر کے اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ اس سیریل کو لکھا ہے ثروت نذیر نے جبکہ ہدایت فاروق رند کی ہیں۔ اس کے فنکاروں میں زاہد احمد' صبا قمر' شائستہ جبیں' سندس طارق' محمود اختر' فرح ندیم' فیصل رحمان' اعجاز شیخ' علی گل مہر اور دیگر شامل ہیں۔

سیریل 'بے شرم' ہر منگل کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔ جبکہ سیریل 'تم میری ہو' نے بھی خواتین میں مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ یہ دو ایسے بھائیوں پر مبنی کہانی ہے جو ایک ہی لڑکی کو پسند کرتے ہیں جس کی وجہ سے کہانی ہر مرتبہ ایک نیا موڑ اختیار کرلیتی ہے۔ فیصل قریشی اور اعجاز اسلم نے زبردست اداکاری کر کے اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ اس سیریل کو تحریر کیا ہے ثمینہ اعجاز نے جبکہ اس کے ڈائریکٹر نجف بلگرامی ہیں۔

اس کے ستاروں میں سارا خان' شازیہ ناز' زینب قیوم' شہزاد انور اور سینئر اداکارہ ندا ممتاز قابل ذکر ہیں۔ سیریل 'تم میری ہو' ہر جمعرات کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جارہی ہے۔

جبکہ QTV' دی میوزک HBO اور نک سے ARY کی روایت کے مطابق خوبصورت پروگرام آن ایئر ہورہے ہیں۔ 'سلام زندگی' فیصل قریشی جبکہ ندا پاشا گڈ مارننگ پاکستان خوبصورتی سے پیش کررہی ہیں۔ دیگر پروگراموں میں بلبلے اتوار 7 بجے سوپ بندھن پیر سے جمعرات 7 بجے ڈیجیٹل سے سیریل 'تم ملے' ڈیجیٹل سے پیر رات 9 بجے 'سیریل' آپ کے لیے' منگل کی رات 9 بجے سیریل 'تیری چاہ' بدھ کی رات 8 بجے اور 'میں مہرو ہوں' پیر سے جمعرات 10 بجے ڈیجیٹل سے دیکھایا جارہا ہے۔

☆☆☆......☆☆☆

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

گرما گرم چائے

آج کل سوشل میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پر ارشد خان کے چرچے ہیں۔ سترہ سالہ نوجوان کی

تصویر نے سوشل میڈیا پر تہلکہ مچا دیا ہے۔ اُس کی نیلی آنکھوں کی نہ صرف پاکستانی لڑکیاں دیوانی نکلیں بلکہ بھارتی دوشیزائیں بھی اپنا دل ہار بیٹھیں۔ کسی دل جلے نے خوب کہا پاکستان نے بھارت پر سرجیکل اسٹرائیک کر دی۔ بھارتی خواتین کا کہنا ہے کہ مودی سرکار پاکستان پر بم گرانے کا ارادہ بدل دے کیونکہ وہاں اتنا خوبرو چائے والا موجود ہے تو جناب کالی ماتا کی پجارنوں ہمارے ہاں صرف ایک چائے والا خوبرو نہیں ہے ہمارے پاکستان میں اسے بے شمار اور بے حساب چہرے ہیں۔ اسلام آباد سے ذرا آگے بڑھیے تو ہر دوسرا مرد ہری اور نیلی آنکھیں لیے پھر رہا ہے۔

نام ہی کافی ہے

شعیب منصور کو کون نہیں جانتا پی ٹی وی کے مشہور پروڈیوسر جنہیں 'ففٹی ففٹی' سے شہرت ملی پھر

بے شمار مشہور ڈرامے پیش کرنے والے شعیب منصور 'خدا کے لیے' اور 'بول' جیسی شاندار فلمیں پروڈیوس کرنے کے بعد اب 'ورنہ' کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ یہ فلم اگلے سال ریلیز ہوگی ہیروئن کا انتخاب ہو چکا ہے اور وہ آپ کی اور ہماری پسندیدہ ماہرہ خان ہیں۔ ہم اپنے پڑھنے والوں اور اپنی جانب سے شعیب منصور صاحب کو ریلیز سے قبل ہی مبارکباد پیش کرتے ہیں کیونکہ کامیابی کے لیے اُن کا نام ہی کافی ہے۔

جی خوش کر دیا

ہمایوں سعید کہتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستانی سنیما بے شمار فلمیں ریلیز کر رہا ہوگا۔ ہمارے ہاں بھی ہزاروں سنیما ہوں گے۔ بھارتی فلمیں خود بخود پاکستان سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔ ہمایوں بہت اچھی بات آپ نے کی مگر کامیابی حاصل کرنے کے لیے دل مضبوط ہونا چاہیے۔ معمولی فائدے حاصل کرنے کی چاہ کہیں بھی نہیں پہنچنے دیتی ہم پاکستانیوں کو چاہیے کہ بھارتی فلموں اور بھارتی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں اس سے ہمیں ہی فائدہ ہے ہماری فلمی صنعت پھیلے گی اور ہماری مارکیٹ مضبوط ہوگی۔ کاش ملک کے وسیع تر مفاد میں ہمیں یہ بات سمجھ آ جائے۔

ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا

VEET سپر ماڈل کے آڈیشن ٹی وی پر چل رہے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اِس میں وہ خواتین بھی ہیں جن کا ماڈلنگ سے کچھ خاص تعلق نہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں کوئی بھی ریمپ پر واک کر لیتا ہے مگر پروفیشنلی اگر دیکھا جائے تو ماڈل کی ایک خاص جسامت اور قد ہوتا ہے تاکہ لباس کی پبلسٹی بہترین انداز میں ہو۔ عائشہ خان جج میں موجود ہیں اور وہ بے انتہا ہتک آمیز انداز میں شرکت کرنے والوں سے بات کرتی ہیں حالانکہ وہ خود نہ تو ماڈل ہیں نا اس معیار پر پورا اترتی ہیں۔ VEET والوں کو کم از کم جج کے طور پر درست لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے کیونکہ انسانوں کے ڈاکٹر اور جانوروں کے ڈاکٹر میں بہت فرق ہوتا ہے حالانکہ کہلاتے دونوں ہی ڈاکٹر ہیں۔

ملے گا اور خاتون رپورٹر کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ صنف نازک سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے بات

صرف تھپڑ تک ہی رہی اگر سامنے مرد رپورٹر ہوتا تو شاید آج ہم میں نہیں ہوتا...... صحافتی اقدار کو سامنے رکھتے ہوئے اسٹنگ آپریشن کرنے چاہئیں بنا تربیت اگر مائیک اور کیمرہ تھما کر میدان میں بھیجا جائے گا تو وہ اسی طرح اسٹنگ سے اسٹنگ آپریشن بن جائے گا۔

اثر کر گئیں

خبر کچھ پرانی ہے مگر کنفرم ہے کہ نوین وقار جو کئی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا چکی ہیں اور آج کل سایہ دیوار بھی نہیں' میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ اپنے شوہر اظفر علی سے علیحدگی لے چکی ہیں یہ شادی صرف تین سال چلی۔ اس سے قبل اظفر علی

نے اداکارہ سلمیٰ حسن سے شادی کی تھی اور 11 سالہ شادی شدہ زندگی نوین وقار سے شادی کے فیصلے پر ختم ہوگئی تھی سلمیٰ سے اظفر کی ایک بیٹی بھی ہے۔ شائد سلمیٰ کی بددعائیں اثر کر گئیں۔

☆☆......☆☆

لاہور سے آگے......

'لاہور سے آگے' پاکستان سنیما کی ایک اور خوبصورت اور جاندار کاوش، یہ فلم 11 نومبر کو ملک بھر کے سنیما میں ریلیز ہونے جارہی ہے۔ فلم کی مین
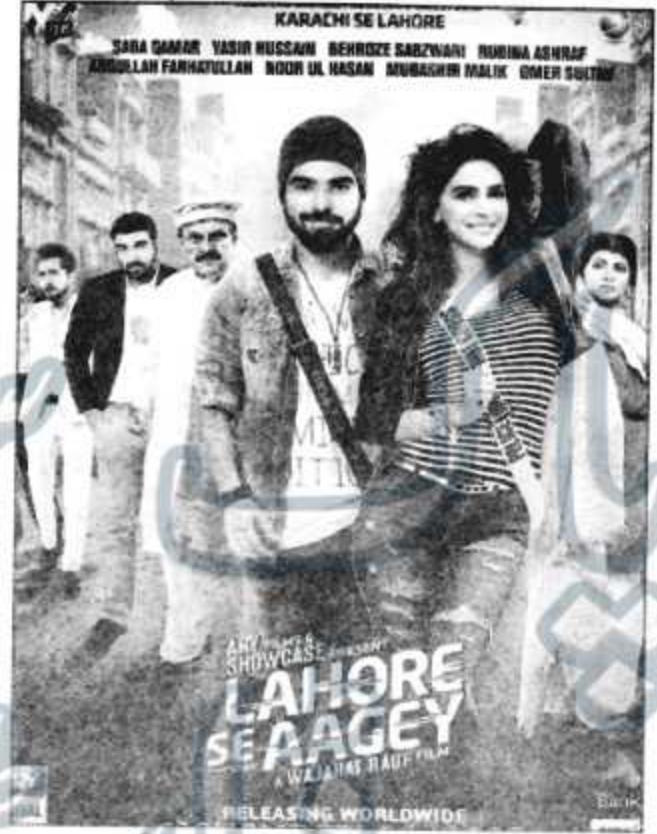
کاسٹ میں صبا قمر جو ایک سنگر کا رول پلے کر رہی ہیں یاسر حسین جو ہیرو بھی ہیں اور اسکرپٹ رائٹر بھی اس کے علاوہ ولن کا رول نبھایا ہے عبداللہ فرحت نے، یہ ایک ہلکی پھلکی کامیڈی مووی ہے جو لوگوں کو سنیما گھروں تک کھینچنے میں ضرور کامیاب ہوگی اور ویسے بھی بی پاکستانی اینڈ بائے پاکستانی کے موٹو پر عمل کرتے ہوئے شائقین کو چاہیے کہ ضرور اس فلم کو دیکھیں تاکہ جلنے والے کہہ سکیں کہ پاکستان کی فلموں پر بھی کھڑکی توڑ رش ہوتا ہے بھئی ہم کسی سے کم تو نہیں ہیں۔

اپنی عزت اپنے ہاتھ

K-21 چینل کی رپورٹر صائمہ کنول کو ایف سی اہلکار نے آن کیمرہ زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ بھئی بڑے کہہ گئے اپنی عزت اپنے ہاتھ...... کسی بھی انسان کے گریبان تک اگر آپ کا ہاتھ پہنچے گا تو یہی جواب

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

چکن موتی پلاؤ

اجزاء

چاول	تین پیالی
سفید چنے	ایک پیالی
چکن بریسٹ	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
پیاز	ایک عدد درمیانی
لال مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
ٹماٹر	دو سے تین عدد
دہی	آدھی پیالی
بڑی الائچی	ایک سے دو عدد
دار چینی	ایک ٹکڑا
لونگ	تین سے چار عدد
پودینہ	دو سے تین کھانے کے چمچ
ہری مرچ	دو سے تین عدد
بناسپتی گھی	چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

چنوں کو دھو کر گرم پانی میں بھگوا کر رکھیں۔ دو سے تین گھنٹے کے بعد وہ پانی پھینک کر تازہ پانی ڈالیں اور اُبال کر اچھی طرح گلا لیں۔ چکن بریسٹ کی چھوٹی بوٹیاں کاٹ کر انہیں دھو کر رکھ لیں، چاولوں کو دھو کر بیس منٹ بھگو کر رکھ دیں۔ پین میں گھی ڈال کر گرم کریں اور اس میں دار چینی اور لونگ ڈال کر کڑکڑا لیں۔ باریک کٹی ہوئی پیاز کو ہلکا سنہری فرائی کریں اور ادرک لہسن، لال مرچ اور ہلدی ڈال دیں۔ ہلکا سا پانی کا چھینٹا دے کر بھونیں۔ پھر اس میں ٹماٹر اور چکن ڈال کر تیز آنچ پر بھونیں، ابلے ہوئے چنے شامل کر کے آدھی پیالی پانی ڈال دیں۔ پانچ سے سات منٹ دم پر رکھ کر اُتار لیں۔ نمک ملے پانی میں الائچی ڈال کر چاولوں کو ایک کنی ابال لیں اور چھلنی میں ڈال کر اچھی طرح پانی نکال دیں۔ دہی میں باریک کٹا ہوا پودینہ اور ہری مرچیں شامل کر دیں۔ پین میں ایک کھانے کا چمچ بناسپتی گھی ڈال کر آدھے چاول پھیلا کر ڈالیں، پھر اس پر چکن اور چنے والا مصالحہ ڈالیں اور دہی ڈال کر دوبارہ سے چاولوں کی تہ لگا دیں۔ ڈھک کر ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں اور پھر ڈش میں اس طرح نکال لیں کہ تہ نہ خراب ہو تا کہ خوبصورتی نظر آئے۔

بلوچی کشمشی قورمہ

اجزاء

مرغی کا گوشت	1 کلو
پیاز (باریک کاٹ لیں)	تین عدد

ادرک (باریک کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	½ کھانے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
کشمش (دھوکر بھگودیں)	¼ کپ
نمک، تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

ساس پین میں تیل گرم کرکے اس میں گوشت سنہرا رنگ آنے تک بھون کر نکال لیں اور اسی تیل میں پیاز براؤن کرلیں۔ پیالے میں دہی، سرخ مرچ پاؤڈر، لہسن پیسٹ، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ گوشت اس میں ڈال کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ براؤن کی ہوئی پیاز میں مسالا گوشت معہ آمیزے کے ڈال کر اتنا بھونیں کہ روغن اوپر آجائے۔ گوشت گلانے کے لیے تھوڑا پانی ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو کشمش، ادرک اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بلوچی کشمش قورمہ ڈش میں نکال کر نان یا تافتان کے ساتھ سرو کریں۔

بند گوبھی کا سلاد

اجزاء

بند گوبھی	250 گرام
سبز مرچیں	دو عدد
چینی	نصف چمچہ چھوٹا
السی کا تیل	ایک چائے کا چمچ
نمک	نصف چائے کا چمچ
سویا ساس	ایک بڑا چمچ

ترکیب:

گوبھی کے بڑے بڑے ٹکڑے کریں اور پانی میں بھگو کر اچھی طرح صاف کریں اور ایک پیالے میں نکال کر رکھ دیں، اس کے بعد بند گوبھی پر چینی اور نمک چھڑکیں۔ ہری مرچیں بڑے بڑے ٹکڑوں میں کاٹ کر ڈالیں، السی کا تیل اور سویا ساس بھی شامل کریں اور دسترخوان کی زینت بنائیں۔ بند گوبھی کا سلاد تیار ہے۔

گاجر کی برفی

اجزاء

گھی	کھانے کے دو چمچ
گاجر	(کدوکش کی ہوئی) 4 کپ
ملک پاؤڈر	ایک کپ
چینی	ایک تہائی کپ
الائچی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
پستے	20 عدد
گھی	آدھا چائے کا چمچ

ترکیب:

سب سے پہلے گاجروں کو دھوکر کدوکش کرلیں۔ کسی ٹرے کو گھی یا مکھن سے گریس کرکے ایک طرف رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں 2 کھانے کے چمچ گھی ڈالیں۔ اس میں گاجر (کدوکش کی ہوئی) ڈالیں اور اس کو ہلکی آنچ میں پکائیں۔ تقریباً 12 سے 10 منٹ تک پکائیں، جب وہ گل جائے تو اس مین ایک کپ ملک پاؤڈر ڈالیں۔ اسے اچھی طرح مکس کرلیں۔ ساتھ ہی چینی اور الائچی پاؤڈر بھی شامل کردیں۔ ان تمام اجزا کو اچھی طرح ملائیں۔ چینی پگھل جائے تو تقریباً 9 سے 7 منٹ تک مزید پکائیں، جب یہ مکسچر گاڑھا ہونے لگے تو اس کا چولہا بند کردیں۔ اس مکسچر کو گریس کیے ہوئے پین میں ڈالیں اور چمچ سے اس کی سطح ہموار کریں۔ اس کے اوپر سلائس کیے ہوئے پستے ڈالیں۔ تیار گاجر کی برفی کو اپنی مرضی کے مطابق شیپ میں کاٹ لیں۔

ٹھنڈی ہوجائے تو تناول فرمائیں۔

لکھنوی گلاوٹ کے کباب

اجزاء

قیمہ	ایک کلو
کچا پپیتا (پیس کر)	دو چائے کے چمچے
ادرک کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	حسب پسند
سفید زیرہ	دو چائے کے چمچے
پسا ہوا کھوپرا	چار چائے کے چمچے
خشخاش	دو چائے کے چمچے
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
جائفل	½ سائز کا ایک ٹکڑا
جاوتری	ایک چائے کا چمچہ
بیسن (بھون کر چھان لیں)	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

سب سے پہلے سفید زیرہ پسا ہوا کھوپرا اور خشخاش بھون کر پیس لیں۔ پھر گرم مسالا پاؤڈر جائفل' جاوتری اور دار چینی بھی باریک پیس لیں۔ قیمے میں کچا پپیتا' نمک اور ادرک لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب اس میں باقی سارے مسالے اور دہی' پیاز وغیرہ کو اچھی طرح ملا کر مزید آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب اس آمیزے کے گول یا کسی بھی شکل کے کباب بنا لیں۔ ایک فرائنگ پین میں آئل ڈالیں اور گرم ہونے پر اس میں یہ کباب فرائی کرلیں، نہایت مزے دار لکھنوی گلاوٹ کے کباب تیار ہیں۔

پیاز کچوری

اجزاء

میدہ	2 کپ
نمک	ایک چائے کا چمچ
پانی	حسب ضرورت
تیل	تلنے کے لیے

اسٹفنگ کے لیے:

پیاز	تین عدد
ہری مرچ	دو عدد
ثابت زیرہ	تین چوتھائی چائے کا چمچ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ
ثابت دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
بھنا ہوا زیرہ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل	ڈیڑھ چائے کا چمچ

ترکیب:

ایک مکسنگ باؤل میں میدہ' نمک اور حسب ضرورت تیل ڈالیں' پھر اس میں آہستہ آہستہ پانی ڈالیں اور مکس کریں، یہاں تک کہ آٹا اچھی طرح گوندھ جائے' اس آٹے کو ململ کے کپڑے سے ڈھک دیں اور ایک سے دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں، اس دوران فلنگ تیار کرلیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور اس میں ثابت زیرہ ڈال دیں۔ اس کے بعد چاپ کیا ہوا پیاز ڈالیں' ہری مرچ بھی شامل کردیں اور پیاز کو فرائی ہونے دیں۔ اس کے بعد ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر اس کو ہلکی آنچ میں پکائیں۔ چولہا بند کردیں اور اس مکسچر کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ گوندھے ہوئے آٹے کی چھوٹی بالز بنا کر اس کو بیل لیں، تقریباً 3 انچ کی گول روٹی بیل کر اس میں حسب ضرورت فلنگ درمیان میں رکھ کر اس کی سائیڈز کو درمیان میں لاتے ہوئے بند کردیں۔ کڑاہی میں تیل گرم ہونے کے بعد کچوریاں کو تل لیں، دونوں طرف سے گولڈن ہوجائیں تو نکال لیں۔ ہری چٹنی یا کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔